تین گلاب

(افسانے)

عثمانہ اختر جمال

پاکستان میں جملہ حقوق محفوظ
Usmana Akhtar Jamal

کتاب : تین گلاب

مصنفہ : عثمانہ اختر جمال

جائے پیدائش مصنفہ: لکھنو، انڈیا

رہائش : گلبرٹ اریزونا، امریکہ (Gilbert Aizona USA)

اشاعت : اگست 2022

قیمت : 500 روپئے۔ 20 ڈالرس امریکہ اور کناڈا

تقسیم کار

اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی۔ دنیا بھر میں ترسیل کے لیے 0300-2472238/021-32581720

فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی 021-32629724/0335-3252374

کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور 0300-9404174/042-37239884

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32639581/32633151

فضلی بک، کراچی

فہرست

1۔	میرا تعارف	5
2۔	میں، میرے افسانے اور قارئین	7
3۔	سفر ایک خوبصورت جزیرے کا	15

افسانے

1۔	غیر سے رشتہ	17
2۔	گزرے لمحوں کا درد	26
3۔	جب تارا ٹوٹ گیا	38
4۔	آنٹی	46
5۔	محافظ	67
6۔	آنسو	98
7۔	سرخ جوڑا	112
8۔	دوسری پسند	132
9۔	چاند کا چکور	148
10۔	خوبصورت وادی پھولوں کی وادی	169
11۔	تصویر بتاں	173
12۔	ہرسنگھار سے نکلی یادیں	177
13۔	آخری خط کا درد اور طاقت	181
14۔	سمندر کے کنارے	196

15۔ دو سہیلیاں	199
16 تین گلاب	204
17۔ عائشہ	225
18۔ کہانی ایک جزیرے کی	232
19۔ میری دوستی میرا پیار	235
20۔ تصور اور حقیقت	243
21۔ ننھی کی خوشی	247
22۔ رشتہ اور انتظار	251
23۔ پیا کا دیس	255
24۔ جیوتی	259

میرا تعارف

میرا تعلق لکھنؤ کے معزز تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ گھر کا بہت ادبی ماحول تھا۔ شادی کے بعد امریکا آ گئی۔ لکھنا میری ہابی یا شوق ہے۔ میں اردو، ہندی اور انگلش میں لکھتی ہوں۔ بچپن سے لکھنے کا شوق تھا، مختلف ناموں سے اپنی تخلیقات بھیجتی تھی جو شائع بھی ہو جاتی تھیں۔ بہت عرصے بعد میرا افسانہ ''غیر سے رشتہ'' پاکیزہ آنچل دہلی انڈیا میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے مستقل میرے افسانے، شاعری اور مضامین ہندوستان، پاکستان، امریکا اور یورپ وغیرہ کے پرچوں، ویب سائٹ، فورمز اور اخباروں میں شائع ہو رہے ہیں۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے اور مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ میں نے یہ سارے شوق بھی پورا کیے۔ انڈیا سے ڈگریاں لیں اور امریکا میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔

ایم اے، بی ایڈ، کمپیوٹر: ڈگریاں

میڈیکل ٹرمنالوجی، اکاؤنٹنگ، لائبریری سائنس، صحافت اور میتھ وغیرہ میں ڈگریاں، ڈپلومے اور سرٹیفکیٹس ہیں۔ پروف ریڈنگ، پروف رائٹنگ، ایڈیٹنگ، نیوز کلپنگ، نیوز رائٹنگ اور صحافت سے بھی میری تعلیم اور جاب کا تعلق رہا ہے۔

مجھے زبانیں سیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ اردو، ہندی، انگلش، سنسکرت، فارسی، عربی زبانیں آتی ہیں۔ فرنچ اور اسپینش زبانیں سیکھنے کی کوشش کی۔ بنگالی، پنجابی اور گجراتی زبانیں دوستوں، ہندی اور سنسکرت کی بدولت خود بخود آ گئیں۔

میگزین، رسالے اور اخبارات:

''پاکیزہ آنچل'' دہلی، ''مشرقی دلہن'' دہلی، ''مشرقی آنچل'' دہلی، ''الاقرباء'' پاکستان، ''انہماک'' پاکستان، ''خزمن'' انڈیا، پاکستان، ''لاریب'' لکھنؤ، ''بیسویں صدی'' دہلی، ''دیدہ ور''

بوسٹن امریکا، ''اردولنک'' امریکہ، ''گواہ اردو'' ویکلی حیدرآباد انڈیا، ''تریاق''، ممبئی، ''تمثیل نو'' کلکتہ، اور بہت سے ہندوستان، پاکستان، یورپ اور دوسرے ملکوں کے رسالے اور ڈائجسٹ وغیرہ جن کی بہت بڑی تعداد ہے۔ 'فیس بک شعروسخن ڈاٹ کام' کمپیوٹر کے فورمز اور ویب سائٹ پر بھی میری تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مجھے ہمیشہ میرے پبلشرز، مدیران، قارئین اور مداحوں نے ایک جملہ لکھا اور بار بار لکھا، ''آپ اتنی دور سے ادب کی خدمت کر رہی ہیں آپ کی عظمت کو ہم سلام کرتے ہیں۔''

میری کتابوں کے نام:

شاعری کا مجموعہ: ''رعنائیاں درد کی'' (عثمانہ اختر جمال)

افسانوں کا مجموعہ: ''تتلیوں کے رنگ'' (عثمانہ اختر جمال) جلد شائع ہونے والا ہے۔

افسانوں کا مجموعہ: ''تین گلاب'' (عثمانہ اختر جمال)

دوسری کتابیں جو ابھی لکھی جا رہی ہیں اور جلد شائع ہوں گی۔

لکھنو کی تہذیب جو میں نے دیکھی، سنی اور محسوس کی۔

افسانوں کے مجموعہ: عظمت کا ستون، سسکیوں کی آواز، زخم جدائی، دل کی معصوم صدا، ونتی (ہندی)، چاندنی کا تحفہ (ہندی)۔

شاعری کا مجموعہ: اجالوں کی رہگزر (اردو اور ہندی)

عثمانہ جمال

usmanajamal15@gmail.com

usmanaaj@yahoo.com

میں، میرے افسانے اور قارئین

افسانے زندگی کا دلفریب نغمہ ہیں۔ چاہے اپنی زندگی کا ساز اس میں شامل ہو یا کسی اور کی زندگی کی سرگم ملی ہو یا تخیل سے آیا ہوا ترنم ہو۔ میرے افسانے اپنے دور کے ہیں، ماضی کے ہیں اور آنے والے مستقبل کے ہیں۔ یہاں آدمی یا عورتوں کا مقابلہ نہیں ہے۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی افسانوں میں آتا ہے وہ چاہے عورت ہو یا آدمی، برا ہو یا بھلا۔ افسانوں کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں جو افسانہ نگاروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ کبھی یہ کہانیاں اپنی ہوتی ہیں، کبھی پرائی اور کبھی خیالی۔ کہانیوں کے ساتھ واقعات جڑے ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے بڑے واقعات کہانی کا جز بن کر اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ واقعات بھی کبھی اپنے ہوتے ہیں کبھی دوسروں کی زندگی میں گزرے ہوتے ہیں اور کبھی تصورات کا بخشا ہوا انمول عطیہ ہوتے ہیں۔

افسانہ نگاری کا آغاز کب اور کیسے ہوا یہ تو یاد نہیں، مگر پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کلاس میں اردو، ہندی اور انگریزی کی بہت ہی عظیم ٹیچرز مل گئیں۔ ذرا سا کچھ لکھ دیا تو ان کی ہمت افزائی آگے بہت آگے لے جاتی تھی۔ یہ ان کے لکھوائے ہوئے مضامین ہوتے تھے یا کہانیاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی کبھی کچھ اور لکھ دیتی تھی اور اپنی دوستوں کو پڑھنے کو دے دیتی تھی۔ دوستیں پڑھ کر بہت خوش ہوتی تھیں اور فوراً وہ مضمون، افسانہ یا شاعری ٹیچرز کو پڑھنے کو دے دیتی تھیں۔ وہ پڑھ کر بہت متاثر ہوتی تھیں اور بہت ہمت افزائی کرتی تھیں۔ یہ تعریف، یہ ہمت افزائی بہت بڑا انعام ہوتی تھیں۔ جو میرے قلم کو افسانوں کے خوبصورت تحفوں سے نوازتی تھیں اور میگزین، اخباروں اور رسالوں کی زینت بناتی تھیں۔ میں اپنی پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں، ہائی اسکول اور انٹر کی ان تمام ٹیچرز کی شکر گزار اور ممنون احسان ہوں جو کوئی بھی مضمون پڑھاتی تھیں مگر مجھے اردو، ہندی اور انگلش میں لکھنے میں بہت ہمت افزائی کرتی تھیں اور میری تحریروں کو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے کے لیے بھیجتی تھیں۔ ان عظیم خواتین نے مجھے ادیبہ بنانے میں میری بہت مدد کی۔ میرے مدیران، میرے قارئین میرے افسانوں، مضامین

اور شاعری کے بہت بڑے مداح بن کر سامنے آئے اور مجھے فخر کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ مجھے ایک مقام بخشا۔ ان کی بدولت میرے قلم کو ایک ایسا اعزاز ملا کہ ان کے تشکر کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں۔

میرے افسانوں کے کردار کبھی خیالی، کبھی اصلی اور کبھی اتفاق ہوتے ہیں جو کبھی کبھی دوسروں کی زندگی سے بھی مل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیالی ہوتے ہوئے بھی اصلی کرداروں کو اپنی داستان لگتے ہیں۔ میرا ایک افسانہ جو مدیروں نے اتفاق سے دو الگ الگ ناموں سے شائع کیے ہیں۔ اس میں میری غلطی نہیں تھی بس غلطی سے ایک افسانہ دو جگہ کلک ہو گیا تھا۔ مجھے بہت سے خط ملے کہ اس افسانے کا کردار ان سے مل گیا۔ وہ ان کی کہانی ہے۔ کسی نے لکھا کہ یہ تو ان کے دوست کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ وہ ایک خیالی کردار ہے ایک انجانے انسان کی زندگی سے مل جانا ایک اتفاق ہے۔ تو ان سب کو بہت حیرت ہوئی۔ میرے افسانوں کی بہت سی ہیروئنیں بہت سے لوگوں کو بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ کیا ایسی لڑکی حقیقت میں ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتا دیجیے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ حقیقت میں ضرور ہو گی اور میں نے اس کے حسن سے متاثر ہو کر اس کے حلیے کو اپنی ہیروئن کا حلیہ بنا دیا۔ کچھ لوگوں کو لکھا کہ وہ ایک خیالی حلیہ ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ مجھے لکھا کہ اگر اتنی خوبصورت لڑکی ہے تو مجھے بتا دیجیے۔ میں کیا جواب دیتی، مگر مجھے خوشی ہوئی کہ میرا تخیل اتنا خوبصورت ہے کہ حقیقت کی دنیا کے لوگ اس کو تلاش کر رہے ہیں، مگر یہ تلاش ناممکن بھی نہیں ہے۔ خوبصورتی تو خوبصورتی ہے ہر جگہ موجود ہے بس حسن نظر ہونا چاہے۔ ایک افسانہ ''میں'' سے شروع ہوا۔ آخر میں 'میں' اور وہ بہن نکلتی ہیں۔ تو میرے پاس بہت سے فون، خط اور ای میل آئیں جو مجھے حیرت میں ڈال گئیں۔ افسانے کی تعریف کے ساتھ ایک جملہ بہت خاص تھا جو سب نے لکھا، فون پر بھی پوچھا اور مجھے حیران کر دیا وہ یہ کہ ''اچھا وہ آپ کی بہن تھیں۔'' میں نے سب کو جواب دیا۔ ''میں سے لکھے جانے والے افسانے ضروری نہیں ہے کہ وہ آپ بیتی ہوں۔ وہ خیالی بھی ہو سکتے ہیں۔ پورا افسانہ کسی ملنے والی خاتون کی کہانی ہے، مگر افسانے کا خاتمہ خیالی ہے۔ افسانے کو افسانہ اور دلچسپ بنانے کے لیے میں نے بہن بنا دیا ہے۔'' کچھ افسانے حقیقت بھی ہوتے ہیں۔ کسی کی اسٹوری پسند آجاتی ہے تو افسانہ نگار اس کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔ بہت سے واقعات سچے ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار کی اپنی زندگی کے ہوتے ہیں وہ ان واقعات کو اپنے افسانے

میں ڈال دیتا ہے۔افسانوں کو دلچسپ بنانے کے لیے افسانے کو آگے بڑھانے کے لیے۔میرے بہت سے افسانوں کے واقعات کا میری زندگی سے تعلق ہے، لیکن افسانے کی کہانی کا تعلق نہیں ہے۔اپنی زندگی کے یا دوسروں کی زندگی کے واقعات بھی افسانے کو آگے بڑھانے اور دلچسپ بنانے میں بہت کام آتے ہیں۔طلاق کی وبا بھی ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ پھیل گئی ہے، اس پر بھی میرے کئی افسانے ہیں۔بچوں کو ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے پاس رہنا پڑتا ہے۔ بچے کبھی ماں کے پاس رہتے ہیں اور کبھی باپ کے پاس۔میرے کئی افسانے اس موضوع پر ہیں، کسی میں بچے ماں کے پاس رہتے ہیں کسی میں باپ کے پاس رہتے ہیں۔میرے بہت سے افسانے دادی نانی اور فرسٹ کزن پر ہی لکھے گئے، خاص کر خواتین کے ڈائجسٹ میں۔میں یہ ہی سمجھتی تھی کہ ان میگزین میں اس طرح کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔میں نے بہت سے افسانے اسی موضوع پر لکھے ہیں۔مگر جب میں نے مدیران کی توجہ اس طرف دلائی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے میگزین کو صرف دادی نانی کی کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے آپ جیسا افسانہ چاہیں لکھ سکتی ہیں۔اس کے بعد میرے افسانے نئے نئے موضوع اور نئے نئے انداز پر لکھے جانے لگے۔ میرے قارئین کتنی باریکی اور توجہ سے میرے افسانے پڑھتے ہیں اس کا پتا مجھے جب چلا جب قارئین نے لکھا بھی اور فون پر بات کر کے کہا۔''آپ کے افسانوں میں لڑکی اکلوتی کیوں ہوتی ہے؟''میں نے اپنے افسانے پڑھے تو واقعی میں کچھ افسانوں میں لڑکی اکلوتی ہی تھی۔اب جن کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر افسانہ لکھا گیا تھا اگر وہ اکلوتی تھیں تو میں اپنے افسانے میں ان کے بہت سے بھائی بہن کیسے لا سکتی تھی، لیکن مجھے اپنے پڑھنے والوں پر بہت فخر ہوا اتنی ذرا سی بات انہوں نے نوٹ کر لی۔میری ہینڈ رائیٹنگ میں افسانے جاتے تھے۔اکثر عجیب نام چھپتے تھے۔حسنیٰ منیٰ شائع ہوا۔ایک افسانے میں ہیرو کا نام ثوبان تھا مگر افسانے میں وہ لوبان شائع ہو گیا۔اس پر بھی بہت سے قارئین نے ای میل اور خط بھیجے۔لکھنؤ سے ایک صاحبہ نے میرے گھر آ کر فون کیا اور کہا۔''بی بی دنیا میں لاکھوں نام ہیں تمھیں اپنے ہیرو کا نام لوبان ہی ملا تھا۔اتنے اچھے افسانے میں لوبان نام بہت کھٹکتا ہے۔'' بہت سے لوگوں نے لکھا:''آپ کے افسانے مجھے بہت پسند ہیں ان میں ایک جدّت ہوتی ہے جو ہم پڑھنے والوں کو بہت متاثر کرتی ہے۔ہم لوگ اس جدّت میں کھو جاتے ہیں۔'' بہت سے لوگوں نے لکھا:''آپ کے افسانوں کی زبان بہت

خوبصورت ہوتی ہے۔ آپ کے افسانوں میں سسپنس رہتا ہے جو آخر میں جا کر چونکا دیتا ہے۔''
بہت سے لوگوں نے لکھا۔''آپ کے افسانے لاجواب ہوتے ہیں، ان میں ایک نیا انداز ہوتا ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔'' بہت سے لوگوں نے لکھا۔''مجھے ہمیشہ آپ کے افسانوں کا انتظار رہتا ہے۔ جب میگزین میں آپ کا افسانہ دیکھتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔'' ایک بار میں نے مشغولیت کی وجہ سے بہت دن تک کچھ نہیں لکھا تو اتنے خطوط، ای میل اور فون آئے کہ بتا نہیں سکتی ہوں۔ ایک ہی سوال تھا:''آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟'' ایسی کتنی باتیں ہیں میرے قارئین کی جن کو اگر لکھا جائے تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے مگر اتنی دلچسپ باتوں کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو یہ میرے اور میرے قارئین کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کی رائے اور ان کے وجود سے ہی میں، میرے افسانے اور خاص کر یہ کتاب ہے۔ میرے لیے یہ بہت فخر کی بات ہے۔ اس لیے میں ان کے خیالات کو اپنی کتاب کا اہم حصّہ سمجھ کر لکھ رہی ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے خطوط، ای میل اور فون کے ذریعہ میرے افسانوں کی تعریف کی اور لکھنے کی فرمائش کی۔ ان کی تعریف نے ان کی فرمائش نے میری بہت ہمت افزائی کی اور مشغولیت کے باوجود مجھے ہمیشہ لکھنے پر مجبور کیا۔

میرے تین افسانوں میں دو لوگوں کے ایک ہی نام ہیں۔''تربت کے پھول''، ''خوبصورت موڑ'' اور ''ایک ادا ایسی بھی'' اور تینوں افسانے بہت دلچسپ رہے۔ میرے قارئین نے بہت پسند کیے اور اپنی پسند کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا۔ دو یا تین افسانوں میں جڑواں بچے ہیں۔''خوبصوت موڑ'' اور ''گزرے ہوئے لمحوں کا درد'' اور ایک افسانے ''الزام بے وفائی'' میں دو ہم شکل بہنیں ہیں۔ افسانہ ''گزرے ہوئے لمحوں کے درد'' میں ہیروئن جس کو اپنا منگیتر یا بوائے فرینڈ سمجھتی ہے۔ وہ شخص اس کے منگیتر کا جڑواں بھائی ہوتا ہے اور ایک حادثے میں مر جاتا ہے، مگر اس کو پتا نہیں ہوتا ہے۔ افسانہ ''الزام بے وفائی'' میں ہیرو اس لڑکی کی تصویریں دیکھ کر اس کو اپنی محبوبہ سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہوتی ہے۔ اس کی محبوبہ کی موت بھی ایکسیڈنٹ میں ہوتی ہے مگر اس آدمی کو اس کے حادثے اور موت کا پتا نہیں ہوتا ہے۔ دونوں افسانوں کا خاتمہ تھوڑا سا ملتا ہوا ہوتے ہوئے بھی دو الگ الگ افسانے ہیں۔ کبھی کبھی افسانہ لکھتے وقت ایک ہی افسانے سے ایک یا کئی افسانوں کا موضوع نکل آتا ہے۔ میرا ایک افسانہ ''درد کا مسیحا'' کئی جگہ بھیجا گیا اور شائع بھی ہوا۔ اس کا آئیڈیا لے کر ایک فلم بھی بن گئی۔ خاص چیز آئیڈیا ہی ہوتا ہے۔ اگر

کوئی نیا آئیڈیا مل جائے تو کیا کہنے۔ زبان و بیان تو سب کے پاس ہوتا ہے صرف آئیڈیے کی کمی رہتی ہے اور میرا پورا افسانہ اس ہی خاص آئیڈیے پر ہی ٹکا ہوا ہے جس کو لے کر وہ فلم تیار ہوگئی۔ اس سرقے کے خلاف میں قانونی کارروائی بھی کرسکتی تھی۔ مجھے اپنا یہ افسانہ بہت پسند ہے۔ مجھے یہ افسانہ اتنا پسند ہے کہ اسی افسانے کے ایک چھوٹے سے خیال کو لے کر میں نے دوسرا افسانہ ''آخری خط کا درد اور طاقت'' لکھا۔ حالانکہ دونوں افسانے فرق ہیں دونوں کی کہانی فرق ہے مگر دونوں افسانے بہت مشہور ہوئے اور بہت پسند کیے گئے۔ ایسے ہی میرے افسانے ''تصور جاناں'' میں ایک آدمی ماں کا کلاس فیلو تھا جو کبھی ماں کے لیے اپنا رشتہ لایا تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر سوچتی ہے کہ اب وہ آدمی جو اکیلا کافی عمر کا ہوگیا ہے اس کی بہن کا رشتہ لائے گا۔ حالانکہ وہ اس کی بہن سے بھی بہت بڑا تھا، مگر بہن کی عمر نکل رہی تھی اس لیے وہ اس کو منظور کر لیتی، مگر وہ اس کی بیٹی کا رشتہ دیتا ہے۔ یہی خیال ذرا سے فرق کے ساتھ ایک ڈرامے کے کچھ سین میں دکھائی دیا۔ اس ڈرامے میں دو سگی بہنیں ہوتی ہیں۔ ماں کو ان کا کلاس فیلو ملتا ہے۔ کبھی وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے لڑکیاں اپنی ماں کی شادی کرنا چاہتی تھیں اور ان کے لیے کوئی آدمی ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر سوچتی ہیں کہ اب ان کی ماں کی شادی ہو جائے گی مگر وہ ماں کے بجائے اس کی جوان بیٹی کا رشتہ دیتا ہے۔ میرا ایک اور افسانہ ''زندگی کے بدلتے رنگ'' میں دو دوستوں کے سنگل ماں باپ ایک دوسرے کے پرانے عاشق نکلتے ہیں۔ ایک دوسرے سے منگنی کر لیتے ہیں، مگر لڑکیاں سوچتی ہیں کہ اگر دونوں کی شادی ہوگئی تو ان کا مستقبل خراب ہو جائے گا۔ وہ مخالف ہو جاتی ہیں اور شادی نہیں ہونے دیتی ہیں۔ ایسا ہی ایک ڈرامے میں دو سگی بہنیں ہوتی ہیں ماں کو ان کا کلاس فیلو ملتا ہے ان کی بھی منگنی ہو جاتی ہے مگر لڑکیاں شادی کی مخالف کرتی ہیں۔ ابھی ایک نیا سیریل دیکھ کر میں حیران رہ گئی جس کا پورا آئیڈیا میرے افسانے ''پھولوں کے زخم'' سے مل گیا۔ میرے افسانے میں ایک لڑکی سے اس کے رشتے دار، والد، دادا دادی، پھوپھیاں اس لیے نفرت کرتے ہیں کیوں کہ اس کی ماں کسی اور آدمی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ سب ہر وقت اس کی ماں کا طعنہ دیتے ہیں، اس کے کردار کو خراب بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جیسے خراب کردار کی اس کی ماں تھی ویسی ہی خراب کردار کی وہ بھی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ میرے افسانے میں باپ اپاہج ہوتا ہے۔ بعد میں باپ تھوڑا بہت مہربان ہونے لگتا ہے۔ افسانے کا خاص خیال یہی تھا۔ جب اسی خیال کو لے لیا تو

میرے افسانے کی کیا خوبی رہ گئی۔ یہ افسانہ پاکستانی میگزین ''الاقربا'' میں شائع ہوا تھا۔ایک سوال اٹھتا ہے کہ جب میرے افسانوں کے خیالات ایسے ہی چوری ہوتے رہیں گے تو میرے پاس کیا رہ جائے گا ؟اس کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ میرے قارئین کو معلوم ہو جائے کہ میرے افسانے بہت پہلے شائع ہوئے تھے اور وہ افسانے اس کتاب میں یا میری دوسرے افسانوں کے مجموعے میں موجود ہیں۔ایسے ہی کتنے ڈراموں وغیرہ میں میرے شائع اور پرانے افسانوں کے خیالات دکھائی دیتے ہیں۔اب یہ اتفاق ہے یا سرقہ ہے نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے بھی یہ ڈرامے دیکھے اور میرے بہت سے قارئین نے بھی مجھے یہ بات بتائی کیونکہ وہ بہت پہلے میرے یہ افسانے پڑھ چکے تھے یا پڑھ چکی تھیں۔ایسا بہت بار ہو چکا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔کبھی کبھی میرے افسانوں کے ڈائیلاگ وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔اب اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے میرا خیال ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے قارئین اس بات پر غور کرتے ہیں اور مجھے اطلاع بھی دیتے رہتے ہیں۔سرقہ کرنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ لکھنے والے کو پتا ہی نہیں چلے گا اس کا آئیڈیا اس کی کہانی چرا کر خود پیسہ بنا لیا۔لیکن کبھی نہ کبھی میں اس کے خلاف قدم ضرور اٹھاؤں گی اس لیے میرے افسانوں کے خیالات کو چراتے ہوئے لکھنے والوں کو سوچنا چاہیے کیونکہ مجھ جیسی ادیبہ کی تحریر اس کے افسانے بہت قیمتی ہیں ۔میری زندگی بہت مشغول ہے، میرے اوپر بہت سی ذمہ داریاں تھیں جب میں یہ افسانے لکھ رہی تھی۔ایک مشغول ادیب کے لیے ادب کی خدمت کرنا بہت آسان کام نہیں ہے جب کہ مجھ جیسی لکھنے والی پر اکیلے گھر، بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تربیت اور نوکری سب ہی کا بوجھ تھا۔میرا وقت بہت قیمتی تھا۔میں اپنے بچوں، گھر اور نوکری کو دینے والا قیمتی وقت لکھنے میں لگا دیتی تھی۔ایسے میں میرے آئیڈیاز دوسرے لوگ چرا کر نام،شہرت اور پیسہ کمائیں۔انصاف میرے قارئین اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ کیونکہ وہ افسانے کتابی صورت میں شائع ہو کر اپنا انصاف چاہتے اور چاہتے رہیں گے۔کیونکہ اب تو کتاب بھی سامنے ہے اس لئے آئیڈیاز کی کمی نہیں رہے گی ایک ہی جگہ پر بہت سے آئیڈیاز مل جائیں گے۔

میرے کئی افسانے خاندانی روایات پر ہیں۔ بہت سے خاندانوں میں خاندان سے باہر شادی نہیں ہو سکتی تھی، یہ موضوعات بھی میرے افسانوں میں آئے ہیں۔کچھ افسانوں میں ارینج میرج ہے کچھ میں اپنی پسند کی شادیاں بھی ہیں۔ میرے افسانوں میں عشق اور محبت کے قصے

بھی ہیں۔کسی میں شادی میں ناکامیاں ہیں اور کسی میں شادی کی کامیابیاں بھی ہیں۔ میرے ایک افسانے ''نازنین'' میں میرا ایک پیغام کہ اگر آپ کے پاس سہولت ہے تو کسی غریب بچے کی ایک یا ان کی سب ضرورت زندگی کو اپنا لیں۔ یہ بات لوگوں کو بہت پسند آئی اور بہت سے لوگوں نے افسانہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کیا اور مجھے بتایا کہ انہوں نے کسی بچے کی ایک ضرورت کو ایڈاپٹ کرلیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے ایک بچے کی سب ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری لے لی ہے اور کچھ لوگوں نے تو ایک سے زیادہ بچوں کی سب ضرورتوں کی ذمہ داری لے لی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی بہت فخر ہوا کہ میری ایک تحریر نے میرے ایک افسانے نے بہت سے بچوں کی زندگی میں تبدیلی لادی میرے افسانے نازنین کی طرح۔ میں نے بھی کئی بچوں کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔

مجھے اپنے افسانوں میں تبدیلی بالکل پسند نہیں۔ اس کا تراشنا ان کو چھوٹا کرنا پورے پورے پیراگراف ہٹا دینا افسانے کو بے تکا بنا دیتے ہیں۔ میرے افسانوں کا تو یہ حال ہے کہ اگر آخر میں بھی ایک یا دو لفظ غائب ہوں تو مجھے افسانہ اپنی خوبیوں کو کھوتا ہوا لگتا ہے۔ اگر ایک دو لفظ ایک دو جملے یا بیچ بیچ میں دو دو چار چار لائنیں یا پورے پورے پیراگراف غائب کردیے جائیں تو افسانہ اپنی خوبی زبان کی خوبی اور افسانہ نگار کی خوبی کو کھو دیتا ہے۔ ایسی چیزیں کبھی کبھی شائع افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ پروف ریڈنگ ایڈیٹنگ کا میری جاب میری تعلیم اور میری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ میں اتنی بار پروف ریڈنگ کرتی ہوں کہ جب تک ہر لفظ مجھے افسانے کا حسن اس کی شان نظر نہیں آتا ہے۔ جب افسانہ شائع ہوتا ہے تو میں ہٹائے ہوئے الفاظ جملوں یا پیراگراف کی کمی افسانے میں محسوس کرلیتی ہوں۔ مجھے افسانے میں بیگانہ پن نظر آتا ہے اگر لفظ ہٹا کر اس کی جگہ ملتا جلتا لفظ یا دوسرا لفظ لکھ دیا جاتا ہے تب بھی میری زبان بدل جاتی ہے۔ مجھے اپنی یہ بدلی ہوئی زبان پسند نہیں آتی ہے۔ زبان ہی تو میری دولت ہے جس کو میں قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں پسند ہے کہ میری زبان بدل دی جائے اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ ہر گھر، ہر شہر، ہر صوبہ اور ہر ملک میں بولی جانے والی ایک ہی زبان مختلف ہوتی ہے۔ گفتگو یا بولنے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور لکھنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ مگر املا ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر املے کی غلطی نظر آئے تو اس کو ضرور ٹھیک کردینا چاہیے کبھی کبھی وہ ٹائپنگ کی غلطی بھی ہوتی ہے۔

میرے افسانوں کی دنیا کی یہ مختصر سی روداد ہے۔ میرے قارئین میری ہمت ہیں۔ ان

کی ہمت افزائی الفاظ کا دلکش جامہ پہن کر اوراق کی خوب صورت دنیا میں نمودار ہوتی ہے۔ میں اور میرے افسانے دونوں ہی اپنے قارئین کی محبت سے سرخرو ہوئے ہیں۔ یہ لاتعداد افسانے میرے قارئین اور مدیران کی بدولت ان کے میگزین کی زینت بنے۔ میگزین کے مدیران اور پبلشرز ہی ایک ایسا پل ہیں جو ادیب اور قاری کو ملاتے ہیں۔ ادیب کو روشناس کراتے ہین ان کا مقام بناتے ہیں۔ میرے افسانے اس کتاب کی صورت میں ایک بار پھر قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین ہمیشہ کی طرح اپنے خوبصورت الفاظ اور نہ بھولنے والے جذبات کی عکاسی کر کے اس کتاب اور اس کے افسانوں کو ویسا ہی وقار اور عزت بخشیں گے جیسا ہمیشہ سے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ افسانے ایک حقیقت ہوتے ہیں۔ اپنے دور کی عکاسی ہوتے ہیں۔ اپنے وقت کے معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے واقعات کو اپنے اندر سمیٹ کر آب حیات کا کام کرتے ہیں۔ اس کو لافانی بنا دیتے ہیں۔ امر کر دیتے ہیں۔ وقت کو اپنی جگہ پر ٹھہرا دیتے ہیں۔ وقت کا زوال افسانے میں رک جاتا ہے، افسانے دلچسپی ہوتے ہیں۔ علامت ہوتے ہیں یا علامت بن کر آگے بڑھتے ہیں۔ زندگی ہوتے ہیں۔ سماج کی اچھائی یا برائی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ حقیقت کی عکاسی ہوتے ہیں۔ ادب اور ادیبوں کی شان ہوتے ہیں۔ مدیران اور ان کے میگزین، اخبارات، رسالوں اور پرچوں کی دنیا ان کے دم سے آباد رہتی ہے ان کے ذریعے قارئین تک پہنچتے ہیں۔ کمپیوٹر کے دور میں افسانے شاعری اور مضامین بہت آسانی سے قاری تک پہونچ رہے ہیں۔ میرے افسانے بھی اپنی پہچان ہیں۔ اپنی تعریف ہیں اپنا وجود ہیں۔ میری یہ کتاب ''تین گلاب'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کتاب میرے کچھ افسانے لے کر وجود میں آئی ہے۔ میرے افسانے بہت زیادہ ہیں۔ لاتعداد ہیں اور سب شائع ہو چکے ہیں سب کو ایک کتاب میں شائع نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کچھ افسانے ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ یہ کچھ افسانے ایک کتاب بن کر نمودار ہوئے ہیں، باقی بھی کبھی نہ کبھی کتابی صورت میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ۔

عثمانہ اختر جمال

15 جنوری 2020

سفر ایک خوبصورت جزیرے کا

بہت پیارا بہت لاجواب ہونو لولوہوائی کا سفر، جہاں زندگی کے بہت سے سال گزارے تھے اور جہاں سے پوری دنیا کے میگزینز، اخباروں، ڈائجسٹس، ویب سائٹس پر میرے لاتعداد افسانے، مضامین اور شاعری شائع ہوئے تھے۔ دوستوں کے لاجواب استقبال سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پاکستانی، انڈین ہوائیین اور لوکل لوگوں کا انمول پیار دل میں سما گیا اور اشک بن کر میری آنکھوں میں جھلملا اٹھا۔ سب نے بہت پیار دیا۔ ہرا بھرا جزیرہ اور بھی شاداب اور خوبصورت لگنے لگا۔ سمندر اپنی آنکھوں میں سما گیا۔ وہاں کی سب سے بڑی خوبی، اجنبی بھی ایک دوسرے کا خیال رکھ رہے تھے۔ کاروں کو اپنی کاریں روک کر نکلنے کا موقع دے رہے تھے۔ رک کر سامنے آتے ہوئے لوگوں کو نکلنے دے رہے تھے۔ پہلے آپ پہلے آپ کی یاد دلا رہے تھے۔ کسی شاپ یا بلڈنگ میں داخل ہوتے تو دروازہ کھول کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے پیچھے آنے والوں کو پہلے اندر جانے دے رہے تھے۔ یہ چیزیں میں نے لکھنؤ میں دیکھی تھیں تب ہی تو مجھے وہاں رہتے ہوئے ہمیشہ لکھنؤ یاد آتا تھا۔ میری پیاری دوستوں اور ان کی فیملیز نے میری کتابوں کو شائع ہونے کی پارٹی دی میرے وہاں جانے کی پارٹی دی۔ جنہوں نے میرا افسانہ ''تین گلاب'' میگزینز میں شائع ہونے کے بعد پڑھا تھا وہ افسانے میں لکھے تین رنگ کے تین گلاب لے کر آئیں۔ سب نے گلاب کے پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے۔ میری فیملی نے مجھے گلاب کی ڈیزائن کے ٹاپس اور تین گلاب کے پینڈینٹ کے ساتھ چین میرے گلے میں ڈالی۔ جب میں نے اپنی کتاب ''تین گلاب'' کے بارے میں بتایا کہ بہت سا پیسہ لینے کے بعد پبلشر صاحب نے بہت سے سال لگائے اور کتاب شائع کرنے میں جتنے بہانے بنا سکتے تھے بنائے اور آخر میں غلطیوں سے بھری بہت خراب کتاب شائع کی ہے۔ بہت خراب کاغذ بہت خراب باریک لکھائی وغیرہ تو سب نے بہت افسوس کیا اور میری کتاب کا ماتم منایا اور کہا کہ

پروڈکٹ جب خراب ہوجاتا ہے تو پبلشرز کو دوبارہ شائع کرنا چاہیے۔انہوں نے پیسہ لیا ہوتا ہے ذمہ داری لی ہوتی ہے۔آپ نے ان پر اعتماد کرکے اتنا بہت سا پیسہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی دے دیا ان کے پاس ایمان نہیں تھا۔آپ کو ایسا خراب پبلشر کہاں سے مل گیا۔پاکستانی فرینڈز زیادہ خفا تھے۔میں نے اپنی چند دوستوں کو اپنی کتابیں دیں اور کہا یہ کتاب تنقید اور تبصرے کے لیے نہیں ہے اگر آپ لوگ پڑھ سکتے ہیں یا پڑھ سکتی ہیں تو میرے افسانے پڑھ لیں۔خیر،اپنے اس شاندار خیر مقدم،اس پیار بھرے استقبال پر ایک رائٹر،ایک دوست یعنی میں ان سب کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔اللہ ان لوگوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔آمین۔ان شاءاللہ۔میرا اللہ میرا ساتھ دے گا اور میری کتاب ''تین گلاب'' پھر سے شائع ہوگی۔ایک انوکھی شان اور دلکشی کے ساتھ شائع ہوگی۔آمین۔

اللہ کا شکر ہے کہ وہ دن آ گیا میری کتاب ''تین گلاب'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں کراچی کے ادیب و محقق اور زندہ کتابیں کے روح رواں انجینئر راشد اشرف کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ''تین گلاب'' کی از سر نو اشاعت کی ذمہ داری قبول کی اور اسے اپنی نگرانی میں شائع کروایا۔

غیر سے رشتہ

سمایا کی ٹیکسی گھر کے سامنے آکر رک گئی۔ کرایہ دیتے دیتے اچانک اس کے ہاتھ رک گئے۔ ''کیا وہ ٹھیک جگہ پہ آئی ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ جگہ تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ پھر اس کا گھر کیا ہوا؟ وہاں پر محل نما ایک عالی شان عمارت کھڑی تھی جس کے چاروں طرف بہت خوبصورت پائیں باغ تھا۔ اس کو لگا جیسے اس کے خوابوں نے حقیقت کا روپ لے لیا ہو۔ خوبصورت گھر اس کی کمزوری تھے۔ جب بھی وہ کوئی خوبصورت گھر دیکھتی تھی تو بہت متأثر ہوتی تھی، گھنٹوں ممی ڈیڈی سے اس کے بارے میں بات کرتی رہتی تھی۔ سب ہنستے تھے کہ جھونپڑے میں رہ کر کیسے کیسے خیالی مکان بناتی رہتی ہے۔ اس نے غور کیا کہ اس کے مکان کے ساتھ ساتھ آس پاس کے کئی اور مکانات بھی اس عمارت میں ضم ہو گئے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کی فیملی کہاں گئی؟ اس کی ممی، بہنیں، دادا، دادی، نانا، نانی سب کہاں چلے گئے؟ مگر اب تک تو اس کی خط و کتابت اسی پتے پر ہو رہی تھی۔ تو یہ عمارت کیا کسی جادوئی چھڑی کا کرشمہ تھی؟

قریب ایک سال کے بعد بغیر کسی اطلاع کے وہ اپنے گھر واپس آئی تھی۔ وہ یہاں سے دور دوسرے بڑے شہر کے سب سے اعلیٰ اسکول میں زیرِ تعلیم تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس کے گھرانے کا دستور تھا کہ صرف گھر کے لڑکے اعلیٰ اسکولوں اور ہوسٹل میں رہ کر تعلیم پاتے تھے۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو گھر سے دور تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی، کیونکہ ممی ڈیڈی کے کوئی بیٹا نہیں تھا، چھ بیٹیاں تھیں۔ اس کا نمبر دوسرا تھا مگر وہ ڈیڈی کی سب سے چہیتی بیٹی تھی اور تعلیم کی شوقین بھی تھی۔ اسی لیے لڑکوں کی طرح گھر سے دور ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ڈیڈی کا ایک حادثے میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ اتنے بھرے پُرے گھر میں بھی وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگی، اس کو گھر سے وحشت ہونے لگی۔ وہ گھر واپس جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اسکول کی طرف سے فارن ٹور پر چلی گئی۔ اب واپس آئی تو اسکول کھل چکا تھا، تو اس کو گھر جانے کا

موقع نہیں ملا۔ فارن ٹور کی اجازت اس نے ڈرتے ڈرتے ممی سے مانگی تھی اور تھوڑے سے پیسے کی بھی فرمائش کی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ممی خفا ہوں گی اور اجازت بھی نہیں دیں گی، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ صرف اجازت مل گئی تھی، بلکہ اتنے زیادہ پیسے آئے تھے کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔

سوچتے سوچتے وہ اچانک چونک پڑی کہ آخر سب لوگ اس کو بتائے بغیر کہاں چلے گئے؟ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی عمارت کے آہنی گیٹ کی طرف بڑھی اس امید پر کہ شاید یہ لوگ کچھ بتا سکیں۔ چوکیدار نے اس کو حیرت سے دیکھا اور خاموشی سے گیٹ کھول کر کال بیل کی طرف اشارہ کیا۔ نہ تو وہ کچھ بولا اور نہ ہی اس نے اس سے کچھ پوچھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ جان پہچان کا تھا، اس نے گردن ہلا دی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ اس کی سب سے چھوٹی بہن نشالہ نے کھولا۔ پھر ''سمایا آگئی'' کا ایک شور مچا اور اس کی دوسری بہنیں سائینہ، سبیزہ، رانم اور سمکین سب ہی اس کے ارد گرد جمع ہوگئیں۔ محو حیرت ہونے کی وجہ سے اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ سب لوگ سوال پر سوال کر رہے تھے مگر جواب ندارد۔ نہ اس نے کوئی سوال کیا اور نہ کسی سوال کا جواب دیا۔

ممی نظر نہیں آرہی تھیں۔ دادا اور دادی بھی نہیں تھے۔ نانا بولے چلے جا رہے تھے، پتا نہیں کیا کیا۔ سب ہی لوگ اس سے فارن ٹور کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں پتا چلا کہ دادا اور دادی حج پر گئے ہیں۔ وہ ممی کے بارے میں سوچنے لگی کہ ممی کہاں ہیں؟ تب ہی اس کو معلوم ہوا کہ وہ بیڈ ریسٹ پر ہیں۔ مگر کیوں؟ کیا بہت بیمار ہیں؟ مگر کیا بیمار ہیں؟ کئی سوال اٹھے، مگر پوچھے نہیں گئے۔ پھر سب لوگ اس کو ممی کے کمرے کی طرف لے گئے۔ ممی بیڈ پر لیٹی تھیں، اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، مگر بولیں کچھ نہیں، کچھ شرمندہ سی ہوگئیں۔

نانی وھیل چیئر پر تھیں۔ ان کے ارد گرد دو خادمائیں کھڑی تھیں۔ اس نے نانی سے بھی نہیں پوچھا کہ وہ وھیل چیئر پر کیوں ہیں؟ نانی نے خود ہی بہت سے سوالات شروع کر دیے اور لوگوں کی طرح، مگر اس کا جواب ندارد تھا۔ اس کے لب پر ایک سکوت، ایک خاموشی ہی تھی۔ اس کی ننھی بہنیں نشالہ، سمکین اور سبیزہ پریشان تھیں۔ وہ ممی سے کہہ رہی تھیں کہ سمایا جب سے آئی ہے کچھ بول نہیں رہی ہے۔

پانچ سالہ نشالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''سمایا! چلو ہمارا کمرہ دیکھو۔ کتنا خوبصورت ہے۔ تم اپنے کمرے میں چلو وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔

نانی نے ممی سے کہا۔ ''حناز! آج سمایا آگئی ہے لگتا ہے کہ بے بی بھی آج ہی آجائے گا۔'' پاس کھڑی عورتوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

بے بی؟ کس کا بے بی؟ سوال پھر اٹھے مگر اس نے ضد پکڑ لی تھی کچھ نہ بولنے کی۔

ممی اس کی عادت جانتی تھی کہ جب وہ حیران، پریشان یا خفا ہوتی تھی تو خاموش ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی یہ خاموشی بہت ہی لمبی ہو جاتی تھی۔ اس نے دھیان سے ممی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت خوبصورت اور جوان ہو گئی تھیں۔ چہرہ اتنا روشن اور چمکدار تھا جیسے کہ چودھویں کا چاند ہو۔

اس نے پھر بے بی کے لیے سوچا کہ کیا ممی کے پاس بے بی آنے والا ہے۔ مگر ممی تو بیوہ ہیں، ان کے پاس بے بی کیسے آ سکتا ہے؟ کیا ممی نے دوسری شادی کر لی ہے؟ اسی لیے یہ ٹھاٹ باٹ ہیں، ہر شخص خوش اور مطمئن ہے۔ شاید بہت امیر آدمی مل گیا ہے۔ ممی نے پیسے کے لیے ڈیڈی کو بھلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ کام ہوا۔ نہ اس کو بتایا گیا اور نہ ہی اس سے پوچھا گیا مگر کیوں؟ اس لیے کہ سب ممی کی بیٹیاں تھیں اور وہ اکیلی ڈیڈی کی بیٹی تھی۔

اس نے دیکھا سائینہ اس کی بڑی بہن ہمیشہ کی طرح ممی کی خدمت کر رہی تھی۔ ان کے ہاتھ پیر دبا رہی تھی، دوا دے رہی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں ان کی مدد کر رہی تھی۔ سائینہ جو ممی سے صرف سولہ سال چھوٹی تھی۔ وہ صرف ممی کی بیٹی ہی نہیں ان کی بہن، دوست، غمخوار، ہمدرد اور راز دار سب ہی کچھ تھی۔ ممی نے پیدا ہوتے ہی اس کو نانی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ نانی کو ہمیشہ ایک اور بیٹی کی خواہش تھی۔ جب سے ممی نے ہوش سنبھالا تھا نانی کو دوسری بیٹی کی دعا کرتے پایا تھا۔

اتنے میں وہ اندر یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ ''حناز! ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ آج بے بی آجائے گا۔'' ممی نے ان کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی ان کی نظر اس پر پڑی وہ جھینپ گئے اور جلدی سے سائینہ کے پیچھے چھپنے لگے۔ اس نے بھی ایک نظر ان پر ڈالی۔ وہ کچھ گھبرائے گھبرائے، جھینپے جھینپے، شرمندہ شرمندہ سے اس کو اچھے لگے۔ دوسرے لمحے وہ سائینہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلے گئے۔

سب میں کتنی محبت، کتنی اپنائیت، کتنی چاہت اور کتنا پیار ہے۔ کیا یہاں صرف وہ ہی

اجنبی ہے۔ کوئی بھی اس کو اپنے لیے پُر خلوص نہیں لگا، جیسے پیسے کے آتے ہی سب بدل گئے۔ ڈیڈی کا کہیں کوئی ذکر نہیں تو اس کی کیا فکر ہوتی۔ دولت نے سب کے دماغ پلٹ دیے تھے۔ جھونپڑے سے محل میں جو آ گئے تھے۔ مگر اس کو تو اپنا وہ جھونپڑا ہی پیارا تھا جس سے اس کی یادیں وابستہ تھیں، جو اس کا اپنا گھر تھا، اس کے ڈیڈی کی چھوڑی ہوئی چھت تھی، جہاں اس کے ڈیڈی پیدا ہوئے تھے، پلے بڑھے تھے، جہاں ان کی شادی ہوئی تھی اور پھر ایک دن ان کی میت پر ماتم مچا تھا۔ مگر! آج ان کی کوئی یاد نہیں تھی، یادگاریں ضرور تھیں، مگر سب کے پاس نئی دنیا، نئی زندگی تھی۔ ممی نے اس سے پوچھا تک نہیں۔ بتانے کی زحمت تک گوارا نہیں کہ وہ شادی کر رہی ہیں۔ ڈیڈی نے ممی کو کتنی چاہت، کتنا پیار دیا تھا۔ کبھی ان سے زور سے بات تک نہیں کی تھی، اور اچھی خاصی دولت بھی دی تھی جو اَب تک لڑکیوں کی پرورش کے کام آ رہی تھی۔ ڈیڈی کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ بہت ہی تعلیم یافتہ اور بہت اونچے عہدے پر فائز تھے۔ مگر اتنی دولت بھی نہیں تھی کہ ممی کے خیالوں کا محل تعمیر کروا دیتے۔ ہوسکتا ہے کروا دیتے اگر زندگی وفا کرتی۔ ممی نے ڈیڈی سے رشتہ توڑ لیا ایک غیر کے لیے۔ وہ بھی ممی سے رشتہ توڑ لے گی اپنے ڈیڈی کے لیے۔ ممی کو اپنا غیر مبارک رہے مگر وہ بھی دکھا دے گی کہ اس کے ڈیڈی مرے نہیں ہیں اس کی دنیا میں زندہ ہیں۔ اس کے محافظ ہیں، اس کے نگہبان ہیں۔ وہ پرائے سائبان، پرائی چھت کے نیچے کیوں ٹھہرے، اس کو یہاں سے بھاگ جانا چاہیے، ہمیشہ کے لیے۔ وہ کھڑی ہوگئی اور کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ سب نے روکنا چاہا مگر اس کی ٹیکسی رکی ہوئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ کر اپنے ہوسٹل کی طرف چلی گئی۔

کافی دن کے بعد اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ممی کھڑی تھیں بے بی کو لیے ہوئے۔ بے بی اور ممی دونوں کو دیکھ کر اس کو بہت غصہ آیا مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ ممی نے اس کو ایک خط دیا اور کہا۔ ’’سمایا! بہت سی باتیں ہیں جو میں زبانی نہیں بتا سکتی اس لیے اس خط میں لکھ دی ہیں۔ تم اس خط کو پڑھو ہم ابھی واپس آتے ہیں۔‘‘

ممی چلی گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ خط کو پھاڑ کر پھینک دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ اس کے اندر کا تجسّس جاگ اٹھا۔ کیا باتیں ہیں جو ممی کہہ نہیں سکتی تھیں خط میں لکھ دی ہیں۔ اس نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا لکھا تھا:

''سمایا! آج میں تمہیں ایک کہانی سنانے جا رہی ہوں جو کہ میری اپنی ہے اور تمہاری پیدائش سے بہت پہلے شروع ہوئی تھی اور آج موقع ملا ہے تمہیں سنانے کا۔ میں حناز! اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی بڑے ناز و نعم میں پل رہی تھی۔ ہمارے گھرانے کا دستور تھا کہ بچے اپنا جوڑا لے کر خود پیدا ہوتے تھے اور پیدا ہوتے ہی ان کی شادیاں طئے کر دی جاتی تھیں۔ خاندان سے باہر شادی کا ہمارے یہاں رواج نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ہمارا خاندان چھوٹا رہ گیا نہ باہر کی لڑکی ہمارے خاندان میں آئی اور نہ ہمارے خاندان کی لڑکی باہر گئی۔ ہمارے والد تین بھائی تھے اور ہماری والدہ تین بہنیں تھیں۔ دستور کے مطابق تینوں بھائیوں کی شادیاں تینوں بہنوں کے ساتھ ہو گئیں۔ تمہارے دادا دادی کے بیٹے ایراش، دوسری خالہ چچا کے بیٹے راش اور سب سے چھوٹے بھائی بہن کی بیٹی حناز یعنی میں۔ میرے پیدا ہوتے ہی میری شادی، مجھ سے دس سال بڑے ایراش کے ساتھ طے کر دی گئی۔ ایراش کے ماں باپ راش کو تمہارے دادا، دادی کے پاس چھوڑ کر ملک سے باہر گئے تھے۔ وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔ تمہارے دادا، دادی نے راش کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ اس طرح اب ان کے پاس دو بیٹے ہو گئے۔ راش کے پاس کوئی دلہن نہیں تھی۔ میری ماں ہمیشہ ایک اور بیٹی کی دعا کرتی تھیں جو راش کی دلہن بنے۔ اماں کی دعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہاں تو خاندان کے دستور کے مطابق لڑکے تعلیم کے لیے شہر کے سب سے اچھے اسکول جاتے تھے اور ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا راش کو ہوسٹل میں پایا۔ وہ کبھی کبھی آتے تھے۔ مجھ سے بہت بڑے تھے اس لیے ہم لوگ کبھی بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ پائے، بلکہ ایک دوسرے کے منگیتر ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے شرماتے تھے۔ راش مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ وہ تعلیم کے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ اس لیے وہ قریب کے اسکول میں زیر تعلیم تھے اور گھر پر ہی رہتے تھے۔ قریب قریب ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہمارا بچپن بھی ساتھ گزرا، کھیل کود، ہنسی مذاق میں۔ ہم لوگوں میں کبھی بھی لڑائی نہیں ہوئی کیونکہ میں ان کے بزرگ کی منگیتر تھی، یعنی بڑے بھائی کی ہونے والی بیوی۔ راش میرا بہت خیال رکھتے تھے میری ہر فرمائش پوری کرتے۔ اپنے حصے کی چیزیں مجھے دے دیتے تھے اور اپنے پیسوں سے میرے لیے خوب سامان خرید کر لاتے تھے۔ ہم دونوں بچپن کی معصوم خوشیوں کے پھولوں سے اپنا

دامن بھر رہے تھے۔ چاند کے حسن سے لطف اندوز ہوتے۔ تاروں کی سرگوشیوں کو محسوس کرتے۔

اچانک ایراش اپنی تعلیم مکمل کرکے آگئے۔ ان کو بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔ ابھی میں صرف پندرہ سال کی تھی کہ میری شادی طئے کردی گئی۔ میرا معصوم بچپن زبردستی رخصت کردیا گیا۔ میں نے صرف ہائی اسکول ہی پاس کیا تھا۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کا بھی رواج نہیں تھا۔ میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میرا بچپن پکارنے لگا بچپن کا ساتھی اداس وگم صم ہوگیا۔ مگر اس کو ایک اطمینان بھی تھا کہ میں اس کی فیملی میں مل رہی ہوں اس کے پیارے ایراش بھیا کی دلہن بن کر۔ مگر میں افسردہ تھی، ممی اداس تھیں۔ کیونکہ ان کا معصوم بچہ ان کی گود سے چھینا جارہا تھا حالانکہ جانا کہیں نہیں تھا ایک کمرے سے رخصت ہوکر دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔

میری شادی ہوگئی اور ایراش مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی ملازمت کی جگہ پر چلے گئے۔ گھر میں اداسیاں چھاگئیں، میرے دم سے اس گھر میں رونق تھی۔ پھر ایک سال کے بعد سائینہ کی پیدائش کے وقت ایراش مجھے میرے گھر چھوڑ گئے۔ جب سائینہ پیدا ہوئی تو ایراش آئے اور کچھ کہے سنے بغیر مجھے طلاق دے دی۔ پورے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ہمارے ماں باپ بے موت مرگئے۔ اکلوتی، معصوم، کم سن بچی طلاق کے ظالم پنجے میں پھنس گئی۔ ایسا ہمارے خاندان میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ باہر کی دنیا ان کے لیے انجان تھی۔ گھر میں کون تھا مجھے اپنانے کو۔ سچ پوچھو سمایا میں اس طلاق سے بہت خوش تھی جیسے مجھے برسوں کے بعد آزادی ملی ہو۔ پیدا ہوتے ہی ایک نام کا پھندا میرے گلے میں اٹکا تھا آج وہ چھوٹ گیا تھا۔ میری گھٹن ختم ہوگئی۔ میں نے سائینہ کو اماں کی گود میں ڈال دیا جیسے ان کا برسوں کا خواب پورا کردیا ہو، حالانکہ میں جانتی تھی وہ دوسری لڑکی کیوں مانگتی تھیں؟ وہ تمنا تو پوری نہیں ہوسکتی تھی مگر سائینہ ان کی بیٹی بن کر پلنے لگی۔

راش سائینہ کو بہت چاہتے تھے۔ ہر وقت اس کو گود میں اٹھائے رہتے، اس کی دیکھ بھال کرتے، اپنے ہاتھوں سے کھلاتے پلاتے اور زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھتے۔ میں جس کی شادی بچپن میں کردی گئی تھی، جوان ہونے کا موقع بھی نہیں دیا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے جوان ہونے لگی۔ جوان اور خوبصورت۔ میرا حسن نکھرنے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک لازوال حسن کی مالک ہوگئی۔ ایسا چمکتا دمکتا ملکوتی حسن جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔ میرے ماں باپ پشیمان تھے کہ ناحق اتنی جلدی میری شادی کردی تھی۔ اب ایک داغ لگے چاند کو کس گھر کے اندھیرے میں ٹھہرائیں۔

مجھے کوئی غم نہیں تھا لگتا تھا کہ جیسے میرے پاس خوشیاں ہی خوشیاں ہیں جو میرے قدرتی حسن کو بنا سنوار رہی ہیں۔

ایک دن اچانک ایراش آ گئے۔ میرا حسن ونکھار دیکھ کر حیران رہ گئے اگر میں ان کے پاس ہوتی تو شاید حسن کی یہ دولت مجھے نہ ملتی، اب تک مرجھا کر ختم ہوگئی ہوتی پتہ نہیں کیوں......؟ میں یہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ ایراش اپنے ماں باپ سے کہہ کر پھر مجھ سے شادی کی ضد کرنے لگے میں جیسے کوئی کھلونا تھی کہ جب چاہا لپک کر اٹھا لیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا، مرد اگر ایک بار طلاق دے دے تو واجب ہے کہ عورت کی کسی اور آدمی کے ساتھ شادی ہو پھر وہ طلاق دے تو سابق شوہر بیوی کو پا سکتا ہے۔ سب ہی مولوی ملاؤں نے یہ بات کہی، اس کے لیے راش سے بات کی گئی۔ وہ راضی ہو گیا مگر مجھ کو کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔ کاش وہ بتا دیتے تو میں راش کو طلاق کے لیے منع کر دیتی اور ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جاتی۔

ایک بار پھر مجھ کو دلہن بنایا گیا، اس بار میں راش کی دلہن تھی۔ میں بہت خوش تھی شاید میں راش سے محبت کرتی تھی یا میری خواہش تھی کہ میں راش کی دلہن بنوں اور آج اس کا موقع آ گیا تھا۔ ورنہ پہلی بار جب میں دلہن بنی تھی تو کتنی افسردہ تھی۔ مرجھایا مرجھایا چہرہ تھا، نہ کوئی نور تھا نہ روشنی۔ مگر دوسری بار دلہن بننے پر میرا حسن نکھر گیا۔ دلکشی مجھ پر نثار ہونے لگی، مجھ پر ایسا نور اترا کہ ایراش بھی نور سے سجا میرا انوکھا روپ دیکھ کر مبہوت ہو گئے، پہلے مجھے ایسی جگمگ نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب یہ نور کی شعاع دیکھنے والوں کا دل و دماغ منور کیے دے رہی تھی۔ راش کے ساتھ میری شادی ہوگئی۔ مگر دوسرے دن انہوں نے مجھے طلاق دے دی اس درخواست کے ساتھ کہ عدت گزارنے کے بعد ہی میرا نکاح کیا جائے اور گھر سے غائب ہو گئے۔ بہت ڈھونڈھے گئے مگر نہیں ملے۔ دوسری طلاق نے میرے دل کی دنیا ہی اجاڑ دی، میں پاگل ہوگئی۔ میرا حسن غم کی نظر ہو گیا میں سوکھ کر کانٹا ہوگئی اور بیڈ سے لگ گئی ایک ہڈی کا ڈھانچا بن کر۔ عدت ختم ہونے اور کچھ مہینے اور رکنے کے بعد ایراش سے پھر میرا نکاح ہو گیا۔ میں نے بہت آفت مچایا کہ مجھے شادی نہیں کرنی ہے، کسی سے بھی نہیں۔ لیکن میری نہیں سنی گئی اور زبردستی مجھ سے ہاں کہلوا لی گئی۔

ایراش نے میری بہت خدمت کی دن کو دن سمجھا، نہ رات کو رات۔ انہوں نے اپنا ٹرانسفر بھی دوسری جگہ کروا لیا۔ ان کی محنت رنگ لائی اور میں ٹھیک ہوگئی۔ دو سال کے بعد جب

میں گھر واپس آئی تو میرے ساتھ ایک اور بیٹی بھی تھی اور وہ تم تھیں سمایا۔ سائینہ کو تو ہم اماں کے پاس ہی چھوڑ گئے تھے۔ ایراش کی اچانک موت نے میری اور میرے بچوں کی زندگی کو دہلا دیا۔ ہمارے پاس کوئی نگہبان نہیں تھا۔ ایراش کا چھوڑا ہوا روپیہ بھی دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ یہ گھر تھا اور تھوڑی سی زمین جس کی دیکھ بھال تمہارے دادا، نانا کر رہے تھے مگر وہ بھی اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ دور دور تک دوسرا کوئی سہارا نہیں تھا۔

اچانک برسوں کے بعد راش واپس آ گئے۔ تمہارے بوڑھے دادا دادی اور نانا نانی کو جیسے زندگی مل گئی۔ وہ کسی امیر بزنس مین کے ساتھ ملک سے باہر چلے گئے تھے اور اب بہت بڑے بزنس مین بن کر واپس آئے تھے۔ سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک دن اچانک انہوں نے اپنا پیغام میرے لیے دیا۔ میں جوان سے ناراض تھی، غصے سے پاگل ہوگئی اور انکار کر دیا۔ انہوں نے سائینہ کو اپنا دوست بنایا اور پوری کہانی سنائی اور کہا کہ اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے وہ بھی لڑکیاں۔ اب لڑکیوں کے جوڑے گھر میں نہیں ہیں۔ دوسرے خاندانوں میں جانا پڑے گا۔ شادی اور جہیز کے لیے بہت سا پیسہ چاہیے۔ آج کل بغیر تعلیم اور جہیز کے اچھے لڑکے نہیں ملتے۔ ان کی بات معقول تھی، مجھے رات دن یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میری لڑکیوں کا کیا ہوگا؟ مگر......! میں راش سے خفا تھی۔ مجھے اس کا بھروسہ نہیں رہا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ پہلے کی طرح طلاق نہ دے دے۔ میرا جواب نہیں میں رہا۔

سائینہ نے رو رو کر آفت کر دی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس کی بس یہی ایک رٹ تھی کہ مجھے ہر حال میں راش انکل سے شادی کرنی ہے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری مجبوریاں تھیں سمایا! مجھے ہاں کرنی پڑی۔ اسی زمانے میں تمہارا خط ملا۔ تم فارن ٹور پر جانا چاہتی تھیں اور تمہیں تھوڑا بہت پیسہ بھی چاہیے تھا۔ میں اس کے خلاف تھی مگر راش نے کہا کہ مت روکو۔ جانے دو، اور خود ہی تمہیں بہت سا روپیہ بھیج دیا۔ اب تمہارا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب تک مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں پھر سے انکار نہ کر دوں کیونکہ میں اب تک راش سے خفا تھی۔ تم جب فارن ٹور سے واپس آئیں تو میں بیڈ ریسٹ پر تھی اس لیے راش کو لے کر تم سے ملنے نہیں آ سکی۔ سوچا کہ بے بی کے آنے کے بعد جا کر تمہیں سب بتائیں گے۔

اچانک ایک دن تم خود آ گئیں اور شرمندہ کر کے واپس چلی گئیں۔ کچھ کہا نہ سنا۔ اپنا اور

ڈیڈی کا خطاوار سمجھا، بے وفا سمجھا۔ سمایا! میری مجبوری کو سمجھو اور معاف کر دو۔ میرے بچوں کا مستقبل بہت تاریک تھا۔ ان کو روشنی کی کرن مل گئی۔ بے بی تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں تم سے بے بی کو ملانے لائی ہوں......اس کا نام ارکاش ہے۔ وہ تمہارا سگا بھائی ہے......تم راش کی بیٹی ہو۔''

''ممی......!'' وہ ایک دم چیخ پڑی۔

''میں ڈیڈی کی بیٹی ہوں۔ میرے اور ڈیڈی کے بیچ میں کسی غیر کو لانے کی کوشش کبھی مت کرنا۔''

اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں اور وہ پاگلوں کی طرح یہی ایک جملہ دہرا رہی تھی...... دروازے پر ارکاش کو گود میں اٹھائے ممی دہل گئیں۔ ان کے پیچھے وہ بھی تھے۔ ویسے ہی گھبرائے گھبرائے، جھینپے جھینپے، شرمندہ شرمندہ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آج بھی اس کو اچھے لگے۔ انہوں نے پہلی بار اس کو مخاطب کیا اور کہا۔

''سنو! تم ڈیڈی کی بیٹی ہو دنیا جانتی ہے۔ ہم بھی کوئی غیر نہیں ہیں تمہارے ڈیڈی کے بھائی ہیں۔ تمہارے انکل......راش انکل۔''

اچانک اس کی چیخیں رک گئیں اور وہ خاموش ہوگئی۔ ممی سوچ رہی تھیں، دیکھو اب یہ خاموشی کتنی طویل ہوتی ہے۔

◆ ÷ ◆

گزرے لمحوں کا درد

رُبا جیسے ہی اپنی بیٹی سنیرا کے ساتھ ایئر پورٹ سے باہر آئی تو حیران رہ گئی۔ حنا کے ساتھ وہ بھی کھڑا تھا۔ اتنا وقت گزرنے کے باوجود وہ ذرا نہیں بدلا تھا، بالکل ویسا ہی تھا۔ وہ حنا کا شوہر عرضان تھا۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش اخلاقی سے بولا۔ ''حنا نے ہر وقت آپ کا ذکر کر کے اتنا روشناس کر دیا ہے کہ لگ ہی نہیں رہا ہے کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔''

پہلی بار؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ کتنا سفید جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے جلدی سے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ کہیں وہ حنا کے سامنے اپنی جان پہچان کا پول نہ کھول دے۔ شاید وہ اس کے سامنے رُبا کو اجنبی ظاہر کرنا چاہتا تھا ورنہ وہ اس کو اتنا جانتی تھی کہ وہ تو اس کے رگِ جاں کے قریب رہ چکا تھا۔ وہ خاموش رہی مگر حنا اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے برابر بولے جا رہی تھی۔ بہت عرصے بعد اس کی ملاقات اپنے بچپن کی سہیلی سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ اس کی ساری سوچیں، سارے خیالات عرضان کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ آج بھی وہ اپنے پسندیدہ کلر کے کپڑوں میں تھا۔ آف وائٹ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ سنیرا اور سجیل الگ اپنی اپنی باتوں میں لگ گئے۔ اصل میں حنا نے ان لوگوں کو اپنے یہاں آنے کی دعوت ایک خاص مقصد سے دی تھی۔ اتنی پرانی دوستی کو وہ رشتے داری میں بدلنا چاہتی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کر لیں اور رُبا اور حنا بھی بہت دنوں سے نہیں ملی تھیں، ایک دوسرے سے مل بھی لیں۔

سنیرا کو دیکھ کر حنا اور عرضان بہت خوش ہوئے۔ خاص کر حنا تو حیران رہ گئی اور کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ''رُبا تمہاری بیٹی تو بہت پیاری ہے بالکل تمہارے جیسی۔'' اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سجیل بھی تو بالکل عرضان کے جیسا تھا، ذرا جو فرق ہو۔ وہ دور بہت دور اپنے ماضی میں چلی جا رہی تھی جب وہ بالکل ایسا ہی اس کے ساتھ تھا۔ ایک بار پھر اسی شکل وصورت کا جوڑا تیار ہو گیا تھا۔ شاید پھر بچھڑنے کے لیے۔ درد کی انتہا میں ڈوبنے کے لیے۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ وہ

خود کتنے درد، کتنے کرب اور کتنی اذیت سے گزری تھی۔صرف وہ ہی جانتی ہے۔ بے درد، بے وفا باپ کا بیٹا ایک بار پھر وہی ڈرامہ کھیل کر دوسرا جہاں آباد کرلے گا۔اس بار حالات کا شکار اس کی بیٹی ہوگی۔ ویسی ہی روتی سسکتی صرف یادوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی۔ کیسا اتفاق تھا کہ اتنی قریبی اور پیاری دوست کے شوہر سے وہ پہلی بار ملی تھی، کاش نہ ملی ہوتی۔ وہ ان کی شادی میں شریک نہیں ہوسکی تھی اور رُبا کی شادی میں اکیلی حنا ہی آئی تھی۔اس کے شوہر نہیں آپائے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حنا کے شوہر کے پردے میں اس کا گمشدہ محبوب برآمد ہوگا۔ایک اجنبی کی طرح۔آنکھوں میں باتوں میں ذرا بھی جان پہچان کی جھلک نہیں تھی۔کتنا بڑا اداکار تھا، بیوی کا کتنا بڑا وفادار۔ وہ اس کا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں تھا۔اس کے پاس کوئی یاد نہیں تھی۔کوئی ماضی نہیں تھا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا یا یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یاد کر کے حاصل بھی کیا ہوتا؟ مگر رُبا کی زندگی کا سرمایہ وہ یادیں تھیں۔خوشگوار یادیں جو اس سے وابستہ تھیں۔ وہ حسین وقت تھا جو اس کے ساتھ گزرا تھا۔ وہ خوبصورت لمحے تھے جو اس کی آنکھوں نے سجائے تھے۔ وہ دلکش لمحے تھے جنہوں نے ان کے پیار کو چرایا تھا۔اس کو یاد آیا کہ وہ کیسا اس سے دامن چھڑا کر بھاگا تھا، یا یوں کہنا چاہیے کہ بہانہ کر کے گیا تھا کہ اپنے ماں باپ کو لینے جا رہا ہے۔اس کے ساتھ شادی طئے کرنے کے لیے وہ انتظار کرتی رہی۔ وہ آج آتا ہے نہ کل۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ پھر نجیم کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی۔ جو یادیں سمٹ کر دل و دماغ کے کسی گوشے میں جا چھپی تھیں آج پھر باہر آنے کے لیے بے چین تھیں۔مگر کس کے لیے؟ اس اجنبی کے لیے جو باتیں تو بہترین کر رہا تھا مگر صرف حنا کی دوست سمجھ کر۔اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ صرف حنا کی دوست تھی۔ اس کی کوئی نہیں تھی۔ وہ تو حنا سے بہت پہلے اس کی تھی۔ پتا نہیں یہ بیچ میں حنا کہاں سے آگئی تھی۔ کاش! حنا کے بجائے کوئی اور آگئی ہوتی تو وہ خاموش نہیں رہتی۔اس کی ساری خوشی خاک میں ملا دیتی اور چیخ کر کہتی۔ ''تمہاری اداکاری میں اوورایکٹنگ شامل ہوگئی ہے۔تم اچھے عاشق نہیں بن سکے تو اچھے اداکار کیسے بن سکتے ہو۔'' مگر اب وہ حنا کی خوشی تھا اور حنا کی خوشی وہ کیسے چھین سکتی تھی۔ایک دم سے وہ چونک پڑی وہ کہہ رہا تھا۔''حنا! تمہاری سہیلی تو بہت خاموش ہیں۔لگتا ہے ان کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔بس تم ہی بولے جا رہی ہو۔''

حنا نے جھٹ سے کہا۔''ارے اتنی باتونی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ آپ کے اوپر اچھا

امپریشن جمارہی ہے۔"

وہ جب بھی خاموش رہی۔اس نے عرضان پر ایک نظر ڈالی۔وہ اب بھی اس کو دیکھے جارہا تھا۔کئی بار اس کی آنکھوں سے رُبا کی آنکھیں ملیں۔وہ آنکھیں جن کو دیکھ کر اس کو گزرے ہوئے زمانے یاد آ گئے تھے۔یہی تو وہ بیدردآنکھیں تھیں براؤن میں ہرااور نیلا پن لیے ہوئے جو اس کو متأثر کرگئی تھیں۔اس کی دنیا اس کی زندگی بن گئی تھیں۔اب بھی اس کی طرف اٹھتی تھیں تو وہ لرز جاتی تھی۔آج بھی اس کو ان آنکھوں سے نفرت نہیں تھی۔وہ اس کی پسندیدہ آنکھیں تھیں۔اتنی عجیب وغریب آنکھیں اس نے کسی اور کی نہیں دیکھی تھیں۔تین رنگوں کو ایک ساتھ دکھانے والے خوبصورت سمندر کی یاد دلاتی تھیں۔ہلکا ہرا، گہرا ہرااور نیلا سمندران آنکھوں میں بند ہو گیا تھا اور ان آنکھوں کو بھی اپنی اہمیت پتا تھی۔تب ہی تو بار بار بلاارادہ اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔تین رنگ کے موجیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح۔

آخران کا گھر آ گیا۔ان کا گھر واقعی میں بہت عالیشان تھا بالکل ویسا ہی جیسا کبھی اُن دونوں نے سوچا تھا،مگر وہ پچھتا رہی تھی یہاں آ کر۔وہ یہاں اس لیے آئی تھی کہ سجیل اور سنیرا اگر ایک دوسرے کو پسند کرلیں تو شادی طے ہو جاتی بلکہ منگنی کر دی جاتی۔اسی موقعے پر اس کے شوہر نجیم کو بھی آنا تھا۔وہ بہت مشغول آدمی تھا۔زیادہ دن کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔مگر اب رُبا نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔سجیل اور سنیرا ایک دوسرے سے بہت متأثر نظر آ رہے تھے مگر اب وہ پھر سے تاریخ کو دُہرانا نہیں چاہتی تھی۔کہیں اس کا بیٹا بھی باپ کی طرح بے وفا اور دھوکے باز نہ ہوا اور اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو غم کا سوغات دے کر منہ موڑ لے۔

وہ کافی عرصے کے لیے آئی تھی،مگر اب جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی۔وہ گھر جس کا خواب دکھا کر اس کا محبوب غائب ہو گیا تھا وہ اس کا نہیں تھا۔وہ اب حنا سے بھی زیادہ لگاؤ نہیں محسوس کررہی تھی۔اس کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں حنا اس کے دل کا حال نہ جان جائے۔ان کے تعلقات نہ سمجھ جائے جن کو وہ اجنبی بن کر چھپانے کی کوشش کررہے تھے۔اس لیے وہ واپس جانا چاہتی تھی۔

آخر وہ اپنی چاہت کو کہاں تک چھپا کر رکھتا،کہیں نہ کہیں سے وہ ظاہر ہو ہی جاتی تھی۔ رُبا نے جیسے ہی آف وائٹ کپڑے پہنے اس کی آنکھیں بولنے لگیں، کچھ کہنے لگیں۔وہ اس کو دیکھتا

رہ گیا ہمیشہ کی طرح۔ وہ جھینپ گئی۔ حنا نے مذاق میں کہا۔ ''رُبا تم نے عرضان کا پسندیدہ رنگ پہن لیا۔ مگر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ عرضان کا پسندیدہ رنگ ہے۔'' وہ کانپ گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اُس بے وفا کی کون سی بات اُس سے پوشیدہ تھی اور آج بھی اس کو کھو کر زیادہ تر آف وائٹ کپڑے پہنتی تھی مگر وہ کیسا انجان بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔

پھر حنا کے کمرے میں عرضان کی میز پر اس کی بڑی سی تصویر بہت خوبصورت فریم میں لگی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ چلو کہیں سے تو پہچان کی جھلک نظر آئی۔ رُبا کو فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ وہ تصویر اس نے کھینچی تھی اور بڑی کروا کر اسی خوبصورت فریم میں سجا کر اس کو گفٹ میں دیا تھا جب وہ اپنے ماں باپ سے ملنے آ رہا تھا۔ اس نے کہا بھی۔ ''تصویر دینا ہی ہے تو اپنی دو۔ یہ کیا؟ ہم کو ہماری ہی تصویر دے رہی ہو۔ بڑی عجیب بات ہے۔''

رُبا نے جواب دیا تھا۔ ''یہ تصویر میں نے خود کھینچی ہے۔ اس میں میری فوٹو گرافی کا ہنر چھپا ہے۔ اتنی خوبصورت تصویر اور منظر ہے کہ دل چاہا کہ اپنے پاس رکھنے کی بجائے تم کو دے دوں۔ آخر کار یہ کبھی ہماری ہوگی۔ یہ مت بھولو کہ اس چہرے اور اس منظر کے اردگرد کہیں میں بھی موجود ہوں بس میری موجودگی کا تصور تمہیں میرے پاس کھینچ لائے گا۔''

وہ ہنس پڑا تھا مگر نہ تو وہ اس کا ہو سکا اور نہ وہ تصویر۔ مگر آج بھی کتنے پیار سے وہ تصویر اپنی ٹیبل پر سجائے تھا۔ اگر اس تصویر کے بجائے اس کی تصویر ہوتی تو کیا ایسے سج سکتی تھی؟ اب تک پتا نہیں کہاں غائب ہو چکی ہوتی۔

اتفاق سے ایک دن حنا کا باورچی بیمار ہو گیا۔ گھر میں جیسے قیامت آ گئی۔ حنا کھانا پکانے سے بہت گھبراتی تھی اس نے جھٹ سے ہوٹل میں کھانا کھانے کا پروگرام بنا لیا، مگر رُبا نے کھانا بنانے کی ذمے داری خود لے لی۔ اور کہا۔ ''ہوٹل جا کر کیا کروں گی آج میں ہی کھانا بنا دوں گی۔''

حنا نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم کھانا بناؤ گی؟ مجھے تعجب ہے کہ تم کھانا بنانا بھی جانتی ہو۔ امیر باپ کی اکلوتی اولاد اور امیر ترین شوہر کی بیوی ہو کر۔''

رُبا سوچ میں پڑ گئی۔ کبھی اس نے رُبا سے کہا تھا گھر میں چاہے جتنے نوکر ہوں کھانا تو بیوی کے ہاتھ کا ہی ہونا چاہیے۔ اچھے اور لذیذ کھانے اس کی کمزوری تھے۔ اس دن سے وہ کھانا بنانے میں لگ گئی تھی اور ایکسپرٹ بھی بن گئی تھی، اور ایک حنا تھی وہ ابھی تک کھانا بنانے سے

گھبراتی تھی۔عرضان جب کھانے کی میز پر آیا تو حیران رہ گیا اور بولا۔''حنا کیا آج کسی کی دعوت ہے اور یہ کھانا، سب چیزیں میری پسند کی، کیا آج کوئی خاص بات ہے؟''

حنا بولی۔'' آج باورچی بیمار تھا۔ یہ کھانا تو رُبا نے بنایا ہے۔ میں نے غور نہیں کیا واقعی یہ ساری چیزیں آپ کی پسندیدہ ہیں۔بس فرق اتنا ہے کہ میں ایک ایک کر کے بنواتی تھی آج قریب قریب سب ایک ساتھ پک گئیں ہیں۔''

عرضان بولا۔''تم نے اپنی سہیلی کو بتایا ہوگا تب ہی تو انہوں نے اتنی محنت کرڈالی۔''

حنا سوچتی رہی کب اور کس موقعے پر اس نے رُبا سے عرضان کی پسند کے کھانے کے متعلق بات کی تھی، مگر اس کو یاد نہیں آیا۔اور رُبا سوچ رہی تھی کہ بیوی کے سامنے کتنا پارسا بننے کی کوشش کررہا ہے۔اس کو اتنا بھی یاد نہیں کہ اسی کے کہنے پر ہی تو اس نے کھانا بنانا سیکھا تھا۔ ورنہ کھانا بنانے سے اس کو سخت نفرت تھی۔ جیسے بخار چڑھ آتا ہو۔ وہ ہمیشہ اس کی ہی پسند کی چیزیں بناتی تھی اور وہ کتنا خوش ہوکر اور تعریف کر کے کھاتا تھا مگر اس وقت کتنی خاموشی سے کھا رہا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو ایک لفظ بھی تعریف کا نہیں نکلا مگر کھا ایسے گیا جیسے برسوں کا بھوکا ہو۔ واقعی میں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کا وہ برسوں سے بھوکا تھا۔ حنا کو کھانا بنانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ ضرور حیران ہو رہی تھی کہ رُبا اتنا اچھا کھانا کیسے بنانے لگی جبکہ وہ بھی اس کی طرح کھانا بنانے سے چڑھتی تھی۔

اب اس دن حنا کی سالگرہ تھی۔ وہ کتنا خوبصورت پھولوں کا گلدستہ لے کر آیا۔سب ہی پھول رُبا کی پسند کے تھے، خوشبودار۔ خوشبودار پھولوں سے رُبا کو عشق تھا۔ بغیر خوشبو کے پھول چاہے جتنے خوبصورت ہوں اس کو کاغذ کے لگتے تھے۔حنا وہ گلدستہ پا کر کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔ جیسے دنیا کا خزانہ پا گئی۔مگر اس کی یہ ادا رُبا کو جلا گئی۔ ایسا ہی گلدستہ وہ اس کے لیے بھی لاتا تھا۔ اس گلدستے پر اس کا حق تھا۔قریب قریب ہر ملاقات پر وہ حسین ترین گلدستہ لے کر آتا تھا اور وہ کتنی خوش ہوا کرتی تھی۔اس کو وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی بار اس کے لیے ایسا ہی گلدستہ لایا تھا، وہ خوشی سے ناچ اٹھی تھی اور بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی۔''تم کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے یہ پھول پسند ہیں؟'' اس نے کہا تھا۔'' کیونکہ یہ میری بھی پسند ہیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ ہم دونوں کی پسند الگ الگ نہیں ہوسکتی۔'' وہ ہنس دی تھی جیسے سارے پھول ہنس پڑے ہوں اور ان کی بھینی بھینی خوشبو ان کے

چاروں طرف بکھر گئی ہو۔ آج وہ حنا میں مگن تھا، اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا اور رُبا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اگر ان لوگوں کے سامنے یہ آنسو گر گئے تو بہت برا ہوگا۔ وہ کیا جواب دے گی؟ پھر عرضان پر وہ اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے فوراً چلی گئی کچھ کہے بغیر، کچھ کہتی کیسے؟ آواز بھی تو بھرّا چکی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز کیا اس بے وفا کے دل کے دروازے کھول دیتی؟ کیا وہ اس کی طرف واپس آجاتا؟ اگر اس کو واپس ہی آنا ہوتا تو وہ جاتا ہی کیوں؟ حنا اور عرضان دونوں کو اچانک اس کا وہاں سے چلا جانا اچھا نہیں لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حنا اس کو بلانے آئی تو وہ کچھ ناراض دکھائی دے رہی تھی اور اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔ ''تم اچانک وہاں سے چلی کیوں آئیں؟''

وہ گھبرا گئی مگر جلدی سے بولی۔ ''بھلا میرا وہاں کیا کام تھا؟ میں تم لوگوں کو تنہا چھوڑ دینا چاہتی تھی۔'' عرضان نے بھی شاید اس کا یہ جملہ سن لیا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ بس وہ اپنے رویے سے کتنے سوالات دے جاتی تھی، مگر جواب معلوم کرنے کی عرضان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ صرف حنا سے پوچھتا تھا۔ ''کیا رُبا اور اس کے شوہر کے تعلقات اچھے نہیں ہیں؟'' حنا نے جواب دیا۔ ''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ رُبا اتنی اچھی ہے کہ مجھے تو اس کا شوہر اس کا دیوانہ لگتا ہے''۔ عرضان اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ آج تک کبھی اس نے اپنے شوہر کی بات نہیں کی تھی۔ بس اس کو ہی دیکھا کرتی تھی۔ عجیب نظروں سے جس میں کبھی کبھی غم بھی شامل رہتا تھا۔ اگر اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی تو عرضان کی ازدواجی زندگی اس کی آنکھوں میں غم کیوں بھر دیتی تھی؟ حنا لاپرواتھی اس کو کچھ نظر نہیں آتا تھا مگر وہ ہر وقت اس کی اسٹڈی کرتا رہتا تھا اس کے عجیب وغریب برتاؤ کی وجہ سے۔ کبھی وہ اس کے اتنے قریب آجاتی تھی کہ وہ حیران رہ جاتا کبھی اس کی ذومعنی گفتگو اس کو حیرت میں ڈال دیتی تھی، کبھی اتنی الفت ظاہر کرنے لگتی کہ وہ گھبرا جاتا اور سوچتا کہ پتا نہیں کب واپس جائے گی؟ وہ اس سے ڈرنے لگا تھا، بہت کم بات کرتا۔ رُبا سوچتی کہ شاید گزرا ہوا زمانہ یا گزرے ہوئے لمحوں کا درد یا بیتے ہوئے وقت کی پہچان کبھی کبھی اس کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ حال پھر اس کو اپنی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جانے سے پہلے اس سے دو چار سوالات ضرور کرے گی ورنہ اس کے دل کی الجھن، اُن لمحوں کا درد اس کو چین نہیں لینے دے گا مگر وہ اس کو موقع نہیں دے رہا تھا اب دونوں کے پاس ایک دوسرے

کے لیے صرف سوالات تھے جن کے جوابات حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ایک دوسرے پر کُھلنا پڑتا اور شاید یہ دونوں ہی نہیں چاہتے تھے۔عرضان تو شاید بالکل نہیں چاہتا تھا مگر وہ پھر بھی اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ یہ اس کی گزری ہوئی زندگی کا سوال تھا۔عرضان صرف حنا سے ہی اپنے سوالات کرتا تھا مگر اس کے جواب اس کو مطمئن نہیں کرتے تھے۔آخر یہ سب کیا ہے؟ وہ زیادہ تر اس کی پسند کا رنگ پہنتی تھی،اس کی پسند کے کھانے بنانے کی کوشش کرتی تھی،اس کی پسند کے گانے اور میوزک سنتی تھی،اس کی ہی پسند کا سینٹ لگاتی تھی۔اس نے آخر کیوں حنا سے اس کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کی ہیں اور حنا نے اس کے بارے میں ہر اطلاع کیوں دی ہے؟ وہ کیوں اس کے سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہے؟ حنا تو اب تک اس کے سانچے میں نہیں ڈھل سکی ہے۔ وہ اپنی الگ پسند رکھتی ہے۔تو کیا یہ عورت فلرٹ کرنا چاہتی ہے؟ اس کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتی ہے؟ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی کو برباد کردینا چاہتی ہے؟ کیا وہ یہاں اسی مقصد سے آئی ہے۔ایک دن پریشان ہوکر عرضان نے حنا سے کہا۔''رُبا مجھے شریف عورت نہیں لگتی ہے وہ تو فلرٹ کرنے میں استاد ہے۔''

''فلرٹ؟ کیا وہ تم سے فلرٹ کررہی ہے؟'' حنا نے گھبرا کر پوچھا۔

عرضان نے کہا۔''ہاں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔کبھی ایسی چاہت دکھاتی ہے جیسے مجھے بہت قریب سے جانتی ہو۔کبھی اس کی آنکھوں سے نفرت جھانکتی دکھائی دیتی ہے جیسے میں نے اس کا سب کچھ چھین لیا ہو۔''

حنا نے کہا۔''نہیں عرضان آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔رُبا تو بہت ڈیسنٹ،بہت شریف اور باوقار خاتون رہی ہے۔ ہمیشہ سے ہی فلرٹ جیسی چیزوں سے دور رہی ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے آپ سے ملنے کی خواہش مند تھی۔ یاد رہے وہ میری عزیز ترین سہیلی ہے۔اس کے بارے میں کبھی بھی برا مت سوچیے گا۔'' اس کے سوال کا جواب ادھورا ہی رہا۔آخر کار وہ اس کے لیے اجنبی تھی۔حنا سے اس کے بارے میں سنا ضرور تھا مگر ملاقات اب ہوئی تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ جیسے اس کے بہت قریب ہے یا قریب رہنا چاہتی ہے۔اس کو حنا کی دوستی کا بھی خیال نہیں ہے ایک حنا ہے ہر وقت اس کے فیور میں رہتی ہے۔عرضان نے طئے کرلیا کہ ایسی عورت کی بیٹی اس کے گھر کے قابل نہیں ہے۔ وہ صاف جواب دے دیگا۔سنیرا نے بھی تو بجیل کو اتنی جلدی اپنے جال میں

پھانس لیا ہے جیسے برسوں کے عاشق ہوں۔بجیل سنیرا کا دیوانہ لگتا ہے اگر یہ بات ختم ہوگئی تو بجیل نہیں مانے گا مگر اس کو ماننا پڑے گا۔ فیصلہ تو ہم ہی لوگوں کو کرنا تھا۔ انہیں تو صرف ایک دوسرے کو دیکھنا تھا بس۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ آج اور ابھی حنا سے کہہ دے گا کہ اس کو بجیل اور سنیرا کا رشتہ منظور نہیں ہے۔ یہ بات وہ رُبا کو بتا دے۔ اس کو اس کی فیملی سے اپنی فیملی جوڑنا نہیں ہے۔ دور رکھنا ہے۔ جیسے ہی عرضان نے حنا سے یہ بات کہی وہ چونک پڑی اور بولی۔ ''یہ ہی بات تو میں کہنے آئی تھی کہ رُبا نے بجیل اور سنیرا کی منگنی سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ جب شادی ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک طرح سے انکار ہی ہے اور اِدھر آپ تو صاف انکار ہی کیے دے رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے یہ سب کیا ہے؟ بجیل اور سنیرا ایک دوسرے کی پسند بن گئے ہیں یہ مت بھولیے گا، یہی بات میں نے رُبا سے بھی کہی ہے۔''

حنا پریشان تھی کہ آخر یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف کیوں ہیں؟ کیا عرضان کا خیال صحیح ہے کہ رُبا اس سے فلرٹ کر رہی تھی یا کہیں خود عرضان تو اس سے فلرٹ نہیں کرنے لگا تھا جو اس کو ناگوار گزرا ہو اور وہ اس سے بدظن ہوگئی ہو مگر دونوں پر وہ اتنا اعتماد کرتی تھی کہ اپنے خیال سے وہ خود شرمندہ ہوگئی۔

حنا کے ہاتھوں میں ایک بڑے سے ہیرے کی چمکتی انگوٹھی دیکھ کر اس کو اپنی انگوٹھی یاد آ گئی جو اُس بے وفا کا پہلا اور آخری تحفہ تھی۔ جب وہ گھر جا رہا تھا تو کتنے پیار سے اس کو پہنایا تھا۔ چار بہت ہی بڑے بڑے ہیرے جڑی وہ بہت ہی خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی تھی اور اُس نے کہا تھا۔ ''رُبا یہ چاروں ہیرے ہماری نئی زندگی کی شروعات کے ضامن ہیں۔ اس انگوٹھی کو کبھی بھی انگلی سے مت اتارنا'' وہ انگوٹھی پہنے نہ جانے کب تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر ایک دن دوسری انگوٹھی نے اس کی جگہ لے لی۔ وہ انگوٹھی اتنی قیمتی تو نہیں تھی مگر اس کو پہنانے والا اس کا سب کچھ بن گیا۔ وہ چار بڑے بڑے ہیروں کی انگوٹھی آج بھی اس کے پاس تھی۔ وہ اتنی قیمتی تھی کہ جیسے لاکھوں کی جائیداد سمٹ کر ایک انگوٹھی میں سما گئی ہو یا انگوٹھی کی شکل میں ایک بڑی جاگیر اس کے ہاتھ میں آ گئی ہو۔ اتنی قیمتی انگوٹھی کا تحفہ کبھی بھی کسی نے اپنی محبوبہ کو نہیں دیا ہوگا۔ وہ شاید دنیا کی پہلی محبوبہ تھی جس کو وہ تحفہ ملا تھا۔ ایک شہنشاہ کے پیار کا حسین تحفہ تاج محل تو اس کی محبوبہ کو اپنے مرنے

کے بعد ہی نصیب ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ محبوبہ کی چاہت کا انداز تھا یا اپنے عشق کی شہرت کا۔ مگر اس کا محبوب تو اس کی اور اپنی زندگی میں سخاوت کا کتنا بڑا دریا بہا گیا تھا۔ وہ کتنا متاثر ہوئی تھی، اس کو کتنا فخر ہوا تھا اپنے آپ پر، اور واقعی میں اس کے محبوب کی ہر بات دنیا سے، سب سے الگ تھی۔ اس کی براؤن نیلی اور ہری آنکھوں کی طرح۔ مگر پھر بھی اتنا قیمتی تحفہ دینے والا کوئی وفادار شاہ جہاں نہیں تھا جس نے اپنی محبوبہ کی یادگار، اپنے حسین تحفے کو دیکھتے دیکھتے ایک دن آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ بغیر کسی دوسری چاہت کی جستجو اور دوسری محبوبہ کی آرزو کے۔ مگر اس کا انوکھا محبوب اپنا سارا سرمایہ لٹا کر بھی اس کا نہ ہو سکا اور اس کی ممتاز محل صرف ایک ہیرے کی انگوٹھی پہن کر اس کی بن گئی۔ چار بڑے بڑے ہیروں کی شاندار انگوٹھی پہنے محبوبہ صرف انتظار بن گئی۔ ایک طویل انتظار ایک سوگوار انتظار جو ختم ہوا تو الگ الگ راہوں پر الگ الگ منزل پر۔ اب وہ موقع دیکھ کر اس انگوٹھی کو واپس کر دینا چاہتی تھی کیونکہ وہ اتنی قیمتی انگوٹھی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ اچانک اس نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی جو اپنی شعاعوں سے پورا کمرہ روشن کر گئی۔ چھ آنکھیں اب ہلکا گہرا ہرا نیلا رنگ پھینکنے لگیں۔ عرضان اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید اس کو کچھ یاد آ گیا۔ حنا تو اس انگوٹھی پر قربان ہوگئی اور بولی۔ ''رُبا تمہاری انگوٹھی کتنی خوبصورت اور کتنی قیمتی ہے۔ اتنے بڑے بڑے چار ہیرے ایک ساتھ کسی انگوٹھی میں پہلے کبھی میں نے نہیں دیکھے۔ جیسے ایک ساتھ چار چاند چمک رہے ہوں۔ زندگی میں چار چاند لگانے کے لیے۔''

اس کی زندگی میں تو چار چاند نہیں لگے اندھیرا ہی رہا۔ ہاں حنا کی زندگی کو چار چاند کی جگمگاہٹ کی ضرورت ہے کیونکہ چار چاند کا مالک اصلی چاند تو اب اس کی زندگی کا نور تھا۔ روشنی تھا۔ رُبا نے جھٹ سے وہ انگوٹھی اتار کر حنا کی انگلی میں پہنا دی۔ عرضان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کہہ نہ سکا۔ شاید وہ حنا کو روکنا چاہ رہا تھا مگر کس زبان سے روکتا۔ حنا بھی سکتے میں آ گئی۔ اس کو امید نہیں تھی کہ انگوٹھی کی تعریف کا اتنا بڑا اصلہ ملے گا کہ انگوٹھی خود اس کی انگلی میں آ جائے گی۔ عرضان اور حنا دونوں پریشان تھے۔ کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے کہ کیسے وہ انگوٹھی اس کو واپس کر دیں۔ مگر وہ بہت خوش تھی جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا۔ انگوٹھی پر جس کا حق تھا اس کو پہونچ گئی۔ وہ کیوں اس بے وفا کا اتنا قیمتی تحفہ اپنے پاس رکھتی اور اس کی حفاظت کرتی؟ انگوٹھی پہنانے کا ایک مقصد تھا جب وہ ہی نہیں پورا ہوا تو وہ کیوں خواہ مخواہ کے لیے اس کو اپنے پاس رکھتی یا

پہنتی۔حنا اپنی انگلی میں چمکتی اس انگوٹھی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔عرضان خاموش تھا کچھ خفا خفا بھی دکھائی دے رہا تھا۔اس نے فوراً کہا۔''حنا ان کی انگوٹھی واپس کر دینا۔یہ انگوٹھی جس کی ہے اس کے ہاتھ میں ہی اچھی لگتی ہے۔''

وہ خاموش نہیں رہنا چاہتی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی فیصلہ کر دے اور چیخ کر کہے۔''کس رشتے سے وہ انگوٹھی واپس لے۔انگوٹھی کی حق دار حنا ہے اس کو پہنے رہنے دو۔بیوی کے ساتھ بے ایمانی ٹھیک نہیں ہے۔'' مگر وہ کہہ نہ سکی شاید اس کی خاموش آواز اس تک پہونچی جب ہی تو وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

حنا سوچ رہی تھی یہ کیسا ڈرامہ ہے؟ اُس میں اس چار بڑے بڑے ہیرے والی انگوٹھی کا کیا رول ہے؟ اس کو صاف لگا یہ انگوٹھی اس کو پہنائی نہیں گئی بلکہ زبردستی اس کی انگلی میں ڈال دی گئی مگر کیوں؟ یہ سوال سوال ہی رہا۔تب ہی رُبا نے اپنے جانے کا اعلان کر دیا۔عرضان تو خاموش رہا مگر حنا حیران رہ گئی اس کو بہت روکنا چاہا مگر رُبا نے کہا۔''جس مقصد سے آئے تھے وہ تو ہوا نہیں اب مزید رکنے سے کیا فائدہ؟ تم لوگوں کو بھی بلاوجہ کی پریشانی ہو رہی ہے۔'' عرضان نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ لرز گئی۔اُف یہ آنکھیں ہی تو اس کی کمزوری ہیں۔اس کی انگوٹھی کے ہیروں کی طرح ہرے، نیلے، براؤن رنگ چھینکنے والی آنکھیں جو اس کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں، خاموش کر دیتی ہیں ورنہ اس بے درد کو تو کیا کچھ نہیں کہنے کو۔دل چاہتا ہے کم از کم دل کا غبار ہی نکل جائے۔پھر جانے سے ایک دن پہلے اس نے اس خوبصورت جگہ کا ذکر چھیڑ دیا جہاں اس کی عرضان سے ملاقات ہوئی تھی، جہاں ان کو پیار کی انمول دولت ملی تھی، جہاں کچھ وعدے ہوئے تھے۔وہ قسمیں وعدے چار بڑے بڑے ہیروں کی انگوٹھی میں قید ہو کر اس کی انگلی میں جگمگا اٹھے تھے۔اپنے اندر عرضان کی آنکھوں کا ہلکا گہرا ہرا، نیلا، براؤن رنگ لے کر جن میں ان کے احساسات اور چمکتے ہوئے سنہرے خوابوں کی جھلک بھی شامل تھی۔اس نے اس جگہ کی بہت سی باتیں کر ڈالیں۔حنا بہت دلچسپی سے سن رہی تھی۔وہ بھی بیزار نہیں دکھائی دے رہا تھا۔جیسے ہی حنا کسی کام سے اٹھ کر کچن میں گئی وہ کہہ اٹھی۔''آپ کو بھی تو وہ جگہ بہت پسند تھی۔'' وہ صاف مکر گیا اور کہا کہ اس نے تو وہ جگہ دیکھی ہی نہیں ہے۔وہ کبھی بھی وہاں نہیں گیا۔اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔وہ غصے سے پاگل ہو گئی تھی کہ کیا کہے؟ اور کیا نہ کہے؟ پھر بھی صرف اتنا ہی کہہ سکی۔''اگر آپ نے وہ جگہ نہیں دیکھی تو اس ٹیبل

کی تصویر میں وہ جگہ کیسے آ گئی؟''

''کون سی تصویر؟'' کچن سے واپس آتی حنا نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ جھٹ سے ان کے کمرے میں گئی اور تصویر اٹھا لائی اور کہا۔ ''یہ تصویر جو اُس جگہ کی ہے اور میں نے خود کھینچی ہے جس کو آپ نے آج بھی بڑے پیار سے اپنی میز پر سجا رکھا ہے۔ اجنبی کی طرح برتاؤ کرنے سے ماضی نہیں بدل سکتا۔ گزرے ہوئے لمحے چیخ چیخ کر اپنی چاہت اپنی پہچان کا اعلان کرتے ہیں۔ آپ چاہے جتنا بیگانے بنے رہیں یہ چیخ آپ کے کانوں تک پہنچے گی۔ آپ کو سننا پڑے گا۔ کسی کی زندگی سے کھلواڑ کر کے چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی موڑ ملا ہی دیتا ہے اور ادھورے خوابوں کی کسک اور گزرے ہوئے لمحوں کا درد چین نہیں لینے دیتا ہے۔'' حنا اور عرضان خاموش تھے وہ برابر بولے جا رہی تھی۔ اس کو ظالم، بے وفا اور دھوکے باز کہہ رہی تھی۔ دونوں بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ وہ حنا کی بہت پرانی سہیلی تھی۔ ان کی مہمان تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ حد سے گزر جائے بلا وجہ کے لیے اس کا کردار بھی مخدوش کر دے اور ان لوگوں کو کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ عرضان بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا۔

''آپ یہ الزام مجھ پر کیوں لگا رہی ہیں؟ میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں اور یہ تصویر......!''

رُبا بات کاٹ کر بولی۔ ''حنا کے سامنے آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ مجھے نہیں جانتے ہیں۔ مگر میں آپ کو جانتی ہوں آپ ٹمی سے عرضان ہو سکتے ہیں مگر شکل وصورت، انداز، پسند ناپسند اور طور طریقوں سے آپ میرے لیے ٹمی ہی رہیں گے کیونکہ میں آپ کو اسی نام سے جانتی ہوں۔''

''ٹمی؟'' حنا اور عرضان ایک ساتھ بولے اور پھر خاموش ہو گئے۔ مگر وہ چپ نہیں ہوئی وہ اب بھی اس کو جانے کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔

''آپ ٹمی کو جانتی ہیں؟'' عرضان بڑی مشکل سے اپنی خاموشی کو توڑ کر بولا۔ ''مگر میں پھر بھی عرضان ہی ہوں ٹمی نہیں۔ ٹمی میرا بھائی تھا۔ میرا اجڑواں بھائی جو ایک حادثے میں گزر گیا۔''

''کیا؟'' وہ دھک سے رہ گئی دل کی رفتار جیسے رکنے لگی۔

''ہاں رُبا۔'' حنا نے کہا۔ ''ہم لوگوں کو بس اتنا معلوم ہے کہ ٹمی نے کوئی لڑکی پسند کی تھی اور اس کی خوشخبری دینے آ رہا تھا کہ اس کا حادثہ ہو گیا۔ اسپتال میں مرتے وقت اس نے منع کر دیا تھا کہ اس لڑکی کو نہ بتایا جائے۔ وہ بہت نازک دل کی ہے۔ اتنا بڑا حادثہ برداشت نہیں کر سکے گی

اور مر جائے گی۔ یوں ہوسکتا ہے کہ مجھے بے وفا سمجھ کر اپنی دوسری دنیا بسا لے۔ ویسے بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھی اور کہاں رہتی تھی؟''

عرضان نے کہا۔''میری اور ٹمی کی صورت ہی نہیں پسند اور ناپسند بھی ایک تھی۔ جب ہی آپ مجھے ٹمی سمجھ بیٹھیں۔ میں آپ کے عجیب وغریب رویے سے پریشان تھا، میں جو آپ کو بالکل نہیں جانتا تھا اور نہ کبھی ملا تھا۔ ٹمی نے آپ کو اپنے جڑواں بھائی کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ ہم لوگ اصل میں کسی کو نہیں بتاتے تھے، بعد میں خوب مزہ آتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ ہی وہ لڑکی ہیں جس کے بارے میں ہم لوگ ہمیشہ سوچا کرتے تھے۔ ٹمی کے پاس سے ہم لوگوں کو صرف یہ تصویر ملی تھی۔ واقعی میں یہ تصویر ہم نے بڑے پیار سے اپنے کمرے میں ہی نہیں اپنے دل میں بھی سجا رکھی ہے یہ جانے بغیر کہ اس کے ساتھ آپ بھی جڑی ہیں ایک یاد کی طرح۔''

عرضان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ حنا رُبا کو سنبھال رہی تھی جو بہت غمزدہ اور ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عرضان بولا۔''ٹمی کے مرنے کے بعد سجیل پیدا ہوا بالکل اسی کی طرح لگتا تھا جیسے ٹمی پھر واپس آ گیا ہو۔ وہی صورت، وہی انداز سب ٹمی کا لے کر پیدا ہوا۔ حالانکہ سب لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھ پر گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹمی کی ہو بہو تصویر ہے۔ اور سنیرا بالکل آپ کے جیسی ہے۔ ٹمی اس دنیا سے کچھ ٹوٹے ہوئے خواب کچھ ادھورے سپنے، اپنے گزرے ہوئے لمحوں کا درد اور نامکمل خواہشات لے کر گیا ہے مگر ٹمی کے ادھورے سپنے اور اس کی نامکمل خواہشات کی تکمیل اب ہوگی سجیل اور سنیرا کے روپ میں۔ ایک بار ہم لوگ رشتے دار بنتے بنتے رہ گئے، مگر اب ایسا نہیں ہوگا ہم ان کی منگنی نہیں فوراً شادی کر دیں گے تاکہ پھر کوئی حادثہ ان کو جدا نہ کر سکے۔''

''آج سے سنیرا ہماری ہوگئی۔'' حنا نے جلدی سے کہا اور اپنی انگلی سے وہ چار بڑے بڑے ہیروں کی خوبصورت انگوٹھی اتار کر عرضان کو تھما دی عرضان نے فوراً سنیرا کی انگلی میں پہنا دی۔

رُبا مطمئن دکھائی دینے لگی۔ اس کا ٹمی بے وفا نہیں تھا۔ وہ اس کا تھا، صرف اُس کا، اس کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ گزرے ہوئے لمحوں کے درد سے نجات پا گئی اور اس کی زندگی مسکرا اٹھی ہو سجیل اور سنیرا کی خوشی بن کر......!

◆÷◆

جب تارا ٹوٹ گیا

آخر جدائی کا موسم آ ہی گیا۔

دونوں کے لیے وہ شام بہت غمگین تھی۔ جب کہ اس سے پہلے ہر شام بہت حسین اور رنگین ہوا کرتی تھی۔ سابیہ اور میثاب اپنے اپنے شہروں سے بہت دور اس شہر میں ایک خاص ٹریننگ کے لیے آئے تھے۔ دونوں ہی ڈاکٹر تھے۔ دو سال کا یہ کورس دونوں ایک ساتھ کر رہے تھے۔ دونوں میں بہت سی باتیں کامن تھیں۔ دونوں کا پیشہ، دونوں کے شوق، دونوں کی پسند۔ قریب قریب ہر چیز۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ دو سال سے دونوں ہر شام ملتے تھے، خوبصورت باتیں کرتے اور آسمان پر جیسے ہی شام کا تارہ نمودار ہوتا دونوں کی نظریں ایک ساتھ اس پر پڑتیں۔ کیونکہ وہ دونوں ہی کی آنکھ کا تارہ تھا۔ دونوں کی پسند اور ان کے ملن کا مرکز۔ شاید اس لیے وہ دونوں کو بہت پیارا تھا۔

اپنی دنیا میں وہ اتنے مگن تھے کہ شاید وہ جدائی کی اس دردناک گھڑی کو بھول گئے تھے۔ دونوں ہی اداس تھے۔ دونوں کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے غم کو بیان کر سکتے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہو گیا اور ہمیشہ کی طرح آسمان پر شام کا تارا نمودار ہو گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ دیکھا اور ساتھ ساتھ شاید آخری بار دیکھا۔ پھر سابیہ نے اپنا قلم اٹھایا اور اس کی نوٹ بک پر لکھا: ''جب تم آسمان پر چمکتا ہوا شام کا یہ پہلا تارا دیکھنا تو سمجھ لینا کہ میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر ہمیشہ اپنے لیے، اپنی فیملی کے لیے بہترین خواہشات کے ساتھ دعائیں کریں گے۔ ہم لوگ جہاں بھی ہوں گے اپنے اپنے مقام پر ہر روز اس کو دیکھا کریں گے اور جدائی کی اس گھڑی کو ابدی بنا دیں گے۔ بھولنا نہیں میرے دوست۔'' میثاب نے اس کی نوٹ بک پر لکھا: ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا جو میری اپنی بھی خواہش ہے جب تک ہماری زندگی رہے گی اور آسمان پر وہ تارا دکھائی دیتا رہے گا۔'' پھر وہ دونوں بچھڑ گئے۔

آسمان پر شام کا وہ تارا دیکھتا رہا اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ۔

جب سے یہ میثاب کی زندگی کا معمول ہو گیا کہ اپنے گھر کی بالکنی سے یا وہ جہاں بھی ہوتا وہاں سے وہ تارا دیکھتا رہتا اس امید پر کہ کسی اور کی نظریں بھی اس پر ہیں۔نظروں کا یہ ملن ہر روز ہوتا۔ دل سے نکلی دعائیں اور بہترین خواہشات کا ٹکراؤ بھی ہوتا۔اس طرح دس سال بیت گئے۔اب تو اس کا سب سے چھوٹا چار سالہ بیٹا شایاب شام ہوتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔''پاپا! شام کا تارا دیکھیں گے۔'' وہ اس کے ساتھ چلا جاتا اور دونوں بالکنی پر آجاتے۔وہ اور شایاب اپنی نظریں شام کے اس دلکش تارے پر ملا دیتے۔دوسری طرف اس کا بچھڑا ساتھی پتا نہیں کتنے ننھے منوں کے ساتھ یا اکیلا اس تارے کو دیکھ رہا ہوتا۔ پھر شام کی سیاہی چھا جاتی، آسمان کے تارے کچھ اور روشن ہو جاتے، ان میں شام کا پہلا تارا گم ہو جاتا، کھو جاتا۔ وہ بھی گم ہو جاتا، کھو جاتا، اپنی یادوں میں۔ پرانی یادوں میں۔

وہ ایک بہت ہی خوبصورت شام تھی۔ اس شہر کی سب سے خوبصورت شام، جب اس کی ملاقات سابیہ سے ہوئی تھی۔ دونوں نے اس شہر کی خوبصورت شام کا ذکر سنا تھا اور دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ واقعی وہ شام بہت دلکش تھی۔ دونوں کی موجودگی نے اس کو اور دلکش بنا دیا تھا۔ دونوں نے دنیا جہان کی باتیں کر ڈالیں۔ اپنے اپنے بارے میں بتایا۔ پھر سورج ڈوب گیا اور آسمان پر شام کا خوبصورت تارا چمک اٹھا اور ان کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں دونوں نے ایک ساتھ اس کو دیکھا پھر بہت سے ستارے نمودار ہو گئے تو وہ اپنے اپنے ہاسٹل کی طرف جانے کے لیے جدا ہو گئے۔

اس کے بعد دن کی کلاس ختم کرنے کے بعد دونوں کی شامیں ایک ساتھ گزرنے لگیں۔ وہ شام کا تارا روز دونوں کا بڑھتا ہوا میل جول دیکھتا۔ سابیہ اگر اپنی پسند کی کسی چیز کا ذکر کرتی تو اتفاق سے وہ میثاب کی پسند ہوتی۔ میثاب اگر کسی چیز کے بارے میں بات کرتا تو وہ اس کو بہت پسند ہوتی۔ دونوں کو نیلا رنگ، نیلا سمندر اور نیلا آسمان پسند تھا۔ دونوں کو پیلے سفید گلاب پسند تھے۔ دونوں کو بہت ہی ہلکی خوشبو پسند تھی۔ دونوں کو کتابوں کا شوق تھا، دونوں کو کلاسیکل موسیقی پسند تھی، دونوں کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اگر دونوں ہوٹل جاتے تو اتفاق سے دونوں کی پسند ایک ہی کھانے پر آکر رکتی۔ اگر ایک ساتھ کوئی پکچر دیکھتے تو دونوں کی پسند یا ناپسند ایک ہوتی۔ میثاب کہتا۔''سابیہ! ہم لوگوں کی پسند اتنی ملتی جلتی تھی تو ہم لوگ ایک دوسرے کو اتنی دیر سے کیوں ملے؟

پہلے کیوں نہیں ملے؟''

سابیہ ایک آہ بھر کر کہتی۔''کاش ہم پہلے ملے ہوتے۔''

میثاب کہتا۔''چلو دیر سے سہی مگر خدا نے ہم لوگوں کو ملا تو دیا۔''

سابیہ فوراً جواب دیتی۔''مگر ہمارا ملن بہت مختصر ہے۔ہمیں اپنی اپنی راہوں پر واپس جانا ہوگا۔ہماری اصلی منزل ہمارے انتظار میں ہے۔''

میثاب کہتا۔''زندگی کے یہ دن ہم کبھی بھی نہیں بھولیں گے جنہوں نے ہمیں ایک ڈور میں باندھ دیا جس کا گواہ یہ شام کا تارا ہے۔''

ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔خوشی وغم کے پہلو آتے اور جاتے رہے۔سابیہ جب یہ کہتی۔''میثاب! آپ نے زندگی میں کتنی خوبصورتی بھر دی۔شاید ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے تب ہی تو یہ ٹریننگ بہانا بن گئی ہمارے ملاپ کا۔کاش! ہم پوری زندگی ایسے ہی گزار سکتے۔زندگی کی شاہراہ پر یوں ہی ہاتھ میں ہاتھ دے کر چل سکتے۔شام کا تارا یوں ہی اپنی آنکھوں میں چمک لیے ہم کو دیکھتا رہتا۔''

میثاب کہتا۔''سابیہ! یہ گھڑی دو گھڑی کا ملاپ ہمیں نصیب سے ملا ہے۔ورنہ ہم ذمہ داریوں میں پھنسے لوگوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ ہم آسمان کی رونق کو دیکھ سکیں، ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔ذمہ داریوں کی دنیا سے باہر آ کر دیکھو تو یہ چاند تارے مردہ لگتے ہیں، روشنی سے خالی۔''

سابیہ کہتی۔''میثاب! اگر ہم اپنے دل کو زندہ رکھیں تو کوئی بھی دنیا ہو قدرت کا یہ حسن جاندار لگتا ہے۔دل مردہ ہو جائے تو ہر چیز مردہ لگے گی۔زندگی سے خالی خالی۔یہ شام کا تارا ہم لوگوں کو ہمیشہ چمکتا ہوا دکھائی دے گا۔یہ ہماری زندہ دلی کی پہچان ہوگا۔اور اُوبی ہوئی بے رونق زندگی کو لمحہ بھر کے لیے خوشیوں اور روشنیوں سے روشناس کرا دے گا۔دیکھنا میثاب! یہ چاند ستارے کتنے روشن یا کتنے جاندار ہوں گے۔جب ان میں ہمارے دل کی روشنی اور آنکھوں کے اجالے بھی شامل ہو جائیں گے۔''

میثاب یہ سب سن کر بہت متأثر ہوتا اور کہتا۔''سچ کہا ہے تم نے! موت اور بیماری کی دنیا سے باہر آ کر ہم لوگ حسن و دلکشی کا سامان پا گئے۔''یہی سب سوچتا سوچتا وہ پھر ماضی سے حال میں واپس آ جاتا۔

میثاب کی بیوی سیمانہ کو یہ سب بہت عجیب لگتا تھا۔ وہ کبھی اس کو دعوت نہیں دیتی تھی اس شام کے تارے کو دیکھنے کی اور نہ ہی اس کی کبھی یہ خواہش تھی اس شام کے تارے کو دیکھے اور نہ ہی اس نے کبھی یہ آرزو کی تھی کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ شام کے اس خوبصورت مسافر کو دیکھیں۔ اس کو تو اس سے جلن ہوتی تھی وہ اس کو اپنی سوتن نظر آتا تھا۔ پھر جب اس کھیل میں اس کا چھوٹا بیٹا بھی شامل ہو گیا تو اس کو لگتا تھا کہ جیسے سوتن اس کے پورے خاندان کو اپنی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔ میثاب ہمیشہ اس سے سابیہ کا ذکر بہت پیار سے کرتا تھا اور ہمیشہ یہ ضرور کہتا تھا کہ ان دونوں کی کتنی باتیں کامن تھیں۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ یہ سب سن کر سیمانہ اپنے کو اس سے دور پاتی، بہت دور۔ اور ہمیشہ یہی سوچتی، جب یہ آدمی اس عورت کے عشق میں اتنا پاگل ہے تو اس نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟ کیا رکاوٹ تھی دونوں کی شادی میں؟ وہ تو دنیا کی ہر رکاوٹ کو ہٹانے میں ماہر تھا۔ اس کا تجربہ خود سیمانہ کو بھی تھا۔ شام ہوتے ہی اگر وہ گھر پر ہوتی تو اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی جیسے اس کے شوہر اور اس کی محبوبہ کے ملاپ کا وقت ہو۔ میثاب نے کبھی بھی اس پر غور نہیں کیا کہ سیمانہ کیا سوچتی ہے۔ دونوں نے بہت کم اپنے اپنے جذبات کا اظہار ایک دوسرے پر کیا تھا۔ میثاب کی دنیا تو بس شام کا وہ تارا بن گیا تھا جس سے بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ تھی۔ سیمانہ کے پاس کوئی تارا نہیں تھا۔ شام کا یہ تارا اس کی سوگوار یادوں کا نشان بن گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو آسمان سے اس تارے کو نوچ کر پھینک دیتی جس نے اس کی ازدواجی زندگی کا سکھ وچین چھین لیا تھا۔ اس کی شاموں کو غم سے بھر دیا تھا۔ اس کی شادی زبردستی کی شادی تو نہیں تھی۔ اپنی پسند کی شادی تھی جس میں چاند تارے، پھول خوشبو سب ہی شامل تھے۔ اس نے بھی تو آخر میثاب سے پیار کیا تھا۔ ایک انوکھا عشق۔ یہی اس کا پہلا اور آخری پیار تھا۔ دونوں کے گھر والے کتنے مخالف تھے۔ کتنی رکاوٹیں، کتنی مشکلیں سامنے آئی تھیں ایک دوسرے کو اپنانے میں۔ مگر یہ ان کے پیار کا جذبہ ہی تھا جب ہی تو ہر مشکل، ہر رکاوٹ اپنے آپ دور ہو گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن میثاب بدل گیا، اچانک وہ اس کو چھوڑ کر ایک تارے کا ہو گیا، شام کے تارے کا۔ میثاب نے اس کو دنیا کا ہر سکھ دیا مگر ہر سکھ دے کر بھی مرد بیوی کو جلانے اور ستانے کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اس کو ستانے کے لیے یا اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے۔ شادی سے پہلے ہر مرد، ہر عورت ضرور کوئی دلبر، کوئی محبوب رکھتے ہوں

گے مگر شادی کے بعد اپنی چاہت کی نمائش بیوی کے سامنے کسی نے نہیں کی ہوگی۔ میثاب اس کا کتنا منہ چڑھا تھا جو کھلے عام اپنی محبوبہ کی چاہت کا اعلان کرتا تھا ہر شام، شام کا تارا بن کر۔

وہ شام کو کہیں جانا نہیں چاہتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ تارا نہ دیکھ پائے۔ مگر سیمانہ کو شام بہت عزیز تھی۔ وہ ہر شام گھر سے باہر جانا چاہتی تھی مگر جب میثاب اور وہ باہر نکلتے رات ہو چکی ہوتی۔ اس کے مطابق یہ واپسی کا وقت ہوتا تھا۔ کہیں شام کی دعوت ہوتی وہ ہمیشہ دیر سے پہونچتی تھی۔ اگر اتفاق سے کسی شام کی دعوت میں جلدی چلی جاتی اور میثاب ساتھ ہوتا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر آسمان کو دیکھنے کے لیے بھاگتا۔ سب ہی لوگ حیرت سے دیکھتے، مذاق اڑاتے اور کہتے۔ ''یہ سب کیا ہے؟ آسمان پر وہ کیا چیز تلاش کرتا ہے؟'' وہ اپنی بے عزتی محسوس کرتی۔ ایک بار جب وہ لوگ کسی شام کی پارٹی میں جانے کو تیار ہوئے تو سیمانہ نے کہہ دیا۔ ''میثاب! اگر ہو سکے تو اپنا پاگل پن گھر پر چھوڑ کر جاؤ۔ دوسروں کے یہاں جب تم بیتابی سے آسمان تکتے ہو تو لوگ کتنا ہنستے اور مذاق اڑاتے ہیں۔''

وہ جواب دیتا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تم وجہ جانتی ہو بس اتنا کافی ہے۔'' سیمانہ نے کہا۔ ''مجھے پروا ہے۔ لوگ وجہ جانتے ہوتے تو زیادہ ٹھیک رہتا۔ کاش تم وہ وجہ مجھ سے چھپا لیتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ تمہارا یہ ابنارمل طریقہ شاید مجھے پاگل بنانے کے لیے ہے۔''

دنیا اتنی نادان نہیں تھی جو نہ سمجھتی ہو، کچھ لوگ میثاب سے ہمدردی دکھاتے کچھ لوگ سیمانہ سے۔ سب ہی کو حیرت تھی کہ آخر وہ شام کو آسمان پر کس چیز کی جستجو کرتا ہے، کیا پانے کی آرزو رکھتا ہے۔ بس وہ آسمان دیکھتا رہتا ہے پھر رات کی تاریکی اس کو ڈھک لیتی ہے اور آسمان پر لاتعداد ستارے نمودار ہو جاتے ہیں۔ جب وہ آسمان دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت ہوتی ہے۔ جب کبھی آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو وہ کتنا غمگین، کتنا مایوس نظر آتا ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ اپنی نظروں سے بادلوں کو چیر کر آسمان کو صاف وشفاف کر دے بس ایک نظر شام کے تارے کو دیکھنے کے لیے۔ شام کے اس پہلے تارے سے اس نے ایک نہ ختم ہونے والا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ایک تعلق پیدا کر لیا تھا۔ وہ شاید اس کا محبوب تھا یا محبوب کی جڑی ہوئی آنکھوں کو اپنے اوپر ٹھہرانے والا۔ اب تو نوبت یہ تھی کہ محبوب سے بھی پیارا تارا ہو گیا تھا۔ ایک دیوانگی سی دکھائی دیتی تھی۔ ایسی دیوانگی کبھی سیمانہ نے اپنے لیے دیکھی تھی، تب ہی تو وہ اس کی ہو گئی تھی۔ اپنے لیے اس

کی اس دیوانگی سے اسے کتنا پیار تھا۔اب اس کو معلوم ہوا کہ وہ شاید اس کی پہلی محبت نہیں تھی، پہلی محبت تو کوئی اور تھا۔اس کی دیوانگی اب اس کی نہیں رہی تھی، بٹ گئی تھی۔بٹی ہوئی اس محبت سے اس کو ایک نفرت کا احساس ہوتا تھا۔اب وہ بھی اس کی مخالفت پر اتر آئی تھی۔اس کے اپوزٹ چلنے لگی تھی۔وہ اگر گھر میں رہنا چاہتا تو وہ باہر کی طرف بھاگتی تھی۔اگر وہ باہر جانا چاہتا تو وہ گھر میں رہنا پسند کرتی تھی۔اگر وہ غصہ کرتا تو وہ بھی غصہ کرتی۔دونوں میں اکثر لڑائی جھگڑا بھی ہوتا، وجہ وہی شام کا تارا ہوتا۔وہ غصہ سے چیخ کر کہتا۔''اگر میں شام کا تارا دیکھتا ہوں تو تمہارا کیا نقصان ہے؟ کیا میں اپنے فرض سے کوتاہی کرتا ہوں؟''

وہ بھی چیخ کر جواب دیتی۔''میں ہرٹ ہوتی ہوں، میرے جذبات کو چوٹ لگتی ہے، میرے دل و دماغ غمزدہ ہو جاتے ہیں۔کسی دوسری عورت کی طاقت دکھائی دیتی ہے جو خواہ مخواہ کے لیے تمھیں اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہے۔ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔زندگی صرف ایک شام کا تارا ہی تو نہیں ہے جو بغیر ناغہ کیے تم اس کو دیکھتے رہتے ہو۔بغیر کسی کے جذبات کا خیال کیے ہوئے۔کیا ملتا ہے تمہیں؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔صرف مجھے ہرٹ کرنا ہے وہ میں ہو رہی ہوں۔تمہیں اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو تم اپنے کو بدل لیتے۔مگر نہیں، تمہیں اس عورت نے ایک موضوع، ایک موقع دے دیا ہے مجھے چوٹ پہنچانے، تکلیف دینے کا اور تم اس پر قائم ہو۔تم میرے نہیں رہے تم اس تارے کے ہو گئے ہو جو تمہاری محبوبہ نے تمہیں بخشا ہے۔''

اس پر لڑائی جھگڑا طول پکڑ لیتا۔سب بچے پریشان ہونے لگتے۔بڑے بچے تو زیادہ پروا نہیں کرتے تھے مگر چھوٹا شایاب اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا،''بابا آیئے شام کا تارا دیکھیں۔'' وہ ہنس پڑتا۔اس کو گود میں اٹھا کر باہر چلا جاتا۔لڑائی ختم ہو جاتی مگر سیمانہ کا غصہ اور عروج پر پہونچا تا۔میتاب کبھی بھی اپنے کو شام کے اس تارے کے دیدار سے محروم نہیں رکھ سکا۔اس کے رویے میں کمی نہیں آئی۔

پھر ایک دن جب وہ شام کے تارے کو دیکھ رہا تھا ہمیشہ کی طرح نہایت خاموشی سے گم سم سا۔اچانک وہ تارا ٹوٹ گیا۔میتاب تڑپ اٹھا۔یہ انہونی بات کیسی؟ پوری کہانی میں کہیں بھی تارا ٹوٹنے کا ذکر تو نہیں تھا۔پھر آج یہ تارے کو کیا ہوا؟ کس کی آہ لگی، کون سی ٹھیس پہنچی جو وہ تارا ٹوٹ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔تارے کا ٹوٹنا کوئی اچھا شگون تو نہیں ہے۔وہ جو برسوں

سے اس کا پیارا اس کا راز دار، اس کا دوست، اس کا ہمدم سب ہی کچھ تھا، آج کیوں روٹھ گیا؟ کیوں ٹوٹ کر بکھر گیا؟ وہ گھبرا گیا۔ فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور سابیہ کو فون کیا۔ معلوم ہوا سابیہ کا اُسی دن اچانک انتقال ہو گیا۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سیمانہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ خیریت؟'' میثاب نے روتے ہوئے کہا۔ ''سیمانہ! آج وہ تارا ٹوٹ گیا شام کا وہ ہمارا تارا۔ ہماری نظریں اب کبھی بھی نہیں ملیں گی۔'' سیمانہ کچھ نہیں بولی۔ وہ ہی بولتا گیا۔ ''آج سابیہ اس دنیا سے چلی گئی اور تارا ٹوٹ گیا۔ وہ واقعی میں اُس کا سچا دوست تھا اتنا بڑا غم برداشت نہیں کر سکا خود بھی فنا ہو گیا۔ اس ٹوٹتے تارے نے اس دردناک خبر کو مجھ تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ میری سچی دوست تھی، میری سچی رفیق!'' سیمانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سابیہ کے غم میں نہیں۔ شوہر کے اظہارِ عشق سے جو وہ دوسری عورت کے لیے کہہ رہا تھا اگرچہ اب وہ عورت اس دنیا میں نہیں تھی مگر اس کے دل کی دنیا تو لوٹ کر لے گئی تھی۔ میثاب کے پاس پتا نہیں کتنی سابیہ تھیں مگر اس کی تو ساری دنیا، ساری کائنات صرف وہی تھا۔ میثاب اس کا شوہر۔

شام آتی رہی اور جاتی رہی مگر پھر میثاب کے دل کے آسمان پر شام کا تارا نہیں چمکا۔ اب میثاب بیتابی کے ساتھ اس تارے کو نہیں دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی شایاب کہتا۔ ''پاپا! شام کا تارا نکل آیا۔ آیئے دیکھتے ہیں۔'' تو وہ دہل جاتا اور بیٹے کو گھسیٹ لیتا اور کہتا۔ ''نہیں بیٹا! وہ تارا تو ٹوٹ گیا جس کو میں دیکھتا تھا اب ہم دونوں ساتھ ساتھ وہ تارا نہیں دیکھیں گے۔ تارے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تو میرا تارا ہے میری آنکھ کا تارا۔ میں اب تجھے صرف تجھے دیکھوں گا۔ جب دو نظریں ایک ساتھ تارے کو دیکھتی ہیں تو وہ تاب نہیں لا پاتا اور ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ دو چاہنے والے بچھڑ جاتے ہیں۔ تو میرا تارا ہے خدا نہ کرے کہ تو بچھڑے۔''

اس وقت سیمانہ نے پوچھا۔ ''ایک بات بتاؤ میثاب، تم دونوں میں جب اتنی محبت تھی، تم دونوں میں بہت سی چیزیں کامن تھیں، تم دونوں کے بیچ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ پھر تم دونوں نے شادی کیوں نہیں کی؟''

میثاب اس کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا پھر بہت دیر بعد اس نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں کے پاس اپنے اپنے محبوب تھے جن کو پانے میں ہم دونوں کو بہت مشکلیں پیش آئی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' سیمانہ نے جلدی سے پوچھا۔

میثاب نے کہا۔''ہم دونوں شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ہم دونوں کو اپنی اپنی فیملی سے بہت پیار تھا، بہت ہی پیار۔اس پیار کے آگے دنیا کا ہر پیار بیکار تھا، فضول تھا۔ہم لوگ دوست تھے، صرف دوست۔عاشق و معشوق نہیں تھے، ایک دوسرے کے محبوب نہیں تھے۔ہم لوگ اپنے اپنے محبوب بہت مشکل سے پا چکے تھے۔یہی ایک بات ہم دونوں میں مشترکہ تھی جو دوستی کی بنیاد بنی اور اس دوستی کی بنیاد کو ہم نے شام کے تارے میں مقید کر دیا کیونکہ ہماری باتوں کا گواہ وہ شام کا تارا تھا اور اس میں ہمارے محبوب! ہماری فیملی کے پیار کی چمک بھی شامل تھی تب ہی تو ہمارا دل اُس کو دیکھ کر اُن کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا اور دعائیں کرتا تھا۔یہ تارے ٹوٹ جاتے ہیں، دوستی ختم ہو جاتی ہے مگر ہماری دعا ہے کہ ہماری فیملی جو خوبصورت اور معصوم بچوں کی کلکاریوں سے گندھی ہے ہمیشہ قائم رہے۔ہماری فیملی اور ہمارے محبوب کے پیار کا بندھن اتنا مضبوط ہے کہ اس کو کوئی بھی نہیں توڑ سکتا، نہ صبح کا تارا نہ شام کا تارا۔''

سیمانہ چپ چاپ سنتی رہی۔اس کے دل کے آسمان پر لاتعداد تارے جگمگانے لگے۔ اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا شام کا تارا چمک رہا تھا۔ایک نئی روشنی کے ساتھ اس نے سوچا کون کہتا ہے کہ تارا ٹوٹ گیا۔

◆÷◆

آنٹی

وہ میری شادی کی بیسویں سالگرہ تھی۔آصف نے بہت بڑی پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ میرا دل خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔میرے دونوں ہاتھوں میں چمکتی ہوئی بیس بیس سونے کی چوڑیاں ان کے اور میرے دل کی کیفیت کی ترجمان تھیں۔آصف بھی عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔محبت کرنا اور نبھانا خوب جانتے تھے۔یوں تو کنگن، چوڑیوں اور دوسرے زیورات کے انبار جب ان کا دل چاہتا تھا لگا دیتے تھے۔مگر شادی کی سالگرہ کی سب سے بڑی خصوصیت ایک سونے کی چوڑی اور ایک گلاب تھا۔یہ ان کا اپنا انداز، اپنا طریقہ تھا۔آج وہ چوڑیاں بیس ہوگئی تھیں مگر کمال تو انہوں نے جب کیا کہ میرے دوسرے ہاتھ میں بھی بیس عدد سونے کی چوڑیاں پہنا دیں۔ میں اپنے آپ پر مغرور ہوگئی۔میرا غرور حسن اور بڑھ گیا۔میرا فخر میری تنی ہوئی گردن پر آکر بیٹھ گیا۔میرے چاروں بچے خوشی خوشی پارٹی کو کامیاب بنانے میں لگے ہوئے تھے۔میری اُنیس سالہ بیٹی شائزہ اور اٹھارہ سالہ بیٹا رشاب میرے ساتھ کھڑے تھے۔کوئی بھی نیا آدمی ان کو میری اولاد نہیں سمجھ رہا تھا۔میرا دوسرا بیٹا رفاق گیارہ سال کا تھا اور دوسری بیٹی منیبہ آٹھ سال کی تھی۔ دونوں پارٹی کی مووی بنانے میں مصروف تھے۔میری چوڑیوں کی چمک اور کھنک سب ہی کا دل موہ رہی تھی۔سب ہی کے دل میں اتری جا رہی تھیں۔اچانک شائزہ نے کہا۔"ممی ڈیڈی کی مووی کوئی نہیں بنا رہا ہے۔میں ابھی کیمرہ لے کر آتی ہوں۔" وہ کیمرہ لینے چلی گئی۔

اسی وقت وہ کہیں سے چھم سے آگئی۔اتنی خوبصورت تھی کہ میں مبہوت ہوکر اسی کو دیکھنے لگی۔آصف بھی متأثر نظر آرہے تھے۔وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔"آنٹی میں کچھ مدد کروں؟" میں اس کو پہچان نہیں سکی۔وہ کون تھی؟ کس کے ساتھ آئی تھی اور ہماری محفل میں کیا کر رہی تھی؟ کتنے سوالات میرے دماغ میں اٹھے۔ وہ سمجھ گئی اور بولی۔"آنٹی میں نشماں ہوں۔" میں پھر سوچنے پر مجبور ہوگئی۔اصل میں اس کا آنٹی پکارنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔اب میں اتنی بڑی بڑی

لگنے لگی ہوں کہ اجنبی لوگ مجھے آنٹی کہہ کر پکاریں۔ واقعی میں بڑے بڑے بچوں کی ماں ہونا بھی کمال ہے ورنہ میں ابھی صرف سینتیس سال کی ہوں۔ اس عمر میں تو بعض لوگوں کی شادیاں بھی نہیں ہوتی ہیں اور میں ایک انیس سال کی لڑکی اور اٹھارہ سال کے لڑکے کی ماں بھی ہوں۔ ہماری شادی بھی عجیب تھی۔ میں جب صرف سولہ سال کی تھی اور دنیا زمانے کے پروگرام لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ انٹر کے بعد میڈیکل میں جانے کی سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کب آصف نے مجھ کو دیکھ لیا اور میری خواہش کر بیٹھے۔ بہت امیر خاندان کے ماں باپ کی اکیلی اولاد تھے۔ میری مخالفت کے باوجود چٹ منگی پٹ بیاہ ہو گیا۔ منگنی میں ہیرے کی انگوٹھی اور دوسرے سامان کے ساتھ ایک جیگوار کار بھی آئی تھی۔ اتنی سخاوت کون دکھاتا ہے۔ لوگ تو جہیز میں کار مانگتے ہیں۔ منگنی میں لڑکے والوں کی طرف سے اتنی مہنگی کار کا آنا ایک عجوبہ ہی تو تھا۔ دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔ یہی چیز میرے ممی پاپا کو متأثر کر گئی۔ کیسی پڑھائی اور کہاں کی پڑھائی۔ سب ختم۔ پیسے ہی کے لیے تو لوگ پڑھتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی لاٹری نکل آئی تھی۔ قارون کا بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ میں خیالات کی دنیا سے واپس آئی تو وہ اب بھی وہیں پر کھڑی تھی۔ مجھے تعارف کروانا پڑا۔ ''آپ آصف ہیں میرے شوہر''۔

''ہیلو آصف صاحب۔'' اس نے بہت اپنائیت اور محبت سے کہا۔ پھر بولی۔ ''اچھا آنٹی اور آصف صاحب اب میں چلتی ہوں۔ آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پھر ملاقات ہوگی۔'' اور وہ وہاں سے چلی گئی۔ آصف نے بہت حیرت کے ساتھ مجھ کو دیکھا۔ اس وقت میں سمجھ نہیں سکی۔ بعد میں پتا چلا، بہت فخر تھا ان کو انکل نہیں کہا گیا۔ مجھے آنٹی پکارا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمر کی جھلکیاں میرے چہرے پر آ گئی ہیں۔ میرا جوان لگنا ایک دھوکا، ایک فریب ہے۔ جوان بچوں کی ماں کو اپنے بچوں کی ماں ہی لگنا چاہیے بہن نہیں۔ میرا دل تھوڑا سا بجھ گیا۔ کیا آئینہ جھوٹا تھا؟ میرا یہ سنگھار جو آج کی محفل لوٹے لے رہا تھا ایک فریب تھا۔ جو لوگ میرے حسن کی تعریف کرر ہے تھے وہ مجھے بنا رہے تھے، میرا مذاق اڑا رہے تھے۔

نشماں شائزہ کی دوست بن گئی۔ اسی بہانے میرے گھر بہت آنے لگی۔ مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ شائزہ کی دوست تھی۔ اس رشتے سے میں اس کی آنٹی ہی تو تھی۔ وہ جب بھی آتی ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاتی۔ آنٹی کہتے کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ آصف کا تو ہر کام کرنے کو تیار رہتی تھی۔ ایک دن آصف نے اس کی چائے کی تعریف کر دی۔ جب آتی یہ ہی کہتی۔ ''آنٹی! میں

آصف صاحب کی چائے بنادوں؟'' میں خوشی خوشی اجازت دے دیتی تھی۔ایک دن میں نے غور کیا وہ شائزہ کی دوست کم آصف کی دوست زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ پھراس بڑھتی ہوئی دوستی کی جھلکیاں دوسرے لوگوں نے بھی دیکھیں۔آصف اب بدل گئے تھے۔ کچھ کچھ بے درد بھی ہو گئے تھے۔ان کا رعب اور دھونس میرے اوپر دن بہ دن بڑھ رہے تھے۔ ہر وقت میری بے عزتی کرنے کو تیار رہتے۔مجھ کو دنیا کی سب سے حقیر چیز ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔مجھ کو جاہل کہتے جب کہ انہوں نے خود میری تعلیم کے سارے خواب اپنی دولت میں لپیٹ لیے تھے۔ ہر چیز میں دخل دینے لگے تھے،معمولی معمولی چیزیں سکھانے کی کوشش کرتے۔کبھی کبھی تو مجھے بہت غصہ آجاتا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتے تھے۔ایک دن میں نے ان کی اور نشماں کی گفتگو سن لی۔ پیار ومحبت میں ڈوبی گفتگو جیسے کسی کنوارے کی دنیا میں اس کی محبوبہ داخل ہورہی ہو۔نشماں کہہ رہی تھی۔'' آصف آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میں آپ سے۔آخر یہ کب تک چلتا رہے گا۔ہم لوگ محبت میں اتنا آگے جاچکے ہیں کہ پیچھے کی طرف واپسی مشکل ہے۔آپ مجھ سے شادی کب کر رہے ہیں؟''

آصف نے کہا۔''نشماں، مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے منیشا کو اطلاع دینے کے لیے کسی مناسب موقعہ کا انتظار ہے۔ظاہر ہے زندگی کی اتنی بڑی تبدیلی وہ آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔لیکن اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ یہ طئے ہے۔ ہمارا اور تمہارا پیار اتنا کمزور نہیں ہے۔اب تم بھی میری زندگی، میری ضرورت ہو۔'' یہ سنتے ہی میں جیسے پاگل ہوگئی، دل چاہا ابھی اور اسی وقت دونوں کا منہ نوچ لوں اور اس بدمعاش عورت کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔مگر اب معاملہ بہت آگے جاچکا تھا۔ کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بربادی لے لی تھی۔ وہ عورت کتنی بدمعاش، کتنی خطرناک تھی۔مگر یہ آصف کتنا ڈھونگی تھا، آج وہ میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک سراب، ایک دھوکا تھا جو میری زندگی، میرے دل سے نکل گیا تھا۔اس وقت اچانک میں اپنے کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگی۔ بلکہ یہ سب سن کر میں نے اپنے کو سب سے زیادہ تنہا محسوس کیا۔دیکھا جائے تو تنہا تو میں ہمیشہ سے رہتی تھی، مگر دل میں پھر بھی ایک لگاؤ رہتا تھا جو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔بچوں کے ہنگامے دل سے نکل پڑتے تھے، چڑیوں کے نغمے گونجنے لگتے تھے،فون کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی، پھر تنہائی کیسی؟ مگر آج میں تنہا اس لیے ہوں کہ میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ دوہری شخصیت میری زندگی کو دہلاتی تھی، میں

ڈرتی رہتی تھی۔ایک شخصیت تو میری تھی مگر یہ دوسری کس کی ہے؟ میں اس دوسری شخصیت سے خوفزدہ تھی، گھبراتی تھی۔ انسان کی دوسری شخصیت ایک ہنگامہ، ایک انقلاب، ایک تبدیلی کا نام ہے۔ جو وہ چھپا چھپا کر اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے، پھر اس کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب وہ چھپی ہوئی شخصیت اپنے میں زندگی پیدا کرتی جا رہی ہے۔ایک الگ چیز بنتی جا رہی ہے۔ دوسروں کو ڈرا رہی ہے۔ یہ ڈر بہت خوفناک ہے۔لگتا ہے سب کچھ ختم کر دے گا، سب کچھ بدل دے گا۔اس کو اپنائے رکھو تو ڈراتا رہے گا۔بس اس کا علاج یہی ہے کہ اس کو چھوڑ دو، زندگی میں سکون پانے کے لیے۔ ایک بار تو خوف محسوس ہوگا، کچھ درد ہوگا، کچھ آنسو نکلیں گے۔ اس کے بعد سکون ہوگا، ایک نہ ختم ہونے والا سکون اور یہ سکون ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ایک خوفناک چیز کو اپنائے رکھنے سے زندگی رک جاتی ہے، ابیوز بن جاتی ہے، جھگڑا بن جاتی ہے، لڑائی بن جاتی ہے۔ دل میں کوئی احساس نہیں رہتا، کوئی پیار نہیں رہتا ہے۔ زندگی کے اس جمود کو، اس تھمی ہوئی زندگی کو، اس جمی ہوئی زندگی کو ایک تبدیلی کا انتظار رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ضروری ہے، یہ تبدیلی ایک انقلاب ہے، یہ انقلاب ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ میں نے بھی زندگی کے اس انقلاب، اس تبدیلی کو آواز دے دی۔ آصف کی تبدیلی اب بہت خطرناک ہو رہی تھی، وہ ظلم میں بدلتی جا رہی تھی۔ میرے لیے اس کی باتوں اور رویوں میں اب صرف حقارت تھی۔ میرے صبر کی بھی اب حد ہو چکی تھی۔ ایک دن میں بھی چیخ پڑی۔ ''اب آپ مجھ پر اپنا رعب اور دھونس مت جمائیے۔ اب میں یہ سہہ نہیں سکوں گی اس میں اب میرے لیے کوئی اپنائیت کی خوشبو نہیں ہے، کسی غیر کے احساسات اور سوچوں کی بدبو آ رہی ہے۔'' آصف پہلے تو چپ چاپ کھڑے رہ گئے۔ اچھا تھا جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کی ابتدا میں نے ہی کر دی تھی، زندگی کے اس انقلاب کو اپنانے اور تبدیلی لانے کے لیے۔ بگڑا ہوا مرد کبھی بھی نہیں سدھرتا، وہ اپنی پوری فیملی کو کھا جاتا ہے، نگل جاتا ہے۔ آصف کو میں نے کھل کر بات کرنے کا موقع دے دیا جس کا وہ نہ جانے کب سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی وقت وہ فوراً بولے۔ ''میں نشماں سے شادی کر رہا ہوں۔''

مجھے کچھ بھی نہیں ہوا، میں اس بات کا خود نہ جانے کب سے انتظار کر رہی تھی۔ میں تیار تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، آپ مجھ کو طلاق دے دیجیے۔'' آصف خاموش ہو گئے، ان کو شاید مجھ سے اتنے سیدھے پن کی توقع نہیں تھی۔ تب ہی تو وہ لڑائی جھگڑے کا کب سے ماحول

بنا رہے تھے اور نہ ان کو امید تھی کہ میں طلاق کا مطالبہ کر بیٹھوں گی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ایک بیوقوف اور کمزور عورت ہوں ۔ ان سے لڑوں گی، ایک ہنگامہ کروں گی ۔ پھر رو دھو کر نارمل ہو جاؤں گی اور دوسری عورتوں کی طرح زندگی گزارنے لگوں گی۔ طلاق کا ذکر بھی نہیں ہوگا۔ ان کے خیال میں، میں ایک کمزور اور بے بس عورت تھی۔ لمبی خاموشی کے بعد بولے۔'' طلاق کی کیا ضرورت ہے۔ تم میری بیوی ہی رہو گی۔ کوئی تم سے تمہارا حق تھوڑی چھین رہا ہے۔ میں تو چار چار بیویاں رکھ سکتا ہوں۔ ابھی تو صرف دو ہیں۔ نشماں کو بھی اعتراض نہیں ہے۔''

نشماں کے نام سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مگر میں برداشت کر گئی اور کہا۔

'' آپ چار چار بیویاں رکھ سکتے ہیں، ٹھیک ہے۔ مگر مجھے کسی ایسے مرد کے ساتھ نہیں رہنا ہے جو ایک ساتھ دو بیویوں کا شوہر کہلائے اور بیویوں کی اسی لائن میں، میں بھی شامل رہوں۔ مجھے سابق یا ایکس کہلانا زیادہ پسند ہے۔''

وہ بگڑ گئے اور بولے۔'' پھر کیا کرو گی؟ زندگی کیسے گزارو گی؟ آخر میں تمہیں بھی تو پروٹیکشن دے رہا ہوں۔ طلاق میرے ہاتھ میں ہے، میں نہیں دوں گا۔''

میں نے فوراً کہا۔'' امید ہے آپ مجھ کو گنہگار نہیں کریں گے۔ مجھے جیسے ہی دوسرا آدمی ملے گا، میں فوراً شادی کر لوں گی۔'' وہ مسکرائے، جیسے دوسرا آدمی مجھے ملنا عجیب سی بات ہے، میں جو اس کی ہونے والی بیوی کی آنٹی تھی۔ دوسری عورت تو صرف مرد کو ملتی ہے، کیونکہ وہ سدا بہار رہتا ہے، ہمیشہ جوان لگتا ہے۔ بیوی سے دس سال بڑا ہو کر بھی جوان اور خوبرو۔ بیوی دس سال چھوٹی ہو کر بھی اس کی نظروں میں عمر رسیدہ۔ بہت طنز سے بولے۔'' تمہیں امید ہے کہ تمھیں دوسرا آدمی مل جائے گا۔''

'' ہاں کیوں نہیں ۔ امید پر دنیا قائم ہے ۔ اگر نہ بھی ملا تو میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ بولے۔'' خیر ٹھیک ہے مگر بعد میں پچھتانا نہیں۔''

میں نے کہا۔'' میں تو اس وقت صرف ایک ہی بات پر پچھتا رہی ہوں کہ میں نے آپ جیسے غلط آدمی سے شادی کیسے کر لی۔ شاید اس وقت میں بہت چھوٹی تھی اور فیصلے کی ہمت نہیں تھی۔ دولت کی نمائش کر کر کے آپ ہمیشہ عورتوں کی تلاش میں رہے۔ آپ میں اپنی کوئی بھی خوبی نہیں

ہے جو مجھ کو متاثر کرتی۔ ایک بات اور میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ طلاق کے بعد آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ بچے میرے پاس رہیں گے۔ نئی زندگی کے آغاز کے ساتھ آپ کے پاس دوسرے بچوں کو کمی نہیں رہے گی۔ جو عورت میرے ہاتھوں میں سونے کی چند چوڑیاں دیکھ کر آپ سے چپک گئی، ایسی لالچی اور خطرناک عورت پر میں اعتماد نہیں کرتی۔ وہ پوری دولت ہتھیانے کے لیے وہ میرے بچوں کا کیا حشر کرے گی یہ میں جانتی ہوں۔ وہ ان کا کردار ان کی زندگی بگاڑ کر رکھ دے گی۔ جو اِن بچوں کو صرف میں نے دیا ہے۔ آپ کو دولت کمانے اور ان کی نمائش کرنے میں کبھی بھی وقت نہیں ملا جو ان کی اچھی تربیت میں حصّہ لیتے۔ جب تک وہ اپنی زندگی میں سیٹل نہیں ہو جاتے آپ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ وہ آپ سے خفا اور غصے میں ہوں گے۔ یہ چیز ان کی زندگی اور ان کا مستقبل تباہ کر سکتی ہے۔ پیسوں کے لیے بھی میں اور میرے بچے آپ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ ان کی اور میری دونوں کی خودداری کو ٹھیس لگے گی۔ جو اُن میں زیادہ غم و غصہ اور اسٹریس پیدا کر سکتا ہے۔ ہمارا اسٹریس اور غصّہ ان معصوم لوگوں کی زندگی میں کیوں جائے؟ ان کی اپنی زندگی ہے اپنے اصولوں، اپنے کردار کے ساتھ زندہ رہیں، ان کی زندگی میں اپنا کوئی اسٹریس اور فکر و پریشانی آئے وہ اس کو برداشت کریں۔ ہم لوگوں کی زندگی کا غم و غصّہ ان کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ کچھ پریشان دکھائی دیے مگر میری بات سنتے گئے۔ میں نے طلاق لے لی اور جاتے جاتے ان سے یہ بھی کہہ دیا۔ ''یہ محل نما کوٹھی آپ نے میرے لیے بنوائی تھی اور مجھ کو دے دی تھی۔ یہ قرآن میں فرمان ہے کہ جس بیوی کو جو چیز دے دو وہ اس کی رہتی ہے اس کو واپس مت لو۔ یہ میرے بچوں کی امانت ہے۔ میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کوٹھی کو فوراً خالی کر دیجیے۔ میں اس کو کرائے پر اٹھا کر اپنے بچوں کی پرورش کروں گی اور ان کی ضرورتیں پوری کروں گی۔ بار بار آپ کے در پر بھیک مانگنے نہیں آؤں گی۔ کیونکہ وہ چالاک عورت آپ کو کچھ دینے نہیں دے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب آپ دوسری عورت کے انتظار میں بیس سال کا عرصہ نہیں گزاریے گا۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر اِس عورت کے دونوں ہاتھوں میں بیس بیس چوڑیاں ڈال دیجیے گا تا کہ چار چار بیویوں کے آنے میں دیر نہ لگے۔''

پھر میں اپنے والدین کے بنگلے پر جو کہ دوسرے شہر میں تھا اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی۔ اکلوتی اولاد تھی اس لیے وہ بنگلہ ممی پاپا کے انتقال کے بعد میرے حصّے میں آیا تھا اور آج تک بند پڑا تھا۔

◆

میں آصف ہوں میں نے ایک دن کسی محفل میں منیشا کو دیکھا تھا۔ بس اسی وقت اس سے شادی کرنے پر اڑ گیا تھا حالانکہ اس وقت وہ صرف سولہ سال کی تھی۔ میں اس سے دس سال بڑا چھبیس سال کا تھا اور پڑھ لکھ کر سیٹل ہو چکا تھا۔ منیشا کی زندگی میں کچھ خواب تھے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب۔ مگر میں پشتوں سے امیر چلا آ رہا تھا۔ دولت کے انبار میرے گھر میں تھے اور میں خود بھی اس دولت کو بڑھانے میں لگا ہوا تھا۔ اس لیے میرے گھر، میری زندگی میں منیشا جیسی حسین عورت کا اترنا باقی تھا بلکہ ضروری تھا۔ میرے ماں باپ میری پسند کی ہر چیز دیا کرتے تھے۔ منیشا کے لیے انہوں نے دوڑ دھوپ کی تھی۔ بڑی مشکل سے منیشا کے ماں باپ راضی ہوئے تھے۔ منگنی بہت دھوم سے ہوئی۔ منگنی میں قیمتی زیور، ہیرے کی خوبصورت انگوٹھی کے ساتھ ایک مہنگی کار جیگوار بھی دی گئی۔

اس دن ہماری شادی کی بیسویں سالگرہ تھی۔ میں اس کو بہت دھوم سے منا رہا تھا۔ منیشا بہت خوش تھی۔ میں منیشا کو خوش کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ خوشی اس کو اور حسین بنا دیتی تھی۔ اچانک وہ پتا نہیں کہاں سے چھم سے آ گئی۔ میں مبہوت سا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ ایسا حسن، ایسی معصومیت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تب ہی تو بیس سال سے منیشا کی پوجا کرتا چلا آ رہا تھا۔ منیشا میری بیوی آج شادی کی بیسویں سالگرہ پر بھی ایک اپسرا، ایک حور نظر آ رہی تھی۔ اپنی خوبصورت کلائیوں میں سونے کی بیس بیس چوڑیاں پہنے۔ یہ میرا دستور تھا کہ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ پر ایک سونے کی چوڑی اور ایک گلاب دیتا تھا۔ آج بیس چوڑیاں ہو گئی تھیں مگر میں نے شادی کی بیسویں سالگرہ کی خوشی میں دوسرے ہاتھ میں بھی بیس چوڑیاں اور پہنا دیں۔ آج وہ چالیس چوڑیاں پہنے کہیں کی شہزادی نظر آ رہی تھی۔ یوں تو جب میرا دل چاہتا تھا سونا، چاندی، ہیرے جواہرات کے انبار لگا دیتا تھا مگر شادی کی سالگرہ کی اپنی خصوصیت برقرار رکھنے کے لیے ایک سونے کی چوڑی اور ایک گلاب ہی دیتا تھا۔ یہ میرا اپنا افسانوی انداز تھا۔ چالیس چوڑیاں پہن کر وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چاروں بچے بھی بہت خوش تھے۔ میں خود اکلوتا بیٹا تھا اس

لیے ایک بڑا خاندان چاہتا تھا۔منیشا نے بیس سال میں دو خوبصورت بیٹے اور دو حسین ترین بیٹیاں دیں۔ بڑی بیٹی شائزہ انیس سال کی تھی، بڑا بیٹا رشاب اٹھارہ سال کا تھا۔ دوسرا بیٹا رفاق گیارہ سال کا اور چھوٹی بیٹی منیبہ آٹھ سال کی تھی۔ اتنا خوبصورت خاندان اتنی خوبصورت بیوی کسی کے پاس نہ ہوگی۔مگر چھم سے کہیں سے آنے والی میرے حواسوں پر چھا گئی جو کہہ رہی تھی۔''آنٹی میں نشماں ہوں۔''میں نشماں نام کی خوبصورتی میں کھوگیا۔منیشا کہہ رہی تھی۔''یہ میرے شوہر آصف ہیں۔''

''ہیلو آصف صاحب۔'' بڑی ادا سے کہا گیا۔ یہ ادا میرے دل پر وار کرگئی۔منیشا کو آنٹی کہنے والی مجھے آصف صاحب کہہ رہی تھی۔منیشا اتنی ایجیڈ ہوگئی ہے، میں اب بھی اتنا جوان لگتا ہوں، بڑے بڑے بچوں کا باپ ہونے کے باوجود۔ پھر وہ میرے گھر آتی رہی اور دوڑ دوڑ کر میرے کام کرتی رہی۔کام کرتے کرتے وہ مجھ کو اپنے کام کی نظر آئی۔ میں نے منیشا سے کہہ دیا۔ ''میں نشماں سے شادی کر رہا ہوں۔'' اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، فوراً منظور کرلیا، میں خوش ہوگیا۔مگر ایک دم سے اس کی طلاق کی فرمائش نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔اس نے نہ صرف طلاق مانگی تھی، بلکہ یہ شرط بھی رکھی تھی کہ میں بچوں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔مگر کیوں؟ میں تو صرف دوسری شادی کر رہا تھا اس کو چھوڑ تو نہیں رہا تھا، وہ میری بیوی تھی اور ہمیشہ رہے گی، میں دو شادی کروں یا چار اس سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میرے پاس اتنی دولت تھی کہ میری چاروں بیویوں کی سات پشتیں آرام سے زندگی گزار سکتی تھیں۔مگر وہ برابر یہی کہے گئی۔''جب تک بچے اپنی زندگی میں سیٹل نہیں ہو جائیں گے آپ کو ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے۔ یہ کوٹھی میری ہے، اس کے کرائے سے ہی ان کی پرورش ہوگی، میں اور میرے بچے آپ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔نئی زندگی میں آپ اور آپ کی بیویاں یہ موقع آنے ہی کب دیں گی کہ آپ ایمانداری سے اپنا فرض نبھائیں۔ شیطان صفت عورتیں جب دولت کے لیے آرہی ہیں تو وہ دولت اپنے اور اپنے بچوں کے لیے رکھیں گی، مجھے اور میرے بچوں کو ہارڈ ٹائم دیں گی، سخت وقت سے گزاریں گی جس سے میرے بچوں کا مستقبل، ان کی تعلیم، ان کا مارل متاثر ہوگا۔ان میں غم وغصہ اور اسٹریس پیدا ہوگا۔ان کا مستقبل ان کی تعلیم ہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ میں ان کو اس سے محروم نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی زندہ ہوں ان کا خوبصورت مستقبل بنانے کے لیے۔ان کی زندگی کو اعلیٰ ترین اور اصولی بنانے کے لیے۔ وہ اپنی زندگی اپنے مارل، اپنے اصول

کے ساتھ گزاریں گے، ہماری زندگی کے غم، پریشانی اور اسٹریس کو لے کر نہیں۔جس دولت کو میں نے ٹھوکر ماردی، اس دولت کا خواب لے کر ان کی زندگی میں کبھی بھی مت آیئے گا۔'' میں نے منیشا کو بہت ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رکھا تھا، وہ عیش کی زندگی کی عادی ہوگئی تھی۔آخر منیشا میرا پہلا پیار تھی، کتنی مشکل سے میں نے اس کو پایا تھا۔اس سے مجھے آج بھی محبت تھی۔ وہ اِس وقت اگر غصّے میں مجھے چھوڑ کر جارہی تھی تو ایک دن میں اس کو منا کر پھر اپنی زندگی میں واپس لے آؤں گا۔ مجھے میرے بچے پھر واپس مل جائیں گے۔ میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔مگر منیشا میں ایک ضد تھی، ایک خودداری تھی جس سے میں پریشان ہوگیا اور میرا ارمانوں سے بسایا گھر ٹوٹ گیا۔ پتا نہیں اس میں میری غلطی کتنی تھی، مگر میں تو منیشا کو ہی الزام دے رہا تھا۔کون سی قیامت آگئی اگر میں نے دوسری شادی کرلی۔اس کا گھر تو نہیں توڑنا چاہ رہا تھا اس کی سرپرستی سے تو منہ نہیں موڑ رہا تھا۔اس کے عیش میں خلل تو نہیں پڑ رہا تھا۔عورت کو پروٹیکشن کی ضرورت ہوتی ہے، میں اس کے پروٹیکشن سے تو اپنے کو الگ نہیں کر رہا تھا۔مگر طلاق کی ضد اور بچوں کو اپنے پاس رکھنے، وہ بھی دوسرے شہر میں رکھنے کا خیال تھوڑی دیر کے لیے مجھے پریشان کرگیا۔خیر صرف دو ہی چار سال کی بات ہے، جب اس کا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں اس کو اور بچوں کو واپس لے آؤں گا۔آخر ہم لوگوں نے پیار بن کر ایک مدت ساتھ گزاری ہے، وہ میرے پیارے پیارے بچوں کی ماں بھی تو ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس کی بات مجھے دل سے پسند آگئی۔اب ہم آزاد زندگی اپنی نئی بیوی کے ساتھ گزار سکتے تھے۔ بڑے بڑے بچوں کی ذمہ داری صرف سگی ماں ہی اٹھا سکتی ہے، باپ کی دوسری بیوی نہیں۔اس کی پیسوں سے بیزاری بھی مجھے پسند آئی تھی۔ میں منیشا کو بہت پُر امید نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ میری خود غرضی بھی تھی۔ دولت کے نشے میں چور ہو کر ہوسکتا ہے وہ اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی کرتی۔عیاشی میں پڑ جاتی۔اتنی دولت منداور حسین عورت کسی بھی مرد کو پسند آسکتی تھی اور کوئی غلط آدمی اس کی زندگی میں آکر ہمارے بچوں کا مستقبل خراب کرسکتا تھا۔ پیسہ اتنا ہی ہونا چاہیے جو ان کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ان کے لیے اس محل نما کوٹھی کا کرایہ ہی کافی تھا۔ دو بچے میڈیکل کالج میں تھے۔ دو بچے مہنگے اعلیٰ پرائیویٹ اسکول میں تھے۔نوکر رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سب مل جل کر ہی کام کرسکتے تھے اور تعلیم کی ویلیو سمجھ سکتے تھے۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ عیش وآرام میں پلے ہوئے بچے اور منیشا اتنی تکلیفوں سے گزریں کہ غصّہ گرمی بھول کر عیش

وآرام کی دنیا میں پھر واپس آ جائیں جہاں سیکڑوں نوکران کی خدمت کے لیے حاضر تھے، جہاں دولت ان کا آرام، ان کا ارمان بنی، آنکھیں بچھائے تھی۔

میں نے منیشا کی شرطیں منظور کرلیں۔ میرا اپنے بچوں سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ راتوں کو مجھے ان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور میں بے چین ہو جاتا۔ اندر سے کوئی چیز شاید میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا، مجھے توڑتا رہتا۔ آخر منیشا کا کیا قصور تھا جو اس کو میں نے اتنی بڑی سزا دی تھی۔ اس کے اکیلے کندھوں پر چار چار بچوں کی ذمہ داری بھی ڈال دی تھی۔ ایک دنیا اجاڑ کر دوسری دنیا کا خواب کتنا بڑا فریب، کتنا بڑا دھوکا تھا، مگر میں پھر بھی اس میں رہ رہا تھا۔ صرف ایک امید کے سہارے ایک دن میں ان سب کو واپس لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

◆

مجھے پتا نہیں میں کیسے اس شاندار پارٹی میں چلی گئی۔ یہ میری عادت تھی کہ اکثر میں بغیر بلائے، بغیر جان پہچان کے پارٹیوں میں گھس جاتی تھی اور ایسا گھل مل جاتی تھی کہ کوئی مجھے پہچان نہیں پاتا تھا۔ مجھے خود بھی کسی اجنبی پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ کسی کو کوئی شک بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ میرا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ شاندار پارٹی منیشا اور آصف کی بیسویں شادی کی سالگرہ کی خوشی میں تھی۔ منیشا کے دونوں ہاتھوں میں بھری بھری سونے کی چوڑیاں مجھے جلا گئیں۔ اس عورت کو کتنا فخر ہے کہ جوان جوان بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی کتنی جوان اور خوبصورت ہے اور بیس سال سے یہ امیر ترین آدمی اس کا ہے، صرف اس کا، دولت کے انبار رکھتے ہوئے صرف ایک بیوی۔ نہ کوئی دوسری عورت نہ گرل فرینڈ۔ بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے پاس تو حرم ہونا چاہیے تھا۔ منیشا جدھر جا رہی تھی وہ اپنی پیار بھری نظریں پھینک رہا تھا، جیسے منیشا کے بعد کوئی حسین عورت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اتنا اونچا کردار، اتنا ہائی کریکٹر، تعجب ہے، سخت تعجب! مرد عموماً اپنی بیویوں سے بیزار ہو جاتے ہیں اور ادھر ادھر نظریں پھینکنے لگتے ہیں۔ مگر یہ آدمی کتنا عجیب ہے۔ مگر مرد پھر بھی مرد ہوتے ہیں، ان کو ہینڈل کرنے والا دماغ ہونا چاہیے۔ میں چھم سے ان کے سامنے پہونچ گئی۔ عورت کی ایک کمزوری مجھے معلوم تھی وہ سب کچھ برداشت کرسکتی ہے، مگر اپنے کو عمر رسیدہ لگنا پسند نہیں کرتی۔ جب کہ اتنا امیر اور اسمارٹ شوہر نظر کے سامنے ہو اور مرد بھی بیوی کا ایجیڈ ہونا گوارا نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ ''آنٹی! میں آپ کی کوئی مدد کرسکتی ہوں۔'' اس نے چونک کر مجھے

دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''آنٹی میں نشماں ہوں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔'' پھر میں نے سوالیہ نظروں سے سامنے کھڑے آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی اور جلدی سے بولی۔ ''یہ آصف ہیں! میرے شوہر۔''

''ہیلو آصف صاحب!'' میں نے کہا۔ میری مکاری کام کر گئی۔ وہ مبہوت مجھے دیکھتا رہا۔ آنٹی لفظ نے دونوں کو چونکا دیا اور آصف صاحب نے آصف کو۔ اس کے بعد میں ان کے گھر آنے جانے لگی۔ آنٹی منیشا مجھ سے بہت خوش تھیں، میں ہر کام میں ان کی مدد کرتی رہی، پھر اچانک میں آصف کے سارے کام کرنے لگی۔ میری بنائی چائے، میری بنائی روٹیاں، میرا بنایا ہوا میٹھا سب ہی آصف کو بھانے لگا۔ نوکروں کے بنائے کھانے کھاتے کھاتے وہ بیزار ہو گئے تھے۔ میرا آنا جانا ان کے کھانے پینے میں زبردست تبدیلی لانے لگا۔ منیشا بھی کبھی کبھی ان کی پسند کی چیزیں بناتی تھی۔ شاید میری قربت پانے کے لیے وہ میری بنائی ہوئی چیزوں کی تعریف دل کھول کر کرتے تھے اور میں خود ان کے قریب آنے کے لیے کھانا اور چائے بنانے کا ڈرامہ کر رہی تھی۔ ہم دونوں بہت قریب آ گئے۔ ہماری ملاقاتیں گھر سے نکل کر باہر کی ہو گئیں۔ اب میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں اپنی پسند کے کھانے کھا رہی تھی۔ اب آصف مکمل طور پر میرے بُنے ہوئے جال میں پھنس چکے تھے۔ اب بڑے بڑے بچوں کی ماں سے بیزار ہو گئے تھے۔ میں بہت خوش تھی، اب وہ مجھ سے شادی کے لیے بھی راضی تھے۔ مجھے ان کی دوسری بیوی بننے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے بچوں کو بہت چاہتے ہیں۔ منیشا اور ان کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ میرا پیار میری چاہت بھی اب ان کے لیے ضروری ہو گئی تھی، میرے بغیر بھی اب وہ سکون کی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ مگر شادی کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اب مجھے کھل کر بات کرنی تھی۔ ایک دن جب میں آصف کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ منیشا کو اس طرف آتے دیکھ کر میں نے عشق و محبت اور شادی کی بات چھیڑ دی تاکہ منیشا بھی سن لے۔ میں نے کہا۔ ''آصف! آپ کو مجھ سے اور مجھے آپ سے کتنا پیار ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ مجھ سے شادی کب کریں گے؟'' آصف نے کہا۔ ''تم میری زندگی، میرا پیار ہو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے خاص وقت، کسی خاص موقعے کا انتظار ہے۔ مجھے منیشا کو اطلاع دینی ہے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی تبدیلی کو وہ آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔ لیکن اس کو قبول کرنی پڑے گی۔ میرا اور تمہارا پیار اتنا

کمزور نہیں ہے جو آسانی سے ہار مان لے۔ تم بھی اب میری زندگی اور ضرورت ہو۔'' پھر گھر میں انقلاب آ گیا۔ منیشا نے طلاق مانگ کر ہماری زندگی اور آسان کر دی۔ صرف وہ محل نما مکان مانگا جس میں وہ لوگ رہ رہے تھے۔ وہ محل نما کوٹھی منیشا کی تھی اور خاص کر اُس کے لیے بنوائی گئی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ آصف ایک بیمار ذہنیت کا آدمی ہے، بچوں سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ بیوقوف عورت اپنی انا اور ضد کے پیچھے اپنے قدموں پر رکھی دولت کو لات مار رہی تھی۔ میں دوسری، تیسری، چوتھی کوئی بھی بیوی بننے کے لیے تیار تھی اور بعد میں بھی مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، چاہے جتنی عورتیں اس کی زندگی میں آئیں۔ مگر مجھے بیوی کا درجہ مل گیا تھا۔ وہ اب میں چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اتنی دولت بانٹ کر کھانی چاہیے، اکیلے اکیلے کہاں ہضم ہوگی۔ اب آصف میرا تھا، اس کے بچے میری خوبصورت زندگی کو جہنم بنا سکتے تھے۔ اس کی شرط بھی منیشا نے رکھ دی کہ بچے اس کے پاس رہیں گے۔ آصف کو چھوڑنے پڑیں گے۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑے گی۔ واہ ری میری تقدیر! اب تک کہاں چھپی بیٹھی تھی؟ میں اپنی زندگی کو آصف کے بڑے بڑے بچوں کی دیکھ بھال میں دفن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ منیشا اگر بچوں سے آزاد زندگی گزارتی تب بھی مجھ کو اس سے جلن محسوس ہوتی اگر اس کے بچے میرے سر پر میری ذمہ داری ہوتے۔ وہ بچے نہ مجھے برداشت کر پاتے نہ میں ان کو۔ خواہ مخواہ کے لیے میری زندگی میں ایک ٹینشن ایک انتقامی ماحول رہتا۔ منیشا نے اس سے بھی مجھے بچا لیا۔ اب آصف میرا تھا۔ اس کی دولت میری تھی، اس کے سارے خوبصورت خوبصورت گھر میرے تھے۔ کتنی بڑی لاٹری میرے نام نکلی تھی۔ یہ سب آنٹی کا کرم تھا، ان کا فضل تھا۔ اگر آنٹی اپنی زندگی میں نہ آئی ہوتیں تو آج میں وہی ہوتی جو میں تھی، یعنی کچھ بھی نہیں۔ معمولی معمولی ہی آدمی میری زندگی میں رہتے، یہ دولت، یہ نام، یہ رتبہ کہاں ملتا؟ آصف جیسا اونچا آدمی کہاں ملتا؟ زندگی کے یہ عیش میرے لیے صرف خواب ہوتے۔ لیکن آج وہ حقیقت تھے، میری زندگی کی حقیقت۔

◆

میں منیشا ہوں۔ آج میری شادی کی چوتھی سالگرہ ہے۔ میرے ساتھ میرے شوہر کاشف بھی ہیں۔ اتفاق سے ہماری شادی بھی اسی دن ہوئی تھی جس دن میری پہلی شادی آصف کے ساتھ ہوئی تھی۔ آج میرے ہاتھوں میں نہ تو پچیس چوڑیاں ہیں نہ ایک عدد گلاب کی نمائش

ہے۔ایک خوبصورت پھولوں کا گلدستہ ضرور ہے۔میرے ہاتھوں میں شادی کی چوتھی سالگرہ کے دن چار سونے کی چوڑیاں بھی نہیں ہیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر کانچ کی خوبصورت چوڑیاں پہن رکھی ہیں، جن پر مجھے فخر بھی ہے کیونکہ یہ چوڑیاں میری خوشحال ازدواجی زندگی اور میرے سہاگ کی نشانی ہیں۔اچانک میری آنکھیں جو اٹھیں تو میں حیران رہ گئی۔نشماں اور آصف بھی وہاں موجود تھے۔وہ میرے شہر میں کیا کر رہے تھے؟ یہ سوال اٹھا، پھر سوچا، کہیں وہ اسی شہر میں تو نہیں رہنے لگے ہیں۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ جب سے میری طلاق ہوئی تھی مجھے آصف کی کوئی خبر نہیں تھی اور نہ آصف کو ہی میرے بارے میں کوئی اطلاع تھی۔آج اچانک ان کو اپنے سامنے پا کر میں بے چین ہوگئی، جیسے میری خوشی پر ایک بار پھر نشماں اور آصف نے حملہ کر دیا۔نشماں ایک ہاتھ میں کنگن پہنے تھے اور دوسرے میں گھڑی تھی۔میں ان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کاشف کے بارے میں جو میرا شوہر تھا اور میری نئی زندگی تھا،مگر اس سے تعلق کتنا پرانا تھا۔آصف سے بھی پرانا۔وہ ہمیشہ ہی اپنا تھا۔

کاشف کا بنگلہ اور میرا بنگلہ قریب قریب تھا۔دونوں بنگلوں کو بانٹتی ہوئی ایک دیوار تھی۔ دونوں خاندانوں میں اتنی دوستی تھی کہ لان کی دیوار کے بیچ میں ایک دروازہ بھی تھا تاکہ دونوں خاندانوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے میں آسانی رہے۔میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔کاشف دو بھائی تھے۔کاشف جس دن پیدا ہوئے تھے اسی دن میں بھی پیدا ہوئی تھی،فرق صرف اتنا تھا کہ کاشف صبح کے چھ بجے پیدا ہوئے تھے اور میں شام کے چھ بجے پیدا ہوئی تھی۔دونوں گھروں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔اسی وقت ہم دونوں کی شادی طے کر دی گئی تھی۔ سب لوگ کہتے تھے میں کتنی خوش قسمت ہوں، اپنا جوڑا لے کر پیدا ہوئی ہوں۔ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہونے لگے۔ایک ہی اسکول تھا ہم دونوں ساتھ ساتھ آتے جاتے تھے۔ پھر ساتھ میں بیٹھ کر ہوم ورک کرتے تھے۔دونوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا،فرسٹ آنا،ٹاپ کرنا اور ڈاکٹر بننا۔کلاس میں کبھی وہ ٹاپ کرتا کبھی میں۔کاشف کے پاس نہ کوئی دوست تھا اور نہ میرے پاس کوئی سہیلی۔بس میں اور کاشف ہی ایک دوسرے کے اکلوتے دوست تھے۔زندگی کی گاڑی بہت خوبصورتی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

اچانک ایک دن آصف کی فیملی میرے گھر آئی۔آصف مجھ کو دیکھتے ہی رہ گئے۔میں

اس وقت صرف سولہ سال کی تھی آصف مجھ سے دس سال بڑے خوبرو جوان تھے۔ پڑھائی ختم کر چکے تھے۔ باپ دادا کا بزنس دیکھ رہے تھے وہ بھی میری طرح اکلوتے تھے۔ پھر حالات بدل گئے۔ وہ فیملی میرے یہاں آتی جاتی رہی۔ ایک دن رشتہ بھی آ گیا۔ ممی پاپا نے انکار کر دیا۔ ابھی میری عمر ہی کیا تھی۔ ابھی تو مجھے بہت پڑھنا تھا مگر دولت کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی، ان کی بیٹی ہمیشہ سے بہت خوش قسمت تھی۔ اتنے دولت مند گھرانے کا رشتہ چھوڑا نہیں جا سکتا تھا جبکہ وہ لوگ خود پیچھے پڑے تھے۔ دوڑ دوڑ کر آ رہے تھے۔ منگنی کی رسم فوراً ادا کر دی گئی۔ ممی پاپا بھول گئے کہ وہ کسی اور کو بھی زبان دے چکے ہیں۔ وہ لوگ اتنے امیر نہ سہی، پھر بھی غریب تو نہیں تھے۔ کاشف کے پاس بھی ایک خوبصورت مستقبل تھا۔ کاشف میری پسند تھے۔ بچپن سے میں نے ان کو اپنے منگیتر کے روپ میں دیکھا اور سنا تھا۔ ان کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے بہت مخالفت کی اور کہا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے، مجھے شادی نہیں کرنی۔ مگر میری نہیں سنی گئی۔ میں زیادہ احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ منگنی ہو گئی میں نے سوچا کہ شاید اب بھی مجھے پڑھنے کا موقع ملے گا، میں ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ اس کے بعد شادی ہو گی۔ اس عرصے میں بڑی ہو کر میں کاشف سے ہی شادی کروں گی۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ منگنی کے ایک مہینے کے بعد میری شادی ہو گئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ کاشف بھی پڑھنے ہوسٹل چلا گیا۔ میں نے اس کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے بھائی کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔

آصف کو بہت مہربان پایا۔ اس کی دنیا ایک طلسمی دنیا کی طرح لگتی تھی۔ جس چیز کی خواہش ہو، وہ جادو کی چھڑی کے کرشمے کی طرح حاضر ہو جاتی تھی۔ دنیا کی ہر چیز وہ میرے لیے خرید لینا چاہتا تھا، میری کوئی خواہش، کوئی تمنا ادھوری نہیں رہی۔ پھر شادی کے بیس سال ہو گئے اور یہ بیس سال زندگی کو بدل گئے۔ نشماں ہماری فیملی میں گھس آئی؛ میرے ہاتھوں کی بیس بیس چوڑیاں اس کو بھا گئیں، اور خود آصف سے طلاق لینے میں، میں نے بہت جلدی کی۔ اس شرط کے ساتھ کہ بچے میرے پاس رہیں گے۔ آصف کی عقل پر نشماں کی جوانی کا ایسا پردہ پڑا تھا کہ وہ مان گئے۔ صرف مجھ سے ہی نہیں بچوں سے بھی دستبردار ہو گئے۔ دولت اور دولت کدہ ان کا ہو گیا۔ مگر دولت کدہ میرے لیے خریدا گیا تھا وہ میرا تھا۔ میں نے اس کو خالی کروا لیا اور کرائے پر اٹھا دیا اور اپنے بچے لے کر ممی پاپا کے شہر میں ان کے بنگلے پر آ گئی۔ وہ بنگلہ جو اب میرا تھا، ممی پاپا کا انتقال

ہو چکا تھا ورنہ وہ کبھی بھی آصف سے مجھے طلاق نہیں لینے دیتے۔ ان کی چار بیویوں کی صف میں مجھے بھی شامل رکھتے۔ آخر میں اس کی بیاہتا بیوی تھی۔ اتنی آسانی سے آصف کی دولت سے مجھے کنارہ کش نہیں ہونے دیتے۔ ان کے نزدیک آصف نہ سہی اس کی دولت تو میری رہتی جس کی وجہ سے انہوں نے میری کم عمر میں شادی کا ڈرامہ کھیلا تھا۔ میرے خوش حال مستقبل کا ڈرامہ اور وہ دونوں میری خوشحال اور کامیاب شادی شدہ زندگی سے مطمئن ہو کر اس جہان سے چلے گئے۔ ان کی پسند کتنی اچھی تھی، ان کی بیٹی کتنی خوش اور مطمئن تھی۔ مگر وہ بھول گئے کہ میری زندگی ان کی زندگی کی طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ شادی کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ وہ زندگی اور موت کا ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ اگر عورت کے بچے نہیں ہوتے تھے تو دوسری عورت لائی جاتی تھی۔ اگر عورت کے پاس صرف لڑکیاں ہوتی تھی تو لڑکے کے لیے دوسری شادی رچائی جاتی تھی۔ اگر لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو جوانی میں کمی دکھائی دیتی ہے۔ جو جوان جوان بچوں کی ماں کہیں سے نہیں لاسکتی ہے اور دنیا میں جوانیوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر دولت ہر طرف خوبصورت پھولوں کی طرح بکھری ہو۔ میرے خاندان پر لوگ رشک کرتے تھے۔ دولڑکے اور دولڑکیاں اپنی ذمہ داریاں نبھاتا ہوا شوہر۔ اس سے زیادہ اور زندگی کو کیا چاہیے تھا۔ ایک کامیاب فیملی تھی، مگر اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اب صرف میں تھی اور میرے بچے اور مجھے ان کو پیار و محبت کی دولت دے کر ان کا مستقبل شاندار کرنا تھا۔

میں آرام سے اپنے پرانے گھر میں رہنے لگی۔ وہ گھر جہاں میں پیدا ہوئی تھی جو میرے لیے تھا۔ جس گھر میں، میں سولہ سال گزار کر دوسرے گھر چلی گئی تھی۔ اب برسوں بعد وہ میرا تھا۔ اس کی باہیں میرے لیے ویسی ہی کھلی تھیں جیسے میرے بچپن میں کھلی ہوتی تھیں۔ اس کی آغوش میری پناہ گاہ تھی۔ وہی میری ماں، میرا باپ، میرا خاندان تھا۔ اب بھی وہ میری نگہداشت کر رہا تھا ایک اچھے سرپرست کی طرح۔ پاس کا بنگلہ کاشف کا تھا۔ پتا نہیں وہاں کون رہتا تھا۔ میں نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ بند پڑا تھا۔ کبھی کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ کچھ دنوں کے بعد اچانک کاشف کے گھر میں کچھ حرکت، کچھ جان نظر آئی۔ شاید وہاں کچھ انسان آکر بس گئے تھے۔ انسانوں ہی سے تو مردہ مکانوں میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور وہ گھر بن جاتے ہیں۔ پھر اچانک ہی ایک دن اس گھر میں مجھے کاشف نظر آیا میں دیکھتی رہ گئی۔ وہ ویسا ہی تھا۔ بیس سال

بعد بھی ویسا ہی تھا۔ میں جو اس کی ہمعمر تھی اپنے کو اس کا بزرگ محسوس کرنے لگی۔ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے زمانہ وہیں پر ٹھہر گیا ہو، رک گیا ہو۔ جہاں پر میں اس کو چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک دم سے اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ پھر چیخ اٹھا۔ ''منیشا یہ تم ہو؟'' میں چپ رہی۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا میرے گھر میں داخل ہوا۔ میں نے بہت حیرت سے پوچھا۔ ''کاشف! تم یہاں رہتے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''دو دن ہوئے میں اپنے بچوں کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ اب یہیں رہنے کا ارادہ ہے، مگر تم یہاں کیسے؟'' اس نے سوال کیا۔ وہ میرا دوست، میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس نہ کوئی دوست تھا نہ سہیلی۔ بس آنکھ کھول کر اس نے مجھے اور میں نے اس کو دیکھا تھا۔ اس کے پاس ایک بھائی تھا، میرے پاس وہ بھی نہیں تھا۔ میں اکلوتی اولاد جو تھی۔ میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کو بہت افسوس ہوا۔ یہ میری عدت کا زمانہ تھا۔ مردوں کے پاس تو عدت ہوتی نہیں ہے، اس لیے آصف شادی کر چکا تھا۔ کاشف ہر طرح سے ایک اچھے دوست کی طرح میرا خیال رکھنے لگا۔ وہ اب ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ اگر میرے ممی پاپا نے مجھ کو اتنی امیر اور خوشحال زندگی میں نہ جھونک دیا ہوتا تو میں بھی آج ایک ڈاکٹر ہوتی اور میری تعلیم اتنی کم نہ ہوتی۔ وہ مجھے سمجھاتا، تسلی دیتا، اس سے مجھ میں بہت تبدیلی آ گئی۔ میں غم اور مایوسی کے گرداب سے نکل کر پھر سے خود کو دنیا اور زندگی کی طرف آتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ کاشف کی بیوی کا انتقال کینسر جیسے موذی مرض میں ہو گیا تھا۔ اس کے بھائی اور بھابی بھی کسی حادثے میں گزر گئے تھے۔ اس کے پاس بھی چار بچے تھے۔ دو بھائی کے بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور دو خود اس کے بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اس کی بیوی بہت نیک اور شریف تھی۔ ان کی شادی کے بعد ہی اس کے بھائی اور بھابی کا حادثہ ہوا تھا۔ بچے چھوٹے تھے۔ اس نے اپنے بچوں کی طرح ان کو اپنا لیا تھا۔ جب خود اس کے بچے ہوئے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں بچے بھی اس کے نہیں ہیں۔ اب اس کی بیوی کے انتقال کو بھی کئی سال ہو گئے تھے۔ چاروں بچوں کی دیکھ بھال اکیلے کاشف نے ہی کی تھی۔ ان کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کیسی عورت ملے جو بچوں کے لیے ٹھیک نہ ہو، ان میں فرق رکھے۔ اس کا بڑا بیٹا شان بائیس سال کا تھا اور میڈیکل کے چوتھے سال میں تھا میری بیٹی شائزہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی۔ میرا بیٹا رشاب میڈیکل کے پہلے سال میں تھا۔ کاشف کی رانی ابھی صرف سولہ سال کی تھی، میڈیکل میں ہی جانا چاہتی تھی۔ اس کا بیٹا راشم میرے

بیٹے رفاق کے برابر بارہ سال کا تھا۔اس کی بیٹی سبیکا اور میری بیٹی منیبہ آٹھ سال کی تھیں۔ہم دونوں کے بچوں کو اب بھی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔پھر عدت ختم ہوتے ہی میں چونک پڑی، جب کاشف نے مجھے شادی کا پیغام دیا۔میں حیران رہ گئی، بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔میں بڑے بڑے بچوں کے سامنے شادی کیسے کروں؟ مجھ میں اور آصف میں کیا فرق رہ جائے گا۔یہ تو ہمارے بچوں کی شادی کا وقت تھا۔کاشف نے سمجھایا۔''بچوں کی اپنی زندگی ہے۔پھر ہم لوگوں کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ صرف اڑتیس سال۔اس عمر میں لوگ شادی کرتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔''ہم لوگوں کے پاس شادی کے قابل بچے ہیں۔'' وہ بھی ہنس دیا اور بولا۔''میرا شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے کسی بھی عورت پر بھروسہ نہیں ہے، پتا نہیں وہ کیسے مزاج کی ہو۔وہ میرے بچوں کی اچھی تربیت اور دیکھ بھال کر سکے گی یا نہیں۔خود ماں بن کر ان بچوں میں فرق نہ رکھے۔ان کی زندگی کو تار تار نہ بنا دے۔مگر تم سے بہتر ماں اس دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے جو اپنے بچوں کا صحیح مستقبل بنانے کے لیے دولت کو ٹھوکر مار دے اتنی قربانی کون کرتا ہے؟ تم ایک عظیم ماں ہو۔یہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ جہاں اپنے بچے پال رہی ہو میرے بھی اپنے سمجھ کر پال دینا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ایک دوسرے سے ملیں گے ضرور، ایک دوسرے کا خیال بھی رکھیں گے تو یہ دنیا سکون سے نہیں رہنے دے گی۔مجھے تمہاری عزت بہت پیاری ہے۔میری وجہ سے کوئی تمہاری طرف انگلی اٹھائے یہ میں کبھی بھی برداشت نہیں کرسکوں گا اور میں تمہیں تنہا بھی اس دنیا میں نہیں چھوڑ سکتا۔ہم دونوں صرف شادی کر کے ہی عزت کی زندگی گزار سکتے ہیں۔''

اتنا سن کر بھی میں اب بھی رضا مند نہیں تھی۔میں نے کہا۔''کہیں ایسا نہ ہوا ہماری شادی ہمارے بچوں کی شادی میں رکاوٹ بن جائے۔'' وہ جلدی سے بولا۔''میں بچوں کی شادی کا انتظام ابھی کیے دیتا ہوں۔ہمارے شان کے ساتھ تمہاری شائزہ کی شادی ہوگی جو جلد ہی کر دی جائے گی۔شادی کے بعد بھی وہ پڑھتی رہے گی۔تمہارے رشاب کے ساتھ ہماری رانی کی منگنی کر دی جائے گی۔جب رشاب تعلیم مکمل کرلے گا تب شادی ہوگی۔شادی کے بعد رانی بھی پڑھتی رہے گی۔رفاق کی شادی سبیکا اور راشم کی شادی منیبہ کے ساتھ ہوگی۔مگر اعلان ابھی نہیں ہوگا۔وہ لوگ بہت چھوٹے ہیں۔اس طرح ہمیں اپنے بچوں کے لیے اجنبی گھر نہیں ڈھونڈھنے پڑیں گے۔ سب بچے ہمارے رہیں گے۔کوئی ان کو ہم سے جدا نہیں کر سکے گا۔یہاں تک کہ آصف بھی نہیں۔''

کاشف نے منٹوں میں زندگی کے کتنے مسئلے حل کر دیے۔سب سے بڑا مسئلہ لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کا تھا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہیں آصف ان کو واپس نہ لے لے یا وہ خود ان کے پاس نہ چلے جائیں۔ان کے خود جانے کی تو مجھے امید کم تھی، کیونکہ وہ آصف سے خفا تھے۔ان کی بے مروتی سے ناراض تھے اور فیملی کے ٹوٹنے سے مایوسی کا شکار تھے۔ان کو آصف کی دولت سے نفرت تھی۔جس نے ان کا اونچا کردار ختم کر دیا تھا ایک فضول سی عورت کے لیے۔اب ہمارے پاس کوئی پرابلم نہیں تھی۔زندگی اکیلے تو نہیں کٹ سکتی۔دوسرا موقع بھی اتنا اچھا اور اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتا۔ہمیں معلوم تھا ہم دونوں مل کر اپنے بچے خوب اچھی طرح پرورش کریں گے۔ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ ہمارے بچے آپس میں خوش رہیں گے ہم دونوں نے اپنے اپنے بچوں کی رضامندی سے جلد ہی شادی کر لی۔اتفاق سے یہ وہی دن تھا جس دن اکیس سال پہلے آصف کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی۔آصف اگر اپنی دولت کے انبار لے کر نہ آتے تو آج ہم دونوں ایک دوسرے کے ہوتے اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہوتے۔

کاشف اور میری شادی کو آج چار سال ہو گئے۔کاشف کے ساتھ خوبصورت زندگی گزارنے کے لیے ہمیں اپنے بچے بھی چاہیے تھے۔اس لیے ہمارے پاس ہمارے بھی دو بچے ہیں، دونوں میں ایک ایک سال کا فرق ہے۔ایک خوبصورت سی لڑکی اور ایک پیارا سا لڑکا۔شائزہ اور شان کی بھی شادی ہو چکی ہے۔اور ہم نانی اور دادا بھی بن چکے ہیں۔ہم دس بچوں کی نگہداشت کر رہے ہیں اس لیے ہمارے پاس زیادہ دولت تو نہیں ہے مگر پھر بھی زندگی خوشحال اور خوشیوں سے بھری ہے۔ ہمارے بچے اپنی شادی کی سالگرہ ہم دونوں کو اکیلے ہی منانے دیتے ہیں۔اس میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔مگر ہم دونوں کی سالگرہ بہت دھوم سے منائی جاتی ہے کیونکہ ہم لوگ ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔یہ بات ہمارے بچوں کو بہت پسند ہے۔

سوچتے سوچتے اچانک میری نظریں آصف کی نظروں سے جا ٹکرائیں۔ان کی آنکھوں میں اب تک میرے لیے رحم تھا۔شاید میرے معمولی کپڑے اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ان کو پسند نہیں آئی تھیں۔آصف ہمیشہ سے اور چیزوں کے ساتھ میرے زیور اور کپڑوں پر ضرورت سے زیادہ دھیان دیتے تھے۔یہ رحم مجھے برداشت نہ ہو سکا۔ ہمارے پاس دس بچوں کی ذمہ داری تھی۔ ظاہر ہے، میری زندگی عیش وعشرت سے بھری تو نہیں ہو سکتی تھی۔آصف کے دیے ہوئے زیور تو ان

کی لڑکیوں کی شادی میں دیے جا رہے تھے۔ آدھے شائزہ کو دیے جا چکے تھے، آدھے منیبہ کے لیے رکھے تھے۔ مجھے تو اپنی زندگی کاشف کی حیثیت میں رہ کر گزارنی تھی۔ پھر اچانک میرے دل میں سوالات اٹھنے لگے۔ آج کے دن آصف میرے شہر میں کیوں آئے ہیں؟ خاص کر اس ریسٹوراں میں کیا کر رہے ہیں؟ آصف جانتے تھے، یہ میرا پسندیدہ ریسٹوراں ہے اور ہم اپنی شادی کی کئی سالگرائیں یہاں پر منا چکے ہیں۔ ان کے اپنے حساب سے آج ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ تھی۔ شاید وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں اب تک ان کی یادوں کو گلے سے لگائے بیٹھی ہوں اور آج کا دن اس ریستوران میں بیٹھ کر منا رہی ہوں۔ ان کو ہماری نئی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ وہ کیا جانیں کہ آج کا دن ان کا نہیں رہا ہے، کاشف کا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں یہاں پر اپنی شادی کی سالگرہ منا رہے ہیں، خاموشی کے ساتھ بغیر کسی ہنگامے کے۔ وہ شاید یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں شاید پھر سے اپنے بچوں کو لے کر ان کی عیش و آرام کی دنیا میں واپس آ جاؤں گی۔ ان کی دی ہوئی بہت تکلیفیں بہت سزائیں اٹھا لیں۔ میری کانچ کی چوڑیوں اور معمولی کپڑوں سے حقارت ایک طرح کا پیغام لگ رہا تھا ان کی زندگی میں واپسی کا، یہ میں نے محسوس کیا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ لیکن شاید ان کو پتا نہیں ہے کہ کاشف نے مجھ کو اور میرے بچوں کو اپنی دنیا میں اتنا جکڑ لیا ہے کہ آصف تک واپسی کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ کاشف جو بہت زیادہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے، اس کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ مضبوط ترین ول پاور جو کسی کسی کو ملتی ہے، ایسے لوگ صرف آئیڈیل فیملی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور دوسری ٹوٹی ہوئی فیملی کے لیے ایک مثال بن جاتے ہیں، مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ جس نے اپنے اور اپنے بھائی کے بچوں کے لیے اپنی جوانی قربان کر دی اور شادی نہیں کی کہ کہیں کوئی غلط عورت آ کر ان کے بچوں کا مستقبل برباد نہ کر دے۔ وہ ایک سنگل پیرینٹ تھے کیا زندگی میں ان کو عورتیں ملی نہیں یا عورتیں خود ان کی طرف نہیں بڑھی ہوں گی، کیسے مان لیں۔ ان کا حق تھا کہ وہ دوسری شادی کرتے اپنی زندہ بیوی پر عورت تو نہیں لا رہے تھے۔ مگر ان کی مضبوط قوتِ ارادی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں عورت کی اہمیت نہیں تھی، اہمیت تھی تو ویلیوز کی تھی، خاندان کی حفاظت کی تھی۔ بچوں کے مستقبل کی تھی۔ اُس کا اعتماد، اُس کا یقین، اُس کا ٹرسٹ صرف میں تھی، تب ہی تو اُس نے مجھ سے شادی کر کے اپنے بچوں کا مستقبل میرے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ سب کی زندگی کو قاعدے کے ساتھ سیٹ کر دی تا کہ مجھ کو کوئی پچھتاوا

نہ ہو۔ میں ایسے عظیم انسان کے ساتھ دغا کروں گی۔ آصف نے یہ کیسے سوچ لیا۔ وہ خود ایک غلط عورت کے ہاتھوں پہلے ہی میری زندگی میں میرا اور بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا بیٹھے ہیں۔ اگر کاشف کا مضبوط سہارا نہ ملتا تو اب تک میں ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔ تنہائی اور ٹھکرائے جانے کی بے عزتی مجھ کو ختم کر چکی ہوتی۔ میں آصف نہیں ہوں جو اپنی خودغرضی اور کمزور ول پاور کے پیچھے اپنے خاندان کا اعتماد توڑ دوں۔ آصف میرے لیے ایک ہسٹری تھا۔ ہسٹری دہرائی نہیں جاتی، صرف سنی جاتی ہے یا پڑھی جاتی ہے۔ میری موجودہ زندگی خوشیوں سے بھری ہے، اس میں دولت کے انبار نہ سہی، ایک تعلیم یافتہ آدمی کا اعتماد اور احساسِ ذمہ داری تو ہے۔ آصف ایک غلط آدمی ہے، ایک بگڑے اور بدلے ہوئے انسان ہیں، ان کی دولت سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، مگر پھر بھی زندگی کے وہ خوبصورت بیس سال جو میں ان کی زندگی میں لائی تھی وہ کوئی نہیں لاسکتا۔ وہ خوشگوار لمحے اب واپس نہیں آسکتے۔ ان کی دولت سے کوئی بھی انجوائے کرسکتا ہے، صرف انجوائے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مگر پھر بھی ان کو میں اور میری فیملی جس کو وہ چھوڑ چکے ہیں کبھی بھی چین نہیں لینے دے گی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ یہ بے چینی اور بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ مجھے معلوم ہے۔

''کہاں کھوئی ہو؟'' کاشف کی آواز مجھے ماضی سے حال میں واپس لے آئی۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ اچانک کاشف چونک پڑا اور بولا۔ ''ارے آنٹی یہاں کہاں؟''

''آنٹی؟'' میں نے کہا۔ ''کون آنٹی؟''

''وہ۔'' اس نے نشماں کی طرف اشارہ کیا۔ نشماں نے شاید اس کو نہیں دیکھا تھا۔

''وہ تمہاری آنٹی ہیں؟ کیوں مذاق کر رہے ہو؟'' مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ پھٹ پڑا۔

اس نے کہا۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟ وہ میری آنٹی ہے۔ سگی آنٹی۔ میری ممی کی سگی بہن ہیں۔''

''مگر وہ تو تم سے بہت چھوٹی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چھوٹی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''عمر میں وہ مجھ سے دس سال بڑی ہیں اور دیکھنے میں دس سال چھوٹی لگتی ہیں۔ اس لیے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ مگر میں انہیں آنٹی کہتا ہوں۔ سگی آنٹی اگر اپنے سے بڑی ہو تو کوئی نام نہیں لیتا۔ اب میں ہرا یرے غیرے کو تو آنٹی نہیں پکار سکتا۔ پتا نہیں کون کتنا جوان ہو یا اپنے کو جوان سمجھتا ہو۔ میں کیوں آنٹی کا ڈھیلا مار کر ان کی جوانی کے خوابوں کو

چکنا چور کروں۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔'' وہ کئی شادیاں اپنی خوبصورتی اور جوان لگنے کی وجہ سے کر چکی ہیں۔مگر آج تک کوئی شادی بھی کامیاب نہیں ہوئی، طلاق فوراً ہو جاتی ہے۔''

''یا یوں کہو وہ کئی گھر آنٹی کے ڈھیلے مار مار کر توڑ چکی ہیں۔'' میں نے سوچا۔

اچانک اس نے کہا۔'' چلو میں تم کو آنٹی سے ملوا دوں۔'' میں انکار کرتی رہ گئی مگر وہ گھسیٹتے ہوئے مجھے لے گیا۔نشماں اچانک ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ '' آنٹی! ان سے ملیے یہ منیشا ہیں۔آپ کی بہو۔ہم دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔'' آصف شاید نہیں سن پائے۔ وہ اب تک میرے معمولی کپڑوں اور ہاتھوں کی کانچ کی چوڑیوں کو حقارت اور رحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں ان سے مخاطب ہوئی۔'' آصف اب آپ کو میرے لیے فکرمند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا آپ سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔اب میری اپنی زندگی ہے ۔ میں چاہے جیسے گزاروں۔ یہ کانچ کی چوڑیاں حقیر نہیں ہیں، یہ میرا فخر ہیں۔ میرے عظیم سہاگ کی نشانی ہیں۔اللہ میرے سہاگ کو لمبی عمر دے اور میں جب تک زندہ رہوں یہ کانچ کی چوڑیاں میرے ہاتھوں کی زینت بنی رہیں۔لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔ان کو اب تک سونے کی بیس بیس چوڑیاں نہیں پہنائیں۔ ورنہ اب تک آپ کے گھر میں چار چار بیویاں اتر پڑتیں۔اب آپ کے بچوں کی بھی اپنی زندگی ہے۔آپ کو تو شاید پوتے اور نواسے کھلانے کا بھی موقع نہ ملے، وہ حسین موقع آپ نے کھو دیا۔ہم نے اور کاشف نے ان کو اپنی زندگی میں ایسا جکڑ لیا ہے کہ آپ کے بچے بھی آپ کے نہیں رہے۔ وہ ہم دونوں کے ہو گئے ہیں۔ وہ اب آپ کی زندگی میں واپس نہیں آئیں گے۔اُن کے بچے ہمارے اور کاشف کے پوتے پوتی اور نواسے نواسی ہوں گے۔آپ اپنی خواہش کے مطابق دوسری، تیسری اور چوتھی بیویاں لائیے تاکہ دو چار پھول آپ کے آنگن میں بھی کھل جائیں۔'' پھر میں نے نشماں سے کہا۔'' پانچ سال پہلے زبردستی آپ نے مجھ کو آنٹی پکار کر اپنا گھر بسا لیا تھا۔لیکن آپ اب میرے شوہر کی سگی آنٹی ہیں اور مجھ سے عمر میں دس سال بڑی ہیں۔اس لیے میں آپ کا نام کیسے لے سکتی ہوں۔'' تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر میں اور کاشف ایک ساتھ بولے۔'' اچھا آصف صاحب اور آنٹی اجازت دیجیے۔اب ہم چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہاں سے چلے آئے۔ان دونوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر ان کی نظریں ضرور ہمارا تعاقب کر رہی ہوں گی۔ یہ میرا یقین ہے۔

◆ ÷ ◆

محافظ

وہ صبح کتنی حسین اور دلکش تھی۔

رات بھر مارے خوشی کے جاگنے کے باوجود صبح کا نور اس کے لیے خوبصورت تھا اور آنے والے وقت کے لیے نویدِ مسرت تھا۔اس کا برسوں کا خواب جو سچ ہونے والا تھا۔نشالہ کے ہاتھوں میں وہ پیکیج تھا جو اس کی زندگی کی سچائی بن کر نمودار ہوا تھا۔پوری دنیا کی سیر کا خواب اب خواب نہیں حقیقت بننے جا رہا تھا۔جیتی جاگتی زندگی سے بھرپور حقیقت، جس نے اس کو رات بھر سونے نہیں دیا۔اچانک فون کی گھنٹی نے اس کو چونکا دیا۔دوسری طرف اس کے ڈیڈی سیٹھ اعظم تھے۔صبح صبح ان کے فون سے وہ گھبرا گئی۔سیٹھ اعظم کہہ رہے تھے۔''نشالہ ابھی تک تم گھر نہیں آئیں۔اب تو تمہاری پڑھائی ختم ہو چکی ہے۔جلد از جلد گھر پہنچو۔ہم سب کو تمہارا انتظار ہے۔میں نے تمہارے لیے بہت اچھا لڑکا ڈھونڈھ لیا ہے۔جلد ہی وہ لوگ آنے والے ہیں تا کہ تم لڑکے کو دیکھ لو اور ایک دوسرے سے مل لو۔''

''مگر ڈیڈی میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔''

''کیا کہا شادی نہیں کرو گی؟'' سیٹھ اعظم چیخ اٹھے۔''اتنا امیر ترین خاندان ملا ہے جو صرف قسمت والوں کو ملتا ہے۔تم ہاتھ آئی دولت کو ٹھکرا رہی ہو۔''

''دولت! پھر وہی دولت کی بات۔ڈیڈی میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے دولت کی ضرورت نہیں ہے۔میں تو دنیا کے سفر پر نکل رہی ہوں۔میرا پیکیج آ گیا ہے۔''

''کیا کہا دولت کی ضرورت نہیں ہے۔پھر یہ دنیا کی سیر کا پروگرام کس چیز کے سہارے بنا ہے۔بغیر دولت کے۔کیا پیدل جا رہی ہو؟''

''ڈیڈی! آپ اور ماما کی دن رات کی محنت سے بڑھائی ہوئی دولت میں سے صرف تھوڑا سا حصہ زندگی میں پہلی بار لے رہی ہوں تا کہ اپنا یہ پہلا اور آخری شوق پورا کر سکوں۔''

''تمھیں کہیں نہیں جانا ہے۔ابھی سیدھے گھر آنا ہے۔بعد میں تم اپنا یہ شوق بہت

آسانی سے پورا کرسکتی ہو بغیر ہم لوگوں کو ستائے ہوئے۔'' سیٹھ اعظم بہت غصے سے بولے۔

''ڈیڈی اب تو آپ نے عام ڈیڈیوں والی بات شروع کر دی ہے۔ جو آپ پر زیب نہیں دیتی ہے اور آپ کو یہ بھی پتا ہے کہ میں اس کی عادی نہیں ہوں۔ آپ کا حکم ماننے سے میں انکار کرتی ہوں میں وہی کروں گی جو میں طے کر چکی ہوں۔ میں بہت جلد سفر کے لیے نکلنے والی ہوں۔ ایک بات اور ڈیڈی! مجھے دولت مند نہیں معمولی لوگ پسند ہیں۔ اس سفر کے دوران میں خود اپنے لیے لڑکا ڈھونڈھ لوں گی جو بھی پسند آئے گا۔ اس کو آپ کے سامنے لاکر کھڑا کر دوں گی چاہے وہ جو ہو، جس ملک کا ہو۔''

''چاہے وہ کوئی فقیر ہی کیوں نہ ہو۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہے کہ فقیروں کے ساتھ ہم کیسا سلوک کرتے ہیں۔ یہ امیر خاندان ہی اب ہمارے خاندان کا حصہ بنے گا۔ ہم سے دس گنا امیر یہ ہی میری پسند ہے۔''

''کبھی آپ نے میری پرورش میں اتنی ذمہ داری دکھائی ہوتی اور اپنے طریقے سے مجھے پالا ہوتا تو میری ذہنیت بھی آپ جیسی ہوتی۔ مگر ڈیڈی میں تو عرصہ ہوا آپ کے ہاتھوں سے نکل چکی ہوں جو بننا تھا وہ بن چکی ہوں۔ اب آپ کا یہ رعب اور دبدبہ میرے اوپر نہیں چلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ وہ غصے سے پاگل دکھائی دینے لگی۔ ڈیڈی نے اس کے اتنے خوبصورت موڈ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ سفر کی شروعات ایسی ہے تو خاتمہ کیسا ہوگا؟ اس نے سوچا۔

سیٹھ اعظم بھی نشالہ کی بات سن کر غصے سے بھر گئے اگر اس وقت وہ ان کے سامنے ہوتی تو شاید گولی مار دیتے۔ اس سے دس گنا امیر آدمی کا بیٹا وہ ٹھکرا رہی تھی صرف اس لیے کہ وہ بہت امیر تھا۔ نشالہ سے بات کرنے سے پہلے وہ کتنے خوش تھے۔ سیٹھ عاطف نے خود ہی ان کو اپنے بیٹے کا رشتہ دیا تھا۔ جس کے لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کسی محفل میں انہوں نے نشالہ کو دیکھا تھا وہ ان کو بہت پسند آئی تھی۔ اب ان کا لڑکا اس سے ملنا چاہتا تھا۔ سیٹھ اعظم خود بھی بہت امیر تھے۔ شادی بھی انہوں نے اپنے سے دس گنا امیر گھر میں کی تھی۔ تب ہی تو ان کے پاس دولت رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اور وہی نصیب ان کی بیٹی کا بن گیا تھا۔ ان سے دس گنا امیر سیٹھ عاطف ان کی بیٹی میں دلچسپی دکھا رہے تھے اور نشالہ اسے ٹھکرا رہی تھی۔ اپنی پسند سے شادی کرے گی۔ اگر کوئی فقیر اٹھا لائی تو کیا ہوگا؟ اپنی دولت کی بدولت وہ ایسا کرسکتی تھی۔ وہ پاگل ہو گئے۔ کیا کریں؟ سوچ نہیں

پار ہے تھے۔نشالہ کی فطرت تھی وہ ہمیشہ دولت سے نفرت دکھاتی تھی۔ کیونکہ دولت میں آنکھ کھولی تھی۔زندگی میں مفلسی، مایوسی اور درد وغم کبھی دیکھے نہیں تھے اور نہ خود کبھی ایک پیسہ کمایا تھا اس لیے دولت کی ناقدری کرنے لگی تھی۔ پریشان سیٹھ اعظم نے اپنے خیر خواہوں میں یہ اعلان کر دیا کہ فوراً ایک ایسا آدمی ڈھونڈھ کر لاؤ جو نشالہ کے ساتھ سفر کرے۔خفیہ طور سے اس پر نظر رکھے۔تا کہ کوئی غلط آدمی اس کی زندگی میں نہ آنے پائے اگر ایسا ہو تو فوراً انہیں اطلاع دے۔انہوں نے اپنے نمک خواروں کو فوراً اس مہم پر روانہ کر دیا۔دوسرے ہی دن ایک نوجوان ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وقت بہت کم تھا انہوں نے فوراً پوری بات بتا کر کہا۔''تمہارے سفر کا سامان تیار ہے فوراً ایئر پورٹ پہونچ جاؤ۔''ان کو نوجوان کا خوبصورت اور جوان ہونا بہت برا لگ رہا تھا مگر کیا کرتے وقت بہت کم تھا کسی دوسرے آدمی کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔نشالہ نے اتنی بڑی مشکل جو کھڑی کر دی تھی۔سفر پر جا رہی تھی ٹھیک تھا مگر اپنی پسند کا آدمی کیوں لا رہی تھی؟ جب کہ اعلیٰ ترین آدمی وہ خود ڈھونڈھ چکے تھے جو کہ ہر طرح سے ان کی پسند کی کسوٹی پر پورا اتر رہا تھا۔

اظفر سیٹھ اعظم کے ذریعے ملی اپنی نئی نوکری سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔کام بھی بہت خوبصورت تھا۔ایک انجان حسین لڑکی پر نظر رکھنا تھا جس کی وجہ سے دنیا کی سیر اور ٹھاٹ باٹ مفت کے تھے۔ظاہری بات تھی سیٹھ اعظم کی اکلوتی بیٹی کسی معمولی جگہ پر تو ٹھہرنے سے رہی۔سیٹھ اعظم نے اس کی تصویر اس کو دے دی تھی۔اس کو پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی۔جب وہ ایئر پورٹ میں داخل ہوا وہ اپنے سامان کے ساتھ سامنے ہی کھڑی دکھائی دی۔وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اس کو تلاش کرنے کی زحمت سے جو بچ گیا تھا۔وہ بہت تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے ٹکرا گیا۔ٹکّر بہت زوردار تھی وہ گرتے گرتے بچی مگر وہ بغیر مڑے آگے بڑھ گیا۔نشالہ کو اس آدمی پر شدید غصہ آیا جو اس کو زور کی ٹکّر مارتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا بغیر معافی مانگے۔شاید وہ بہت جلدی میں تھا اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ ٹکّر کھانے والے کا کیا حشر ہوا؟

وہ ایک دو بار جہاز میں بھی نظر آیا مگر صرف وہ ہی اس کو دیکھتی رہی اس نے نہیں دیکھا اور بھلا دیکھتا بھی کیوں؟ وہ اس کو جانتا ہی کب تھا۔ جہاز اٹلی جا رہا تھا۔اس کے سفر کا پہلا ملک اٹلی تھا۔وہ بہت خوش تھی سب سے بڑی خوشی اس کو اس بات کی تھی کہ ڈیڈی کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکے تھے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جہاز پر سوتی جاگتی وہ روم اتر گئی۔ بہت ہی دلکش شہر تھا

اس کے تصور سے بھی زیادہ حسین یورپ کا یہ شہرا کثر اس نے فلموں میں اور ٹی وی پر دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو وہ اس کو لابی میں کھڑا دکھائی دیا۔ ڈائننگ ہال میں بھی وہ موجود تھا۔ مگر وہ اس سے لاتعلق تھا۔ وہاں کافی دیسی لڑکے لڑکیاں بھی تھے اس لیے وہ اس کی نگاہ کا مرکز نہیں بن پائی تھی۔ اس کی زبردست ٹکّر نے شاید نشالہ کا تعلق زبردستی اس سے جوڑ دیا تھا ورنہ وہ تو شاید بھول چکا تھا اس واقعے کو ویسے بھی اس نے اس کو دیکھا کب تھا۔ ٹورسٹ بس میں وہ بیٹھ چکی تھی وہ بھی اس بس میں تھا۔ ڈرائیور شہر کی ہسٹری بتا تا چل رہا تھا۔ مشہور مقامات پر ذرا دیر کے لیے بس رکتی تھی وہ لوگ اترتے تھے پھر واپس بس میں آ کر آگے چل دیتے تھے۔ ہر جگہ وہ ساتھ ساتھ تھا۔ چیزیں بھی خریدرہا تھا۔ روم کے بعد وہ بس سے ہی وینس کی طرف روانہ ہوگئے۔ پانی کا شہر اس کی پسند کے شہروں میں سرفہرست تھا۔ ہر طرف کشتیاں ہی کشتیاں چل رہی تھیں۔ ٹورسٹ اور مقامی لوگ سب ہی کشتیوں پر چل رہے تھے۔

اظفر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایسا ظاہر کرتا جیسے اس کو جانتا ہی نہیں تھا اور نہ اس سے کوئی تعلق ہے۔ اس نے سنا کہ وہ صبح سات بجے کی بوٹ پر وینس کی سیر کے لیے نکلے گی۔ وہ صبح ہی صبح بھاگا ہوا آیا تھا وہ بہت دور ایک بوٹ پر جاتی دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے دوسری بوٹ لی اور اس کے پیچھے چلا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اٹالین بول لیتی تھی بالکل اہلِ زبان کی طرح۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر ملک کی زبان بولنا جانتی ہوگی تب ہی تو اس کا دنیا کی سیر کا خواب صحیح معنوں میں پورا اتر رہا تھا۔ شاید اسکول میں وہ مختلف زبانیں ہی سیکھ رہی تھی کہ جب ایک دن وہ دنیا کی سیر کو نکلے تو وہ فراٹے سے اس ملک کی زبان بھی بولے۔ دنیا کا سفر تو سب ہی کرتے ہیں مگر اتنی محنت کون کرتا ہے کہ مختلف زبانیں سیکھے۔ شاید وہ صحیح معنوں میں اپنے سفر کو انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ پہلی بار جب اس نے نشالہ کو اٹیلین میں بات کرتے سنا تو حیران رہ گیا تھا۔ بہت کم لوگ وہاں پر دوسری زبان بول اور سمجھ پا رہے تھے۔ وہ بوٹ میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے بات چیت کر رہی تھی۔ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ ایک اسپاٹ پر وہ اتر گئی۔ کچھ اٹیلین لڑکے اور لڑکیوں کا گروپ بھی اس نے جوائن کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جا رہی تھی پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ وہیں پر کھڑا ہاتھ ملتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر وہ وہاں پر کھڑا رہا جیسے ہی وہ وہاں سے ہٹنے لگا وہ اپنے گروپ کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ سنہرے کندھوں تک کٹے بالوں اور نیلی آنکھوں کے ساتھ وہ ان ہی کے ملک کی باشندہ

لگ رہی تھی۔ وہ بھی جلدی سے اس کی بوٹ میں سوار ہو گیا پانی کا یہ شہر اس کو پانی پانی نہ کر سکا۔ راستے بھر اس کا گروپ باتیں کرتا رہا مگر اب وہ خاموش تھی۔ اس نے کئی بار اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کو اگنور کرتا دوسری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی خاموشی کی پتا نہیں کیا وجہ تھی شاید اس کو اپنی بوٹ میں اظفر کا بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اٹلی گھومنے میں کافی دن لگ گئے۔

بس کے ذریعے وہ دونوں اسپین روانہ ہو گئے۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا اب وہ فراٹے کے ساتھ اسپینش بول رہی تھی۔ ہر جگہ وہ بہت جلدی دوست بنا لیتی تھی شاید زبان بولنے کی وجہ سے۔ اکیلی سفر کو نکلی تھی مگر ہر جگہ اس کا ایک نیا گروپ بن جاتا تھا۔ انہیں کی طرح وہ تیار بھی ہوتی تھی۔ لگتا تھا جیسے اپنے ہی کسی کالج کے گروپ کے ساتھ اپنی ٹرپ کو انجوائے کر رہی ہو۔ اسپینش جاننے کی وجہ سے وہ ہر طرح سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ کہیں کسی بھی ملک سے وہ واقعی میں کوئی بھی آدمی اُٹھا بھی سکتی تھی۔ اجنبیوں کے ساتھ اس کی بے تکلفی سیٹھ اعظم کی بات کی تصدیق کر رہی تھی۔ وہ چپکے سے اسی بس میں بیٹھا اس کی ایک ایک بات پر نظر رکھ رہا تھا۔ وہ اس کو نہیں دیکھ پائی۔ اسپین کی دارالسلطنت میڈرڈ ان کو بہت پسند آئی۔ وہ وہاں پر کئی دن ٹھہر گئے۔ پھر بس کے ذریعے گریناڈا روانہ ہو گئے۔ الحمرا شہر ان کو بہت پسند آیا۔ وہ دونوں الحمرا کی اس مشہور عمارت کو دیکھ کر حیران رہ گئے جس کو دیکھنے کی ان کو بہت خواہش تھی۔ دونوں نے ہر زاویے سے دنیا کی اس مشہور بلڈنگ کا معائنہ کیا۔ اعلیٰ ترین باریک لال پلاستر اس کی دیواروں پر تھا۔ وہ مورش آرکیٹیکچر کی بہترین مثال تھی۔ دونوں ہی اس سے متاثر ہوئے۔ کبھی وہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوا کرتی تھی۔ مان اور دوسرے خوبصورت شہروں سے گزرتے ہوئے وہ افریقہ میں داخل ہو گئے۔ مراکش اپنی لاجواب خوبصورتی کے ساتھ ان کا ویلکم کر رہا تھا۔ افریقی، یوروپین اور مسلم کلچر کو لے کر چلتا ہوا یہ ملک اپنا جواب آپ تھا۔ یہاں پر اظفر نے غور کیا کہ نشالہ کو ہر زبان بولنے کا موقع مل رہا تھا۔ کبھی وہ اسپینش بولتی، کبھی عربی میں بات کرتی اور کبھی فرنچ بولنے کی ضرورت بھی پڑ رہی تھی۔ وہ بہت متاثر تھا۔ مراکو کی عورتوں کے ساتھ چلتے چلتے اب اس کے سر پر حجاب بھی نظر آ رہا تھا۔ فراٹے سے عربی بولتی وہ مراکو کی کوئی مسلم خاتون نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے وہ اس کو بھی دیکھ لیتی تھی مگر وہ اب تک اس کو اگنور کر رہا تھا۔ گفتگو کا آغاز ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان ابھی تک اجنبیت کی دیوار کھڑی تھی۔

نشالہ کے لیے اس کی ٹکّر اب تک نہ بھولنے والی بات بن گئی تھی، اس لیے وہ اس کو یاد تھا۔ مگر ہر جگہ، ہر ملک اور ہر موقعہ پر اس کا دکھائی دینا اس کے لیے تشویش کی بات بن گئی تھی۔ وہ کبھی کبھی بہت بے چین ہو جاتی تھی۔ وہ اجنبی آدمی ہر جگہ کیوں موجود رہتا تھا؟ چاہے ہوٹل ہو، ریسٹورینٹ ہو، ٹورسٹ بس ہو، بوٹ ہو، شاپنگ مال ہو ہر جگہ وہ اس کو دکھائی دیتا تھا۔ چلو کسی ایک ملک میں اس کا دکھائی دینا اتفاق ہو سکتا تھا مگر ملکوں ملکوں کے سفر میں مستقل ایک آدمی ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا یہ تشویش کی بات تھی۔ ہندوستان سے وہ ساتھ چلا آ رہا تھا آخر کیوں؟ ہر جگہ نظر آتا تھا مگر ایسا ظاہر کرتا تھا جیسے اس کو دیکھا ہی نہیں ہو۔ یہ اس کے لیے کتنی فکر و پریشانی کی بات بن گئی تھی۔ اس نے پہلی بار زبردست ٹکّر اس کو اسی لیے ماری تھی کہ وہ اس کو یاد رکھے اور اس کے لیے سوچے۔ کیا وہ اس پر نظر رکھ رہا تھا؟ اس کے دل نے سوال کیا؟ لیکن اگر واقعی میں وہ اس کی جاسوسی کر رہا تھا تو اتنی زبردست ٹکّر مار کر اپنی موجودگی کا احساس کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسے کام تو چھپ کر کیے جاتے ہیں۔ اس کو پھر بھی یقین تھا کہ اس کے ڈیڈی نے ضرور اس آدمی کو اس کے پیچھے لگایا ہے تاکہ وہ اس پر نظر رکھ سکے۔

وہ اس کو چکمہ دینے کی کوشش کرتی مگر ہر بار ناکامیاب ہو جاتی وہ آموجود ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف ہر ملک کی زبان اہل زبان کی طرح بول رہی تھی ساتھ میں اپنا حلیہ بھی بدل لیتی تھی۔ آنکھوں میں وہ کبھی نیلا کانٹیکٹ لینس لگاتی، کبھی گرے، کبھی بے بی بلیو، کبھی براؤن، کبھی بلیک، کبھی ہلکا پیلا پن لیے ہوئے، کبھی شربتی، کبھی ہلکا گرین پن لیے گرے وغیرہ۔

وہ سمجھ نہیں پاتا کہ اس کے بالوں اور آنکھوں کا اصلی رنگ کون سا ہے۔ آنکھوں کے رنگ کی طرح بالوں کا رنگ بھی بدل دیتی۔ اس کے بال کبھی ڈارک براؤن ہوتے، کبھی لائٹ براؤن، کبھی دونوں کلر کے ایک دوسرے کے شیڈ کے ساتھ، کبھی سنہرے، کبھی بلیک، کبھی لال مہندی کے رنگ کے۔ وہ اپنا ہیئر اسٹائل بدلنے میں بھی ماہر تھی۔ اس کے بال کبھی بالکل چھوٹے ہوتے، کبھی وہ پونی ٹیل میں ہوتی، کبھی طرح طرح کے جوڑے بناتی، کبھی کندھے تک کٹے بال ہوتے، کبھی سیدھے بال ہوتے، کبھی پرم ہوتا، کبھی ایک چوٹی بناتی، کبھی بال دو چوٹیوں میں بندھے دکھائی دیتے۔

وہ اس کی ہر تبدیلی پر سوچتا کہ لڑکی ہے یا عجوبہ، ہر بار ایک نئی لڑکی نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی

تو اس کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔شاید وہ یہی چاہتی تھی اس کو اس پر شک ہو گیا تھا بار بار ہر جگہ اس کا دکھائی دینا اس کے لیے بہت پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔وہ کہیں اپنا حلیہ اس سے بچنے کے لیے تو نہیں بدل رہی تھی؟ یا وہ اس کا صرف اسٹائل تھا؟ کبھی ایک سا نہ دکھنا اپنے کو ہر وقت بدل لینا۔ ایک لڑکی میں اس کو پچاس لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔اگر اس کو چھانٹنا ہوتا تو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ کس لڑکی کا انتخاب کرے۔ ہر ایک الگ، ہر ایک لاجواب۔اتنی انوکھی، اتنی عجیب لڑکی اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ہر انداز، ہر ادا دلکش دنیا کی ہر لڑکی سے الگ۔ پتا نہیں کیسے اس نے اپنی اس عظیم شخصیت کو پروان چڑھایا تھا۔ کیسے وہ دنیا سے اتنی منفرد اتنی الگ تھلگ ہو گئی تھی۔ دنیا کی ہر لڑکی اس کے سامنے پھیکی اور بے جان نظر آ رہی تھی۔وہ دنیا گھوم رہا تھا اور موازنہ بھی کرتا جا رہا تھا اس کی انفرادیت اس کے انوکھے انداز کا اور مزہ بھی لے رہا تھا۔اس کا اپنا ذوق جیسے روشن ہو گیا تھا اُس پر اُس کے انوکھے پن کی وجہ سے۔ دنیا کی ہر لڑکی اس کے مقابلے میں ناکامیاب دکھائی دے رہی تھی بالکل فیل۔اگلے دن پلین سے وہ فرانس پہونچ گئے۔ پیرس دیکھ کر وہ دیوانی ہو گئی۔رنگ و نور میں نہایا وہ شہر تو اپنی دلکشی کی شہرت سے بھی زیادہ خوبیاں رکھتا تھا۔روشنیوں میں ڈوبی راتیں ایسا لگتا تھا کہ جیسے زمین پر کہکشاں اُتر آئی ہو۔نشالہ کا دل چاہ رہا تھا کہ کبھی بھی وہ واپس نہ جائے۔بس یہ شہر ہو اور وہ ہو۔

نشالہ اور اظفر ایک ساتھ کھڑے ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے اچانک ٹیکسی آ گئی۔نشالہ نے بیٹھنا چاہا اظفر بھی آگے بڑھا اور بولا۔''یہ ٹیکسی میں نے منگوائی ہے۔''

نشالہ نے کہا۔''اتفاق سے میں نے بھی ٹیکسی کو بلایا تھا۔فیصلہ یہ کرنا تھا کہ یہ ٹیکسی کس کی ہے؟''

ڈرائیور جانتا تھا مگر وہ خاموش رہا اور اس دلچسپ سچویشن سے لطف اندوز ہونے لگا کیونکہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی شاید وہ انگریزی جانتا تھا۔اچانک نشالہ غصے میں بولی۔''آپ کب تک میرا پیچھا کریں گے؟''

''آپ کا پیچھا؟'' وہ حیرت سے بولا۔''میں تو آپ کو جانتا تک نہیں ہوں۔''

وہ بدستور غصے سے بولتی گئی۔''مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ہندوستان سے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرتی ہوں آپ بھی وہیں ٹھہرتے ہیں۔ جب میں باہر آتی

ہوں تو آپ بھی آتے ہیں۔ اٹلی، اسپین، مرا کو سب ہی جگہ آپ میرے ساتھ رہے۔ جہاں بھی میں جاتی ہوں وہاں آپ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس تعاقب کا مطلب کیا ہے؟ کیا میرے باپ نے آپ کو میری جاسوسی پر معمور کیا ہے؟''

''آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے ورلڈ ٹور کا ایک جیسا پیکیج ہم نے خریدا ہو۔ کیونکہ ہم لوگ ایک ہی ملک سے ہیں اس لیے آپ نے مجھ پر ضرورت سے زیادہ دھیان دے دیا۔ میں نے غور نہیں کیا۔ اب آپ کی وجہ سے غور کرنا پڑا۔ ہم لوگ اگر ایک دوسرے پر الزام لگانے کی بجائے دوستانہ طور پر ملیں تو یہ بہتر رہے گا۔''

نشالہ چپ ہوگئی۔ اس نے سوچا اس کا شک شک ہی رہا۔ چلو ٹھیک ہے۔ آدمی شریف لگ رہا ہے اس کے ساتھ ہی گھومیں گھامیں۔ اکیلے پن سے اب طبیعت اوب گئی ہے۔ کم از کم پردیس میں ایک سہارا تو ملا جو اپنے ملک کا ہے، ہم زبان ہے اور ہوسکتا ہے ہم خیال بھی ہو۔

اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر......؟''

اس نے جلدی سے کہا۔ ''اظفر۔'' پھر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ بہت خوش اخلاقی سے بولی۔ ''میں نشالہ ہوں۔''

پھر دونوں میں دوستی ہوگئی اس دوستی نے اظفر کی مشکل کو آسان کر دیا اب بہانے بنا کر اس کا پیچھا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ اب دونوں ساتھ ساتھ تھے اس کو شک تو ہو ہی گیا تھا وہ کسی وقت بھی غائب ہوسکتی تھی۔ اس کی یہی تو ڈیوٹی تھی کہ وہ کسی غلط آدمی سے متاثر نہ ہوسکے، شادی کے لیے کسی غلط آدمی کا انتخاب نہ کر سکے۔ وہ جیسے ہی کسی سے متاثر ہوتی یا کوئی اس کو متاثر کرتا وہ جلدی سے ٹوک دیتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خفا ہوتی پھر نارمل ہو جاتی۔ کبھی کہتی۔ ''دوستی کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ میرے گارجین بن جائیں اور مجھے اچھے برے کی تمیز سکھانے لگیں۔''

''دیکھیے جب ہم دونوں ساتھ ہیں تو آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ مجھے بھی غلط راستے کی طرف جاتے ہوئے روکیے۔ اگر آپ غلط راستے کی طرف جائیں گی تو یہ میرا فرض ہے میں آپ کو ہوشیار کروں اور روکوں۔ اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں ہے تو ہم ابھی الگ ہوئے جا رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ جانے لگتا۔ نشالہ گھبرا جاتی۔ وہ تو اب اس کا مقصد بن گیا تھا۔ اس کی ضرورت تھا۔ پردیس میں اس کی تنہائی کا ساتھی تھا۔ جگہ جگہ اس کی رہنمائی کی ضرورت پیش آتی

تھی۔اس کا گارجین کا رول کرنا اس کو پسند نہیں تھا مگر مجبوری تھی،اس کو الگ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پیرس کے ہوٹل میں دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ابھی کھانے کا آرڈر نہیں دیا تھا۔وہ دونوں صرف باتیں کررہے تھے،نشالہ کسی کام سے اٹھ کر چلی گئی۔اچانک ایک ہپّی نما آدمی آ کر نشالہ سے فرینچ میں بات کرنے لگا۔نشالہ بھی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی۔وہ آدمی بھی اس سے بات کرتا ہوا بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ایک دم سے اظفر دوڑتا ہوا گیا اور ان سے ٹکرا گیا وہ دونوں ہی زمین پر گر گئے۔پھر دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے اظفر ان سے معافی نہیں مانگ رہا تھا۔وہ ہپّی اُلٹے اس سے ہی گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔پھر وہ چلا گیا۔نشالہ نے اس کو گھور کر دیکھا۔اظفر بولا۔''ایسا میرے راستے میں آ گیا۔تمیز نہیں تھی۔بیچ میں کھڑا تھا آتا دیکھ کر بھی راستہ نہیں دیا۔میں نے بھی ٹکّر ماردی۔دیکھا کیسے معافی مانگ رہا تھا۔''

نشالہ نے پوچھا۔''کیا غلطی اس کی تھی؟''

اظفر بولا۔''اس کی ہی تو غلطی تھی تعجب ہے تمہیں دکھائی نہیں دی۔''

''غلطی اس کی ہو یا نہ ہو مگر ٹکّر مارنے میں آپ استاد ہیں۔اس کا تجربہ تو مجھے بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ غصے میں اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

شام کو وہ ایک مشہور ریسٹورینٹ میں بیٹھے تھے۔نشالہ ایک الگ انداز سے تیار ہوئی تھی۔سب کی نظریں اس پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ایک فرینچ آدمی نے آ کر اس سے ڈانس کی درخواست کی۔وہ بھی فرینچ بولتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دی۔وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔نشالہ اب ڈانس بھول کر اس کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔اچانک اس کا غلط اسٹیپ اس لڑکی کے پیر سے ٹکرایا اور وہ دونوں فرش پر دکھائی دیے۔اظفر نے گھور کر اس کو دیکھا تو وہ ڈانس کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔وہ لڑکی اس کو ڈھونڈھ رہی تھی اور وہ اس کو صرف دیکھ ہی رہا تھا کچھ کہہ نہیں سکا۔اس کی چال اس نے اس پر ہی آزمادی تھی۔

نشالہ کو اظفر کے ساتھ کتنا اچھا لگتا تھا،کتنی تفریح اور کتنا مزہ آ رہا تھا اس کی کمپنی میں،وہ بتا نہیں سکتی تھی۔وہ کتنی مزیدار باتیں کرتا تھا اور کتنا ہنساتا تھا۔جو اس کا دل چاہتا تھا اظفر خود بخود کر دیتا تھا۔اس کا ساتھ اب دلچسپ اتفاق نہ رہ کر اب اس کی بہت بڑی خوشی بن گیا تھا۔پیرس کی خوبصورتی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔اس نے خود بخود اپنی ساری ذمہ داری اس کو سونپ دی تھی۔اظفر

خوشی خوشی اس کو نباہ رہا تھا جیسے یہ اس کا فرض تھا اس کی ڈیوٹی تھی۔

فرانس، انگلینڈ، جرمنی، آئر لینڈ، آسٹریا غرض کہ پورا یورپ نشالہ نے اظفر کی وجہ سے خوب اچھی طرح دیکھا اور خوب خوب انجوائے کیا ورنہ اکیلے وہ صرف ان ملکوں، ان جگہوں کو دیکھ سکتی تھی مگر لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی۔ اظفر کی نالج ہر جگہ کے لیے خوب تھی۔ اگر وہ گائیڈ رکھتی تو اس کا کتنا پیسہ خرچ ہوتا مگر مزہ اتنا نہیں آتا وہ صرف مختلف زبانیں بول سکتی تھی، مگر دنیا گھومنے کے طریقوں اور نالج سے بے بہرہ تھی یہ خوبی اظفر کے پاس تھی۔ اس کے ساتھ وہ سوئٹزرلینڈ گئی۔ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑ اپنی خوبصورتی اور قدرت کے بخشے ہوئے لازوال حسن کے لیے مشہور ہیں۔ نیلے نیلے پہاڑ بڑا خوابناک سماں پیش کررہے تھے۔ وہاں کی زبانیں بولتی وہ اظفر کو کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کرتا رہا۔ ابھی ان میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھل کر اپنے دل کی بات اس سے کرتا۔ پورے یورپ کا سفر ختم ہوتے ہی وہ کناڈا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب وہ پلین میں بھی چہک رہی تھی۔ یورپ کو یاد کر رہی تھی اس کے ایک ایک ملک کو یاد کر کے بہت خوش ہو رہی تھی۔ پھر وہ کناڈا پہونچ گئے۔ کناڈا بھی اس کے خوابوں کے ملکوں میں سے ایک تھا۔ اظفر کی بدولت اس نے کناڈا کا ایک ایک شہر دیکھا یہاں تک کہ وہ کار سے الاسکا بھی چلی گئی۔ کیلگری اس کو بہت پسند آیا جیسے انڈیا نے اپنا حلیہ بدل لیا ہو۔ کیلگری کا سمر بہت خوبصورت تھا۔ اسٹیمپڈ میں بھی بل فائٹ دیکھی۔ بیلوں کی یہ لڑائی پوری دنیا میں بہت مشہور ہے۔ یہ نہ صرف کیلگری، بلکہ کناڈا کا بہت بڑا فنکشن ہے۔ پوری دنیا سے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ بینف میں جا کر نشالہ اور اظفر کو خوب مزہ آیا۔ وہ روپ سے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر گئے دور دور تک پورے شہر کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ پھر اس شہر کی مشہور نمائش دیکھی۔ پکنک اسپاٹ پر مقامی دیسیوں کے ساتھ پکنک منائی۔ دیسی ہوٹلوں میں دیسی مٹھائی اور کھانے کھائے۔ کار کے ذریعے مونٹانا دیکھنے نکل گئے۔ پھر واپس کیلگری آ گئے۔ کیونکہ کار کے ذریعے ان کو کیلگری سے وینکور جانا تھا۔ دوسرے دن ایڈمنٹن گئے۔ پھر کیلگری سے وینکور کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہاڑوں کے بیچ سے بنی سڑک سے ان کے سفر کا آغاز ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پہاڑ دونوں سائیڈ پر بہت دور ہیں۔ بیچ میں خوبصورت گھاٹیاں، ہرا بھرا ماحول اور پہاڑوں کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی۔ پہاڑ نیلے نیلے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ نیلے نیلے پہاڑ اپنی خوبصورتی میں لاجواب تھے۔ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کی یاد

تازہ کر رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں جیسے قوس قزح کو دائروں میں گرفتار کر رہی تھیں۔

بیچ میں ہی رات ہو گئی تو انہیں موٹیل میں ٹھہرنا پڑا۔ صبح بہت ہی سہانی اور خوشگوار تھی۔ پاس ہی بہت خوبصورت تالاب دلکشی کا انوکھا منظر پیش کر رہا تھا۔ چاروں طرف برف سے ڈھکے نیلے نیلے پہاڑ خوابوں کی حسین دنیا کا تصور پیش کر رہے تھے۔ نشالہ قدرتی حسن کی دیوانی تھی وہ جیسے اپنے ہوش میں نہیں رہی۔ اظفر بہت دلچسپی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

دن کی روشنی میں ان کا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔ راستے بھر وہ اپنے دائیں اور بائیں طرف کے پہاڑ دیکھتی رہی اور بغیر رکے ان پر تبصرہ کرتی رہی وہ بولتی چلی جا رہی تھی اظفر خاموش تھا وہ اس کی دلچسپ کیفیت میں خلل نہیں ڈالنا چاہ رہا تھا۔ دونوں طرف کے پہاڑ ایک دوسرے کے قریب چلے آ رہے تھے۔ یہ انوکھا ملن بھی بہت دلچسپ تھا دل میں اترا جا رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے صرف سڑک رہ گئی۔ پہاڑ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے وہ حیران رہ گئی۔ یہ انسانی ہاتھوں کا کمال تھا جس نے قدرت کو بھی محو حیرت کر دیا، جیسے کسی جادوگر نے اپنا کمال دکھایا ہو اور پہاڑ کو اپنے جادوئی پٹارے میں بند کر دیا ہو۔ کار چلتی رہی ایک بہت بڑی ڈھلان پر کافی دور جا کر جادوگر کے پٹارے سے دھیرے دھیرے نیلے نیلے پہاڑ نکلنے شروع ہو گئے۔ ان کا ملن ختم ہوا۔ وہ پھر ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ دائیں اور بائیں کے پہاڑوں میں بٹ گئے۔ وہ بہت اونچی پہاڑی چوٹی سے نیچے کی طرف آ گئے۔ چاہے وینکور سے کیلگری جایا جائے یا کیلگری سے وینکور ایک ہی جیسا منظر رہتا ہے۔ وہ لوگ وینکور شہر میں داخل ہو گئے۔ پھر سے جیسے نیا ہندوستان آ گیا ہندوستانی لوگ آ گئے۔ ہر طرف اپنی زبان، اپنے لباس اپنے ہی کھانوں کی خوشبو آنے لگی۔ ان لوگوں نے وینکور کو بہت پسند کیا۔ اس کا سورج انوکھا تھا۔ اس کی بارش دلفریب تھی۔ بادل ہمیشہ سورج پر حاوی رہتے تھے۔ جب چاہتے تھے برس پڑتے تھے۔ وینکور سے سیاٹل میں داخل ہو گئے۔ سارا دن سیاٹل میں گھومتے رہے۔ سیاٹل ٹاور دیکھا۔ سڑکیں پہاڑی ڈھلان جیسی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کار اونچائی سے کود رہی ہو سمندر کا دیدار کرنے کے لیے۔ وہ لوگ پھر واپس وینکور آ گئے اور ٹرین کے ذریعے ٹورانٹو روانہ ہو گئے۔ ٹرین کا سفر اپنی ایک الگ خصوصیت رکھتا تھا۔ کناڈا میں جو ٹرین پر نہیں بیٹھا سمجھو وہ اس جگہ کی آدھی خوبصورتی سے محروم ہو گیا۔ ٹورانٹو شہر ایک الگ حسن کا مالک تھا۔ خوبصورتی کا دلکش تاج اس کے سر پر بھی رکھا ہوا تھا دنیا کے دوسرے شہروں

کے ساتھ۔ ہر طرف دیسی ہی دیسی نظر آ رہے تھے۔ پوری ایک سڑک دیسیوں کے بزنس کے لیے وقف تھی۔ جو دیسی ساڑیوں، دیسی کپڑوں کی دکانوں اور دیسی کھانوں کے ہوٹلوں سے بھری ہوئی تھی۔مزیدار پان ہندوستان کی طرف مل رہے تھے۔اس سڑک پر چلتے ہوئے اس کو بہت اچھا لگا۔ کافی ساڑیاں اور شلوار سوٹ بھی اس نے خریدا۔زیوروں کے کچھ سیٹ بھی خریدے۔ٹورانٹو اس کو بہت دن رکنا پڑا۔ وہاں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ دس بجے رات تک سورج اپنے درشن دیتا رہتا تھا۔سات بجے شام کو دوپہر جیسا لگتا تھا۔ جاڑوں میں جو شہر سردی سے اینٹھا دیتا تھا گرمی میں وہی شہر گرمی سے جھلسا رہا تھا۔سب وے کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں آسانی تھی۔آنیٹریو پارک،سائنس سینٹر،سی این ٹاور، کناڈا ونڈر لینڈ تفریح کی مخصوص جگہیں تھیں۔ خوبصورت پارکوں کی پکنک اپنی ایک الگ خوبی تھیں۔ٹورانٹو سے ٹرین سے وہ مسی ساگا گئی۔ مسی ساگا بھی بہت خوبصورت تھا۔چھوٹے سے کھلے کھلے اسٹیشن سے نکل کر جب وہ دونوں شہر میں داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ بہت بڑی آنیٹریو لیک ان کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ بڑے بڑے جہاز اور کشتیاں آ جا رہے تھے۔ پاس ہی بہت خوبصورت چھوٹا سا پارک تھا جہاں قسم قسم کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ وہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے اس پارک میں بیٹھ گئے۔ وہ پاس کے ہوٹل سے کچھ کھانے کے لیے لینے چلا گیا۔جب وہ واپس آیا تو چار پانچ مقامی لڑکے لڑکیوں کے ساتھ نشالہ کو جاتے ہوئے دیکھا۔اس کو وہ لوگ آوارہ ٹائپ کے لگ رہے تھے۔اظفر نے جا کر ایک دم سے ان کا راستہ روک لیا اور بولا۔''یہ آپ میری بیوی کے ساتھ کہاں جا رہے ہیں؟ چلو ڈارلنگ۔'' یہ کہہ کر وہ اس کو گھسیٹتا ہوا پارک سے باہر لے گیا۔وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔

سب سے اچھا سفر نیاگرا فال کا رہا۔مسی ساگا سے کار کے ذریعے وہ نیاگرا فال کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیاگرا فال کے عجوبے کو وہ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑی دیکھتی رہی۔اظفر اس سے ذرا دور بیٹھا تصویریں اتارتا رہا۔قدرت کا حسن الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تھا۔بس نظریں اس بڑے سے جھرنے کو بلندی سے گرتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور دیکھتی دیکھتی اس کے اندر کھوئی جا رہی تھیں۔واپس نہیں آنا چاہتی تھیں۔اظفر نے اس کو کئی بار آوازیں دیں مگر اس کی آواز نشالہ تک نہیں پہونچ رہی تھی۔ وہ اس کی بے خیالی میں ڈوبی کیفیت کی مووی بناتا رہا،تصویریں کھینچتا رہا۔ وہ جیسے خود تصویر کھینچنا اور مووی بنانا بھول گئی تھی۔''ہیلو'' کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔وہ ایک امریکن لڑکا

تھا جو اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''آپ انڈیا سے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں۔''

وہ بہت متاثر لگ رہا تھا۔ وہ بھی وہیں پر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

اس نے کہا، ''بفیلو اور البنی دیکھتے ہوئے نیویارک جائیں گے۔''

''میں بھی انہیں جگہوں پر جا رہا ہوں آیئے ہم دونوں ساتھ ساتھ اپنے سفر پر جائیں۔''

وہ امریکن لڑکا بہت ڈیسنٹ، بہت ہینڈسم اور بہت اسمارٹ تھا۔ وہ اس کو اچھا لگا۔ وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ ایک دم اظفر دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

''تمہارا بچہ وہاں رو رہا ہے تم سن ہی نہیں رہی ہو۔ میں کب تک اس کو سنبھالوں۔ اب تفریح کر بھی چکو چلو میرے ساتھ۔'' پھر اس لڑکے سے ''ایکسکیوزمی'' کہتا ہوا تقریباً اس کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور بہت سے بچوں کے بیچ میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ امریکن لڑکا حیرت سے دور سے اس کو دیکھتا ہوا اپنا ہاتھ ہلاتا رہا۔ نشالہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اظفر کا سر پھاڑ دے اور وہ وہیں پر پڑا رہے۔ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ آخر وہ کون اپنا جانا پہچانا تھا۔ وہ بھی تو اس کے لیے اجنبی تھا دوسروں کی طرح۔ نیاگرا فال کا دوسرا حصّہ امریکا کی طرف تھا۔ دونوں اس کو دیکھنے کے لیے امریکا کی طرف چلے گئے۔

اظفر کو وہ بہت پسند تھی۔ دنیا کی ہر لڑکی سے مختلف۔ دنیا کی تقریباً دس زبانیں وہ اہلِ زبان کی طرح بولتی تھی جس ملک میں جس شہر میں جاتی تھی اس کے سانچے میں ڈھل جاتی تھی۔ کبھی کبھی اپنے ایڈونچر کے لیے وہ اظفر کو چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کرتی تھی، مگر اظفر اس کو پکڑ لیتا تھا اور واپس کھینچ لاتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور فیملی سے بہت بیزار دکھائی دیتی تھی۔ اس کو دولت اور دولت مند لوگوں سے سخت ترین نفرت تھی، حالانکہ دولت کے ہی بل بوتے پر ملک ملک شہر شہر گھوم رہی تھی۔ زندگی کے ہر پہلو کو انجوائے کر رہی تھی۔ ایک دن اچانک پوچھ بیٹھی۔ ''اظفر آپ کو کیسی لڑکی چاہیے۔ وہی پرانا خیال ہوگا ضرور چاند سی لڑکی چاہیے ہوگی۔ کہیں چاند کی لڑکی تو نہیں چاہیے؟''

وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ''میرے خیالوں میں نہ چاند سی لڑکی ہے اور نہ چاند کی لڑکی ہے۔ ویسے بھی ہم لوگوں کو اب معلوم ہے کہ چاند پر صرف کنکڑ پتھر ہیں۔''

''شکر ہے وہاں پر کنکرڈ پتھر ہیں ورنہ آپ لڑکے لوگ چاندسی کے بجائے چاند کی لڑکی کو ترجیح دیتے۔ ہماری اس سرزمین پر لڑکیاں بے چاری کنکرڈ پتھر کی طرح ہی ہیں۔ اہلِ نظر لوگوں کو غریب اور بدصورت لڑکی کنکرڈ پتھر ہی نظر آتی ہے۔ اللہ نے کسی مشیت سے ہی چاند پر کنکرڈ پتھر رکھ دیے۔ جب لوگ چاندسی لڑکی کو ڈھونڈھتے ہیں تو ضرور چاند کی لڑکی کے لیے مچل جاتے۔ پھر بیچاری اس زمین کی لڑکیوں کا کیا ہوتا۔ ساری لڑکیاں کنکرڈ پتھر ہی ہو جاتیں۔ اب بھی ہر لڑکی کی زندگی، روح، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر ماں باپ کا قبضہ رہتا ہے۔ شادی کے بعد شوہر کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب یہی دیکھیے میرے ماں باپ کو امیر پسند ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے امیر ترین لوگ پسند ہیں۔ غریب نہیں گھس سکتا اس فیملی میں۔ ان سے ذرا سا بھی کم ان کے نزدیک غریب ہے۔ وہ غریب چاہے میرے دل کی آواز ہو، زندگی کی مانگ ہو، روح کا سرور ہو، جینے کا مقصد ہو۔ مگر یہ سب چیزیں ہماری کہاں ہیں؟ قبضے میں ہیں، میرے ماں باپ کے قبضے میں۔''

''آپ میں اور آپ کے ماں باپ میں کانفلیکٹ ہے کیا؟''

''ہاں! ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ہمارے خیالات مختلف ہیں۔ اس لیے کہ میں نے اپنے کو پالا ہے۔ اپنی طرح سے انہوں نے مجھے نہیں پالا ہے۔ صرف روپیہ پھینکا ہے اپنا قبضہ دکھانے کے لیے بس۔ پانچ سال کی عمر سے میں اپنے کو پال رہی ہوں۔ پانچ سال پہلے بھی انہوں نے مجھے نہیں پالا تھا۔ میری پرورش گورنس، آیاؤں اور نوکروں نے کی ہے۔ اس لیے میں ان کی نہیں ہوں، اپنی ہوں، صرف اپنی۔ اب اس کو آپ ہمارے بیچ کا کانفلیکٹ کہیے یا کچھ بھی۔ یہ کانفلیکٹ میں نے نہیں انہوں نے پیدا کیا ہے بلاوجہ کے لیے۔ انہوں نے پیسہ ادا کیا ہے میرا۔ میں ان کا مال ہوں صرف مال۔ خاندان یا فیملی نہیں ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں یعنی صرف اس ایک معاملے میں ان کا دخل ہے اگر میں خود سے ان سے اچھا لڑکا ڈھونڈھ لوں تو وہ نہیں پسند کریں گے۔ اپنی ہی پسند مجھ پر لادیں گے۔ مگر میں کبھی بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ایک نہ ایک دن میری تلاش پوری ہوگی۔'' وہ بولے جا رہی تھی۔ ''جب تک وہ مجھے مل نہیں جاتا میں ایسے ہی دنیا گھومتی رہوں گی گھر واپس نہیں جاؤں گی۔''

اظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر وہ بفیلو پہونچ گئے۔ پھر بفیلو سے البنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ البنی بہت پرامن شہر اپنی خوبصورتی اور نئے انداز سے ان

کو خوشیاں دے رہا تھا۔ پھر وہ بس کے ذریعے نیویارک شہر کی طرف چل دیے۔

نیویارک پوری دنیا کے لوگوں کا خواب۔ خوابوں سے بھی حسین۔ بڑی بڑی ہائی رائز عمارتوں کو رکھنے والا۔ پوری دنیا کا کلچر اپنے انداز میں سموئے ہوئے۔ انوکھی خوبصورتی انوکھا انداز۔ ہر ادا ہر انداز پر سیاح فدا۔ امریکن انداز سے انگلش بولتی نشالہ ایک بار پھر سب کچھ بھول کر نیویارک کی مشہور جگہیں دیکھنے میں لگ گئی۔ سینٹرل پارک، لنکن سینٹر آف دی پرفارمنگ آرٹ، ٹائمس اسکوائر، اسٹیچو آف لبرٹی وغیرہ۔ سیونتھ ایونو کی فیشن ایبل دکانوں سے اس نے بہت سی اچھی اچھی چیزیں خریدیں۔ پھر وہ لوگ درمانٹ، سیاچوسٹیس، کینکٹکٹ، بوسٹن، جارجیا گھومتی ہوئی فلوریڈا میں داخل ہو گئے۔ فلوریڈا میں گھستے ہی وہ ذرا دیر آرام کے لیے وہاں بنے ہوئے ریسٹ ایریا میں بیٹھ گئے۔ ہر طرف لو برڈز اُڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایک دوسرے کو اپنے اوپر اٹھائے مکھی کے برابر اڑتا ہوا یہ جوڑا دیکھنے والوں پر اپنے پیار کا اثر ڈال رہا تھا۔ اتنا پیار اتنی دیکھ بھال ایک دوسرے کی کر رہے تھے جو انسانوں کے لیے سبق آموز تھا۔ ایک دم سے نشالہ کے منہ سے نکل گیا۔ ''اتنی چھوٹی سی جان مگر اپنی ذمہ داری اپنے پیار کو اپنے اوپر ہی اٹھا کر چل رہی ہے۔ کاش میں لو برڈ ہوتی۔''

اظفر بولا۔ ''انشاء اللہ میرا پیار بھی ایسا ہی ہوگا۔''

وہ ہنس دی۔ وہاں کی گرمی نے ان کو پریشان کر دیا۔ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ پورے پورے تولیے بھیگے جا رہے تھے۔ اتنا پسینہ اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ فلوریڈا میں وہ ڈزنی ورلڈ دیکھنے چلے گئے۔ ڈزنی ورلڈ میں چلتے پھرتے ڈزنی کریکٹرز دکھائی دے رہے تھے۔ نشالہ کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش وہ بھی ایک ننھی سی بچی ہوتی۔ اسنو وائٹ، سنڈریلا، مکی ماؤس، منی ماؤس، ڈونلڈ ڈک، ڈیزی ڈک، گوفی کو گھیرے کھڑی رہتی۔ پھر دوسرے ہی لمحے ایک ایک کے پاس کھڑی ہو کر فوٹو کھنچوانے لگی۔ اظفر اس کے فوٹو کھینچ رہا تھا، اس کی مووی بنا رہا تھا۔ کبھی دونوں ساتھ ہوتے تو پاس کھڑا کوئی آدمی یا عورت ان کی تصویر کھینچتے یا مووی بناتے۔ وہ لوگ بھی ان کو اپنے اپنے کیمرے دے کر فوٹو کھنچوا رہے تھے اور مووی بنوا رہے تھے۔ وہ لوگ بھی خوشی خوشی ان کی مدد کر رہے تھے ایک فن تھا دلچسپ فن جس سے دل ہی نہیں بھر رہا تھا۔ پھر وہ لوگ لمبی لمبی لائنوں میں کھڑے ہو کر دلچسپ شوز بھی دیکھنے گئے۔ اس کے بعد وہ میامی چلے گئے۔

وہ لوگ فلوریڈا کے سب ہی مشہور شہر اور جگہیں دیکھتے رہے اور متاثر ہوتے رہے۔ راستے میں واپسی میں تالاہاسی اور دوسرے شہر دیکھتے ہوئے اٹلانٹا آ گئے وہاں سے واشنگٹن پہونچ گئے۔ وہ عظیم شہر جو امریکا کا دارالسلطنت تھا سب سے منفرد نظر آیا۔ وائٹ ہاؤس نے اس کو بہت متاثر کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی وہائٹ ہاؤس کو اتنے قریب سے دیکھے گی۔ نارتھ اور ساؤتھ کیرولانا، شکاگو، ڈیٹرائٹ دیکھتی ہوئی مسی سپی آ گئی۔ مسی سپی ندی دنیا کی سب سے بڑی ندی ہے اس کے کنارے ٹہلنا اس کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اظفر کو بتایا۔ ''میں نے برسوں پہلے خواب دیکھا تھا کہ میں مسی سپی کے کنارے ٹہل رہی ہوں۔ آج میرا وہ خواب حقیقت کا روپ لے کر سامنے آیا۔'' اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

اظفر اس کو دیکھتا رہ گیا۔ واقعی میں خوشی بھی کیا چیز ہوتی ہے جو چہرے کا رنگ بدل دیتی ہے۔ زندگی کا انداز بدل دیتی ہے۔

اس کے بعد وہ لوگ نیو جرسی کے ٹرٹن میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے نیو جرسی، نیو آرک، پیٹرسن، ایلزبیتھ، وائن لینڈ وغیرہ شہروں میں خوب گھومے۔ اس کے بعد سینٹ لوئس چلے گئے۔ پھر ٹیکساس آ گئے۔ ٹیکساس، ہوسٹن وغیرہ دیکھتے ہوئے الپاسو آ گئے۔ الپاسو سے ان کا ارادہ میکسیکو جانے کا تھا۔ وہ اُس ندی کے کنارے کھڑے ہو گئے جس کے ایک طرف میکسیکو تھا دوسری طرف امریکا۔ دونوں طرف کے بچے پانی میں نہا رہے تھے، کھیل رہے تھے۔ میکسکن بچے انگریزی نہیں سمجھ رہے تھے۔ امریکن بچے ان سے اسپینش بول رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ امریکن بچے گھر یا اسکول میں اسپینش سیکھ رہے تھے۔ کار کے ذریعے وہ لوگ میکسیکو میں داخل ہوئے۔ پیپر گلاس لیے ہوئے فقیر کار کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کار رکتے ہی ان کا گلاس سامنے آ جاتا۔ وہ ان کے گلاس میں ڈالر ڈال دیتے۔ پھر وہ لوگ حیرث سٹی میں داخل ہوئے جیسے ہندوستان کے کسی چھوٹے شہر میں آ گئے ہوں۔ ٹھیلوں پر کیریاں بک رہی تھیں۔ بہت سے ٹھیلوں پر ملائی برف بک رہی تھی۔ سامنے ہی مشینوں پر برف گھس کر رنگ برنگے شربت ڈال کر دے رہے تھے۔ حیرث پارک میں وہ لوگ بیٹھ گئے۔ ایک بڑا سا اسٹیچو لگا ہوا تھا جس پر بہت سے کبوتر منڈلا رہے تھے۔ ایک آدمی کپڑا لے کر ان کی کار صاف کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ جب وہ لوگ جائیں گے تو کچھ نہ کچھ پیسے دیں گے۔

حیرٹ سٹی سے وہ لوگ پلین سے میکسیکو سٹی گئے۔ وہ ایک بڑا شہر تھا۔ دنیا کے سب ہی بڑے شہروں سے ملتا ہوا۔ یہاں پر نشالہ اسپینش بول رہی تھی۔ اس کو بڑا مزہ آ رہا تھا۔ پھر وہ لوگ ساؤتھ امریکا کے دوسرے شہروں میں داخل ہو گئے۔

برازیل، گیانا، وینیز ولا، پیرو وغیرہ دیکھا۔ ان کو بہت مزہ آیا۔ سب ہی ملکوں کے مشہور مشہور شہروں اور جگہوں پر ان کا خوب اچھا وقت گزرا۔ ساؤتھ امریکا بھی کافی خوبصورت تھا مگر وہاں پر وہ امیری اور ٹھاٹ باٹ نہیں تھے جو امریکا میں ہیں۔ وہ لوگ پھر ٹیکساس واپس آ گئے۔ وہاں سے کار کے ذریعے ایری زونا روانہ ہو گئے۔ اظفر کار چلا رہا تھا۔ نشالہ بہت خوش تھی۔ اس کو بہت مزہ آیا تھا۔ اس کا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ وہ برابر بولے جا رہی تھی۔ پورے سفر کو بہترین کہہ رہی تھی، اپنی زندگی کا نیا تجربہ بتا رہی تھی۔ پھر اظفر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اظفر صرف آپ کی وجہ سے میرا یہ سفر بہت کامیاب رہا۔ اگر آپ ساتھ نہ ہوتے تو میں اتنی اچھی طرح کوئی جگہ نہیں گھوم سکتی تھی۔ آپ ایک فرشتے کی طرح نازل ہوئے ہیں۔''

اظفر نے جواب دیا۔ ''یہ بھی تو دیکھیے ہمارے بچھڑنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ آپ کے پاس اس خوبصورت سفر کی یادیں رہیں گی۔ پھر ان میں دوسری یادیں جڑ جائیں گی۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ نئی یادیں پرانی یادیں کو بھلا دیں گی۔ ہو سکتا ہے آپ کی تلاش بھی ختم ہو جائے۔ آپ کو کوئی مل جائے جس کو آپ اپنے ڈیڈی کے سامنے فخر سے لے جا کر کھڑا کر دیں۔''

اس نے کہا۔ ''اب تو بس یہی دل چاہتا ہے کہ یہ دلچسپ سفر کبھی بھی ختم نہ ہو۔ ایسے ہی چلتا رہے۔ کوئی غم نہ فکر، نہ کسی کا ڈر، صرف خوشی ہی خوشی اپنے ہمراہ ہے جو ہر جگہ ایک نیا سرور، ایک نیا نشہ دیتی ہے نہ کوئی فکر ہوتی ہے نہ بوریت جیسے یہ چیزیں اپنی زندگی سے دور چلی گئیں ہیں خوشیوں کی بہت سے سوغات بخش کر۔''

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ پتا نہیں کس سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک دم سے سڑک کے کنارے سنتروں سے بھرے درخت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے پاس سنتروں کے کئی باغ تھے مگر باغ اور سڑک کے کنارے کنارے لگے ہوئے ان درختوں میں بہت فرق تھا جیسے وہ ان کا سن سٹی اور فینکس میں ویلکم کر رہے ہوں۔ فینکس سخت ترین گرمی کے باوجود بہت خوبصورت تھا۔ ایک خوبصورت ریگستان جو ہرا بھرا تھا پھل اور پھولوں سے۔ زیتون اور کھجور کے درختوں کا شہر۔ اور

آگے جا کر سڑک کے دونوں طرف خوب بڑے بڑے ہرے بھرے ببول کے درخت دکھائی دیے۔ وہ وہاں کئی روز رکے۔ پھر گرینڈ کینین کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں اب بھی سڑک کے دونوں طرف ببول کے درخت نظر آئے۔ اب وہ پیلے پیلے پھولوں سے بھرے ایک انوکھا ہی نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ان میں اب ایک بھی ہرا پتہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں چاروں طرف مختلف طرح کے اور مختلف رنگوں کے پھول اپنا جلوہ اپنا حسن دکھا رہے تھے۔ مگر گرمی اتنی تھی کہ لگ رہا تھا کہ جیسے پھول انگاروں پر رکھے ہوں اور ببول کے کانٹے آنکھوں میں چبھے جا رہے ہوں۔ اور آگے جاتے ہوئے گرینڈ کینین کے عجائبات شروع ہو گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کے دونوں طرف دیکھتی رہی۔ گرینڈ کینین پہونچ کر اور حیران ہوئی۔ گرینڈ کینین قدرت کا ایک ایسا عجوبہ لگا جس کو دیکھ کر نظریں حیران اور دل پریشان لگتا ہے۔ ہزاروں سال پرانے قدرت کے بنائے گئے اس عجوبہ پر وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ خوشی خوشی ایک چٹان سے دوسری چٹان پر پھاندر ہی تھی۔ نیچے بہت گہری وادی سے خوف زدہ بھی تھی۔ وہاں وہ لوگ ایک دن ٹھہر گئے۔ ولیم سے ٹرین لے کر پورا گرینڈ کینین گھومے۔ واپسی میں لندن برج بھی بہت اچھا لگا۔ لندن کا پرانا برج توڑا گیا تو وہ یہاں لا کر فٹ کر دیا گیا پورا لندن کا ماحول پیدا کیا گیا اور ٹورسٹ کے لیے ایک دلچسپ جگہ بن گئی۔ وہ لوگ سڈونا، کاررا ڈو دیکھتی ہوئی لاس ویگس پہونچ گئے۔ ایک رات لاف لین میں شپ جیسے گیمبلنگ پلیس پر رک گئی۔ لاس ویگس کی رنگین راتیں دل کو فرحت اور آنکھوں کو انجانی کیفیت دے رہی تھیں۔ ہوٹل کے اندر کا ماحول بڑا نشہ آور تھا۔ سب ہی کسی نہ کسی کھیل میں مشغول تھے۔ پیسے بنانے یا پیسے کھونے کے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ دنیا کا سب سے خوبصورت اور بڑا گیمبلنگ پلیس تھا۔ وہ لوگ کئی بار جیتے اور بہت بار ہارے۔ ہار گئے تب بھی فخر تھا کہ جیتے بھی تو کتنا تھے کیونکہ وہاں پر گیمبلنگ میں اتنا مزہ آتا ہے کہ ہار کر بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جیت ہوئی ہے۔ اچانک اظفر اور نشالہ جیک پاٹ جیت گئے۔ اتنی زور زور سے بیل بجنے لگی کہ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے کہ کس کے نام بہت بڑا جیک پاٹ نکلا ہے۔ صرف پانچ سینٹ کا جیک پاٹ دیکھ کر سب ہنستے ہوئے واپس چلے گئے۔ نشالہ نے کئی بار بڑے بڑے پیپر کے پیالے بھر بھر کر پچیس سینٹ جیتے، مگر مزہ دماغ پر اتنا سوار تھا کہ کھیل جاری رکھا۔ آخر میں وہ ہی نہیں اپنے بھی کئی سو ڈالرز ہار گئی۔ ہوٹل کے رنگین ماحول، ڈانس کے تھوڑے سے کپڑوں کے ڈانس، ہلکی پھلکی

میوزک بڑا رومنیٹک سماں پیش کررہی تھی۔ اچانک نشالہ ایک دیسی آدمی کو متأثر کرگئی۔ نشالہ بھی اس سے سچ مچ متأثر تھی۔ وہ سیاٹل میں رہتا تھا۔ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔

اس بار اظفر اس سے دور رہا اور تماشا دیکھتا رہا۔ اس کا دوسرا ادھورا خواب شاید اب پورا ہونے جارہا تھا۔ وہ صرف دنیا ہی گھومنے نہیں نکلی تھی کسی کی تلاش میں بھی نکلی تھی۔ اس آدمی نے لیموزین منگوالی اور وہ دونوں دوسرے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ایک سنگین سچویشن تھی جو ساری رنگینی کو اپنے اندر بہائے لیے جارہی تھی۔ خطرے کی گھنٹی کی آواز جیک پاٹ کی گھنٹی کی آواز کی طرح دلکش نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ شاید بھول گیا تھا کہ وہ ایک ڈیوٹی بھی سرانجام دے رہا ہے۔ سیٹھ اعظم کی سونپی ہوئی ڈیوٹی۔ اس نے بھی فوراً دوسری ٹیکسی لی اور اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ دونوں ایک بہت بڑے ہوٹل میں داخل ہورہے تھے۔ وہ بھی وہیں اتر گیا۔ نشالہ نے اس کو دیکھا اور اگنور کردیا۔ وہ آدمی اظفر کو شریف نہیں لگ رہا تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ایک خونخوار جانور سے مشابہہ لگ رہا تھا۔ مگر اس بار وہ ایک خاموش تماشائی ہی بنا رہنا چاہتا تھا۔ بہت اس کی مدد کرلی بہت حفاظت ہوگئی۔ اب کچھ تو انجام ہونا چاہیے۔ جب وہ اپنے کو مٹانے پر تلی ہے تو اس کو کیا غرض پڑی ہے کہ بلاوجہ اس کے معاملات میں دخل دے۔ ہر بات میں بہت ہوشیار بنتی ہے، مگر زندگی کے ساتھ کے لیے کیسے کیسے لوگ اٹھاتی ہے، پتا نہیں کس سے بدلہ لے رہی ہے اپنی فیملی سے یا خود اپنے آپ سے۔ اس نے اپنے لیے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ اچانک اظفر نے اور سب نے ایک انوکھا اور دلچسپ منظر دیکھا۔ نشالہ کے بھرپور طمانچے کی گونج پوری پبلک کو سنائی دی۔ وہ تب بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ نشالہ بھاگتی ہوئی اس کی میز پر آگئی۔ وہ خاموش رہا۔ وہ آدمی دوڑتا ہوا اس کے پیچھے آرہا تھا ایک دم سے اظفر کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اظفر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ نشالہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس آدمی نے نشالہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔ نشالہ چیخ پڑی۔ ''اظفر!''

آدمی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بھاگ کر اظفر کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''تم کو کیا ہوگیا ہے تم میری مدد کیوں نہیں کرتے۔''

''آپ غلط حرکتیں کرتی رہیں میں آپ کی مدد کرتا رہوں۔ آپ کو بچاتا رہوں آپ نے

ایسا سوچا کیسے؟ اگر آپ کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی کیا ایسے آدمی ہندوستان میں نہیں ہیں؟ خیر، یہ آپ کا بزنس ہے میرا نہیں۔ میں تو ایک شریف لڑکی سمجھ کر آپ کے ساتھ تھا، مگر آپ تو جیسے اپنی آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ میں آپ کا کوئی نہیں ہوں نہ آپ میری کوئی ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی ہیں۔ ہم دونوں کے بیچ ایک معاہدہ تھا وہ اب میں ختم کر رہا ہوں۔ آپ اب کوئی دوسرا آدمی تلاش کر لیجیے۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ گھبرا گئی اور اس سے معافی مانگنے لگی۔ دونوں پھر ساتھ ہو گئے۔ اب وہ کیلی فورنیا جا رہے تھے۔ پہلے لاس اینجلس گئے پھرا نا ہم گئے۔ ڈزنی لینڈ، ویکس میوزیم اور ڈزنی اسٹوڈیو وغیرہ دیکھا۔ یہ ڈزنی کی اصل جگہیں تھیں۔ فلوریڈا میں ان کی ہی نقل یا کاپی بنائی گئی ہے۔ یہاں بھی سب ڈزنی کیریکٹرز اور ویسے ہی شوز تھے۔ پھر وہ لوگ سین ڈیاگو گئے۔ وہاں کا زو بہت بڑا اور مشہور ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ گولڈن برج پر آگئے۔ گولڈن برج اپنے میں ایک الگ خصوصیت اور شہرت رکھتا ہے۔ بہت خوبصورت اور شاندار۔ اس سے گزرتے ہوئے وہ لوگ سین فرانسسکو پہونچ گئے اور پھر دوبارہ سیاٹل میں داخل ہو گئے۔ اب اگر وہ چاہتے تو دوبارہ کناڈا کے وینکور میں داخل ہو سکتے تھے یا مانٹانا کی طرف جا کر کیلگری میں داخل ہو سکتے تھے۔ دنیا گول ہے جیسے انہوں نے تجربہ کر ڈالا تھا۔ وہ سیاٹل کے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ اب وہاں سے ہوائی جانے کا پروگرام تھا۔ ایک دم سے اظفر نے اس سے کہا۔'' دنیا تو قریب قریب آپ دیکھ چکیں۔ کیا اب چاند ستاروں کی سیر کا ارادہ ہے؟ مریخ، وینس یا سیٹرن جانے کا منصوبہ تو نہیں ہے۔''

وہ ہنس کر بولی۔'' چاند ستاروں پر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اگر آپ چاند ستارے توڑ کر لانے کا وعدہ کریں۔''

اس نے بھی جواب دیا۔'' جی نہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا آپ کو کوئی اور دیکھنا پڑے گا۔ میں تو اپنی زمین کی چیزوں پر قناعت کرتا ہوں اور خوش ہوں۔ آسمانی دنیا میری پہونچ سے بہت دور ہے۔''

اس نے کہا۔'' میرا دل ہی رکھنے کے لیے ہامی بھر دیتے۔ اگر آپ کو ایسی محبوبہ مل جائے جو چاند ستاروں کی فرمائش کر دے تو آپ کیا کریں گے؟''

''اس کو پاگل سمجھ کر چھوڑ دوں گا۔''

وہ ہنس دی اور بولی۔ ''پھر تو آپ کو محبوبہ ملنے سے رہی، اگر آپ اس کی اتنی چھوٹی سی خواہش پر ہاں میں ہاں نہیں ملا پائیں گے۔''

''ہاں میں ہاں جب ہی ملاؤں گا جب میرا دماغ بھی اس کی طرح خراب ہو چکا ہوگا۔ ویسے اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے ایسی محبوبہ کی تلاش نہیں ہے جس کے دماغ میں خلل ہو۔ جو خیالی دنیا میں رہتی ہو، خیالی باتیں کرے۔ میں تو اس دنیا کا رہنے والا ہوں، حقیقت پسند ہوں۔ میں اس کو اس دنیا کی وہی چیزیں لا کر دوں گا جو میرے بس میں ہوں گی۔ اس کی فرمائش کے بغیر کبھی کبھی اپنی پسند کی چیزیں بھی لا سکتا ہوں، وہ ان کو قبول کرے، پسند کرے، ان کی تعریف کرے اور خوش رہے۔ ایسی شخصیت کے لیے تو میں اس کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھا سکتا ہوں۔''

''آپ بھی اپنی تلاش جاری رکھیے ہوسکتا ہے کہ آپ کو اپنی من پسند محبوبہ مل جائے، ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کے آس پاس کہیں ہو اور آپ کو نظر نہ آ رہی ہو۔''

''میں بھی یہی سوچتا ہوں مگر میں نے اپنی تلاش ابھی شروع کہاں کی ہے۔ ابھی تو میں کسی کو تلاش نہیں کر رہا ہوں صرف کھوئے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھا رہا ہوں۔ تلاش تو آپ کو ہے آپ کامیاب ہو جائیں تو یہی بہتر ہیں۔''

دوسرے دن وہ پلین سے ہوائی چلے گئے۔ ہوائی نشالہ اور اظفر دونوں کی خواہش کا جزیرہ تھا۔ جہاز کے اوپر سے ہی اتنا خوبصورت سماں دکھائی دیا کہ دونوں مبہوت ہو گئے۔ بادل بہت نیچے تھے لگتا تھا کہ وہ بادلوں کی پالکی میں سوار چلے جا رہے ہوں۔ سورج کی کرنیں چاروں طرف سونا بانٹ رہی تھیں۔ پہاڑ لگ رہے تھے جیسے سونے کے بن گئے ہوں۔ سمندر کا رنگ کبھی ہرا اور کبھی ہلکا نیلا اور کبھی گہرا نیلا لگ رہا تھا۔ تین رنگ کا سمندر جیسے دل کی گہرائیوں میں گھسا جا رہا تھا اور زمین پر لگ رہا تھا کہ جیسے چوپڑ کی بساط بچھی ہو۔ ہونولولو میں اتر کر ان کو اتنی ہریالی دکھائی دی کہ دنیا کی ہریالی پھیکی پڑ گئی۔ درختوں کی تراش اتنی خوبصورت جیسے قدرت نے چاروں طرف گلدستے سجا دیے ہوں۔ ایک ایک پتی اتنی صاف کہ جیسے رات بھر دھوئی گئی ہو صبح کی دلکشی بڑھانے کے لئے۔ گلہڑ کے پھول اس نے صرف لال رنگ کے دیکھے تھے مگر یہاں زرد، نیلے، پیلے، گلابی، نارنجی، سفید پھول دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ہر رنگ اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں میں بھر لے۔ پیلے رنگ کا گلہڑ کا پھول یا یلو ہبسکس اسٹیٹ آف ہوائی کا پھول ہے۔ ہر وقت قوس

قزح اپنی رنگینی کے ساتھ موجود رہتی۔ پہاڑوں سے اترتی ہوئی سمندر پر ٹک جاتی ایک گیٹ جیسا بنا دیتی تھی جس کے اندر سے اس کی کارگزرتی تھی۔ ڈوبتا سورج ہر دن نئے نئے رنگ لے کر سامنے آتا اور آسمان کو مختلف رنگوں سے ڈھک کر غائب ہو جاتا۔ سورج ڈوبنے کے وقت کا سماں گھنٹوں رکا رہتا۔ لگتا جیسے ابھی سورج ڈوبا ہے، جب کہ اس کو ڈوبے گھنٹوں گزر چکے ہوتے۔ ہوا، پہاڑ، ہریالی، سمندر، پھول، برستا ہوا پانی اور چمکتا سورج یہ ساتوں چیزیں ایک ساتھ قدرت کا عجوبہ بن کر نظر آتیں۔ پالینیشن سینٹر بھی بہت اچھا اور نیا نیا لگتا۔ ہر آئی لینڈ کی خوبیاں کلچرل شو کر کے دکھاتے تھے۔ رات کو زبردست رنگ برنگی شو اپنی ایک الگ خوبی رکھتا تھا اور بہت زبردست تھا۔ ایری زونا میموریل دیکھا۔ پالی لک بھی بہت خوبصورت تھا۔ ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے اس کو اڑا کر لے جائے گی۔ پھر ایک دم سے زمین پر بادل اتر پڑے اور دن کے وقت اندھیرا چھا گیا۔ یہ سب اس کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دور سمندر میں چھوٹا سا جزیرہ چائنا مین ہیٹ کے نام سے مشہور تھا۔ وہ دور سے ایک بڑی ہیٹ کی طرح نظر آتا تھا۔ سیاح جب تصویر کھینچتے تو وہ جزیرہ تصویر کھنچوانے والے کے سر پر ایسا لگتا جیسے وہ ہیٹ پہنے ہے۔ اسی لیے اس جزیرے کا نام چائنا مین ہیٹ تھا۔ نشالہ نے بھی تصویر کھنچوائی۔ کیمرے کے کمال نے وہ ہیٹ اس کے سر پر رکھ دی۔ ہیٹ پہنے بڑی مزاحیہ تصویر آئی۔ وہ ہوائی کی ایک ایک جگہ ایک ایک چیز سے متاثر تھی اور تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھی۔ اچانک وہ اظفر سے سوال کر بیٹھی۔ ''اظفر یہ بتایئے کہ اس سفر میں آپ کو سب سے اچھی جگہ کون سی لگی، یعنی آپ کس جگہ اور کس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟''

اظفر کا دل چاہا کہہ دے کہ اس سفر میں آپ مجھے سب سے زیادہ اچھی لگیں دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔ دنیا کی ہر لڑکی سے الگ یہی چیز مجھے پسند آئی۔ لیکن وہ یہ نہ کہہ سکا اس نے کہا۔ ''آپ میرا انٹرویو لے رہی ہیں کیا کسی اخبار وغیرہ میں شائع کروانا ہے؟''

''آپ کون سے بہت بڑے آدمی ہیں جس کا انٹرویو لے کر میں اخبار میں چھپواؤں گی۔ یہ سوال تو میں نے ایسے ہی کر دیا تھا۔ آخر آپ کے کچھ تو تاثرات ہوں گے اس سفر کے بارے میں۔''

''پہلے آپ اپنے تاثرات بتایئے۔''

''میرے تاثرات یہ ہیں کہ آپ نے مجھے بہت متاثر کیا اور میرے سفر کی کامیابی میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔اگر میں اپنی سوانح حیات لکھوں گی تو آپ کا نام سرِفہرست ہوگا۔''

''شکریہ اس عزت افزائی کا۔ مجھے ہر ملک، ہر شہر نے متاثر کیا۔ ہر جگہ کی اپنی اپنی خوبی ہے، اپنی اپنی خوبصورتی ہے۔ان سب کے ساتھ آپ کا اتنی بہت سی زبانوں پر عبور نے بہت متاثر کیا۔آپ نے ہر جگہ اہلِ زبان کی طرح ہر ملک کی زبان میں گفتگو کی۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی اس خوبی نے اس سفر کو بہت دلچسپ اور کامیاب بنایا ہے۔آپ ابھی تک کسی سے متاثر نہیں ہوئیں حالانکہ لوگ آپ سے متاثر ہو ہو کر آگے بڑھے جس نے مسئلے بھی پیدا کیے۔حالانکہ وہ میرے مسئلے نہیں تھے مگر میں خواہ مخواہ کے لیے اپنے آپ کو اس میں انوالو پا رہا تھا۔'' وہ خاموش ہوگیا۔اظفر برابر اس کو دیکھے جا رہا تھا۔پتا نہیں اچانک وہ کس سوچ میں غرق ہوگئی تھی۔

اُودے اُودے رنگ کے کپڑوں میں وہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔اسی میچنگ کے زیور بھی تھے جو اس کے حسن میں چار چاند لگا رہے تھے۔ اچانک وہ چونک پڑی۔اظفر اب تک اسی کو دیکھ رہا تھا۔آخر وہ بولی۔''کیا بات ہے؟ کیا میں بہت فنی یا مزاحیہ نظر آ رہی ہوں؟''

''نہیں تو۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''آپ مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں۔میں سمجھی شاید میرا چہرہ کچھ عجیب ہوگیا۔''

''چہرہ عجیب وغریب ہو کیا تب ہی دیکھا جاتا ہے؟'' اس نے اچانک سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔''کبھی کبھی خوبصورت چہرے پر بھی تو نظر ٹک جاتی ہے اور دیکھتے رہنے کو دل چاہتا ہے۔''

''اچھا تو آج آپ کے دل نے بھی کچھ چاہا ہے اور اس کی نظرِ عنایت میرے چہرے پر ہے۔''

''پتا نہیں آپ پر ہے یا آپ کے چہرے پر ہے میری نظروں نے حسین گستاخی کر دی چلیے۔اسی بہانے آپ کی خاموشی تو ٹوٹی۔بات چیت کا کچھ آغاز تو ہوا ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں اکیلا ہوں۔اس وقت آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔شاید آپ کا تصور اُس نامعلوم ہستی کی

طرف ہے جو ابھی تک آپ کو نہیں مل سکی جس کی تلاش میں آپ نے سچ مچ پوری دنیا کھنگال ڈالی۔ کہتے ہیں ہر ایک کے نصیب کا کوئی نہ کوئی ہوتا ہے بس ملنے کے لیے وقت اور ساعت کی ضرورت ہے۔ وہ پتا نہیں کب اور کہاں ٹکرا جائے۔''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔ اس کی خاموشی کو الفاظ نہیں مل رہے تھے کہاں سے شروع کرے۔ وہ اظفر کے لیے سوچ رہی تھی۔ وہ ایک شریف انسان تھا۔ وہ اس کو کئی بار آزما چکی تھی۔ دوسرے اجنبی آدمی جو اس کو ملے تھے وہ قابلِ اعتماد نہیں تھے۔ جگہ جگہ وہ اس کی حفاظت ایک محافظ کی طرح کرتا رہا جیسے واقعی میں وہ اس کا باڈی گارڈ ہو۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کا سفر کرتی رہی۔ کبھی ٹرین، کبھی بس، کبھی کار اور کبھی پلین اور کبھی شپ سے پورے امریکا، کناڈا اور یورپ کو دیکھتی رہی۔ جاگتی آنکھوں کا یہ خواب کتنا خوبصورت، کتنا دل نشین تھا۔ اجنبی ہم سفر جیسے اس کا اپنا تھا کوئی جان پہچان نہیں تھی مگر وہ اس کے دل کا بن گیا، ایک جان دو قالب کی طرح۔

چاہت کیسے نہ بنتی، محبت کا تیر کیسے نہ چلتا۔ شادی شدہ جوڑے ہنی مون کے لیے دنیا کی سیر کے لیے جاتے ہیں، مگر یہ اجنبی جوڑا بغیر کسی جان پہچان کے ایک دوسرے کا ہو گیا اور یہ جان پہچان زندگی کی جان پہچان بن گئی۔ وہ اس کے لیے زندگی کا ساتھی تلاش کروا رہا تھا اور خود انجان بنا رہنا چاہتا ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ اس سے اچھا بھی کوئی زندگی کا ساتھی ہو سکتا ہے جس نے دنیا کی جان پہچان کراتے کراتے خود اپنی پہچان کرا دی تھی۔ ایک انوکھی پہچان جو دل کی پہچان بن گئی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ خوشی سے پاگل ہو گئی اور یہ پاگل پن چیخ بن کر کہہ اٹھا۔ ''میں نے پا لیا۔'' اظفر نے اس کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا پا لیا؟''

''تمہیں جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''اچھا تو تم مجھے تلاش کرنے نکلی تھیں اپنا گھر اپنی فیملی چھوڑ کر۔''

''ہاں! مجھے جس کی عمر بھر سے تلاش تھی وہ تم ہی ہو اظفر، صرف تم۔''

''میں؟ حیرت کی بات ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں تمہیں نظر نہیں آ رہا ہوں۔ ایک غیر اہم شئے ہوں۔ ویسے بھی میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ معمولی نوکری کرنے والا۔ تمہارا انتخاب غلط تو نہیں ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''تم معمولی نہیں۔ غیر معمولی انسان ہو۔ مجھے دولت کی پروا نہیں

ہے وہ میرے ماں باپ کے پاس بہت ہے مگران کے پاس تمہارے جیسا انمول ہیرا نہیں ہے جس کو میں نے تلاش کیا ہے اور جسے مجھے پانا ہے، تمہیں اپنانا ہے۔''

''مجھ غریب سے شادی کرنے سے تمہارے ماں باپ انکار کردیں گے۔''

''تب بھی میں تم سے ہی شادی کروں گی۔ مجھے دولت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے سکون کی تلاش تھی جو مجھے مل گیا تمہاری بدولت۔ ایسی دولت کس کام کی جو عالیشان محل کھڑے کردے مگر رہنے والے اس میں رہ نہ پائیں، ہوسٹل میں زندگی گزاریں۔ وہ کاریں کس کام کی جو صرف گیراج کی سجاوٹ بنی رہیں۔ کبھی کبھی بڑی مشکل سے اپنے مالکوں کو زیارت کرائیں اور استعمال کرنے کی اجازت دیں، وہ دولت کس کام کی جو فرصت ہی نہ دے اپنے گھر اور اپنے بچوں کی پرورش کرنے اور پیار کے دو بول کہنے کی۔ میرا تو خواب اور خوابوں کا شہزادہ وہ ہے جو دن بھر کا تھکا ہارا آئے تو میں گھر پر بیٹھی اس کا انتظار کرتی ہوئی ملوں۔ وہ گھر آکر اپنی بیوی اور بچوں کو وقت دے، بچوں کی تربیت میں ساتھ دے جیسا عام زندگی میں ہوتا ہے۔ کیا تم میرے خوابوں کے ایسے شہزادے بنو گے؟ مجھے اپنی دنیا میں لے جا کر اس سفر کی طرح اس دنیا کی بھی سیر کراؤ گے جس کی میں ترسی ہوں۔ جو میرے خوابوں کی دنیا ہے جس میں، میں ہمیشہ رہنا چاہتی ہوں اور دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ماں باپ چاہے وہ جس طبقے کے ہوں ان کی مشغولیت بچوں کو نہ صرف ان سے، بلکہ مارل کیریکٹر سب سے دور لیے جارہی ہے۔ پوری نسل اور پوری قوم کو ڈبوئے دے رہی ہے۔ ماں باپ کی اچھی تربیت کے بغیر بچے کھوئے جارہے ہیں۔ اسی لیے میں پوری دنیا دیکھ چکی ہوں شاید آنے والا وقت اب مجھے اتنی دولت یا فرصت نہ دے کہ میں صرف دنیا ہی دیکھتی رہوں اور میرا گھر مجھے دور سے دیکھتا رہے۔ میرا انتظار کرتا رہے۔ ڈیڈی اور ماما جن کے پاس اپنی دولت سنبھالنے کا وقت نہیں ہے اب وہ میری شادی کر کے اس سے بھی دس گنا بڑھانا چاہتے ہیں۔ زندگی وقت ہی نہیں دے گی اپنے گھر واپس آنے کے لیے اور وقت ہی وہ چیز ہے جس کی ضرورت فیملی اور بچوں کو زیادہ ہے۔ پلیز اظفر! میرا ساتھ دو اور مجھے اپنالو۔ مجھے دولت کے اس پیرامڈ میں دفن ہونے سے بچالو۔''

اظفر اس سے بہت متاثر نظر آیا۔ وہ لوگ دل سے تو کب سے ایک دوسرے کے تھے مگر اب ذہن سے بھی ایک دوسرے کے ہوگئے۔ نشالہ کی تلاش ختم ہوگئی تھی۔ ہوائی نے ان کو دنیا

کی سب سے بڑی خوشی دے دی تھی۔ ان کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔ پہلے وہ ایک اجنبی کے ساتھ تھی اب اس کا دلبر، اس کا محبوب اس کی باقی بچی دنیا اس کو دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر وہ اس کی سب سے بڑی خوشی پوری کر رہا تھا۔ ہونو لولو جتنا خوبصورت تھا اتنی ہی خوبصورتی اور دلفریب رنگ اس کی زندگی میں بھر دیے تھے۔ اتنے ہی رنگ اس کے ہم سفر تھے۔ وہ اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ شپ پر کروز کرتے ہوئے اظفر نے اس کی سالگرہ منائی۔ کروز کے کام کرنے والوں نے ہر اس شخص جس کی سالگرہ یا شادی کی سالگرہ تھی منائی۔ ان کے گلے پھولوں کے ہاروں سے بھر گئے جتنے پھول اور ہار اظفر خرید سکتا تھا سب خرید کر اس کے گلے کے ہار بنا دیے۔ لڑکیوں نے بہت دلکش انداز میں ہوائی کا مشہور ہولا ڈانس پیش کیا۔ وہ پھولوں کے ہاروں سے لدی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ایسی سالگرہ تو اس نے کبھی بھی نہیں منائی تھی۔ اس نے ہوائی کے سارے آئی لینڈ، اوہااو، ماوی، کوائی، بگ آئی لینڈ یا ہوائی سب ہی دیکھ ڈالے۔ پھر وہ وہاں سے جاپان چلے گئے۔ ٹوکیو بھی بہت اچھا بہت شاندار تھا۔ فلپائن، انڈونیشیا، ملیشیا، سنگاپور، چین، ہانگ کانگ، تاپے، تائیوان سب ہی جگہ ان لوگوں نے انجوائے کیا۔ ہر ملک اپنے الگ الگ انداز الگ الگ خوبیوں سے دیکھا تھا۔ ملیشیا میں جب ایک مال سے ان کے ہوٹل تک جانے کے لیے رکشے والے نے سات سو روپے مانگے تو دونوں حیران رہ گئے۔ جب کہ وہ ہوٹل بہت قریب تھا۔ سات سو روپے اتنی سی دوری کے جب رکشے والا لے رہا ہے تو وہ کتنا امیر ہوگا، دونوں نے سوچا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ خیر، وہ بیٹھ گئے رکشے کو آدمی کھینچ رہا تھا۔ آدمی کو آدمی کھینچے کتنے افسوس کی بات تھی۔ نشالہ کو اچھا نہیں لگا، اپنے یہاں بھی رکشے کو آدمی کھینچتے ہیں مگر اس میں سائیکل تو لگی ہوتی ہے رکشے والا آرام سے گدی پر بیٹھا ہوتا ہے۔ جانوروں کی طرح وہ رکشا دوڑاتا جا رہا تھا، شاید اتنی محنت کی وجہ سے وہ اتنے پیسے مانگ رہا تھا۔ جب انہوں نے کرایہ دیا تو ڈالر کے حساب سے وہ بہت کم منی تھی۔ دونوں حیران رہ گئے۔ ملیشیا میں اب بھی کٹھ پتلی کے شو کا رواج ہے۔ راجا ہریش چند، رام سیتا اور راون وغیرہ کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ کٹھ پتلیاں سب کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ شو پوری رات چلتے ہیں جیسے ہندوستان میں برسوں پہلے ہوتے تھے۔

نشالہ کا دنیا کا سفر ختم ہو گیا۔ وہ اور اظفر ہندوستان لوٹ رہے تھے ایک نئی خوشی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی اپنی پسند کے ساتھ اپنی سرزمین پر لوٹ رہی تھی۔ اس

کی تلاش واقعی میں پوری ہوگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اظفر نے کتنی اچھی طرح ہر جگہ گھمائی تھی جیسے اس کا اپنا ہو۔ اب وہ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی جدائی کا کرب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو جلد از جلد اپنانا تھا، اپنا بنانا تھا۔ شکر تھا کہ وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا اور یہ ہی چیز اس کو اب ایک طوفان سے گزارنے والی تھی۔ ڈیڈی اور ماما کبھی بھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ بہت زبردست ٹکّر تھی۔ مگر زندگی اس کی تھی اس کو اپنی طرح جینے کا حق تھا۔ اس کو امید تھی کہ وہ کامیاب ہوگی۔ اگر اظفر نے ساتھ دیا تو وہ گھبرائے گی نہیں۔ اگر اظفر گھبرا گیا تو بہت بڑی جیت ہار میں بدل جائے گی۔ اظفر کے بغیر اب وہ جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اظفر کی وقتی جدائی کے خیال سے وہ پریشان تھی۔ کیسے لمحوں کو سمیٹ دے، کیسے اظفر کو جدا ہونے سے روک لے، جدائی بہت لمبی ہوگئی تو کیسے وہ زندہ رہے گی؟ اس کا عشق روایتی عشق سے بہت آگے چلا گیا تھا۔ اس کا ہر پل، ہر لمحہ اب اظفر کا تھا۔ اظفر اس کے جینے کا مقصد تھا۔ یہ جینے کا مقصد اس کے لیے کتنی بھرپور زندگی لایا تھا۔ اس کی زندگی کے سب سے بڑے خواب کو کتنی خوبصورتی سے پورا کیا تھا کہ اب وہ خود اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب بن گیا تھا۔ وہ خواب تو یاد بن گیا تھا اظفر حقیقت بن گیا تھا۔ دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے۔ ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ایک لمحے کو اپنے پیار سے سینچ رہے تھے۔ وقت کو روک دینا چاہتے تھے۔ دنیا کا یہ سفر ہمیشہ زندگی کا سفر بن کر چلتا رہے یہ ہی دونوں کی خواہش تھی۔

سیٹھ اعظم، نشالہ کا فون پا کر دنگ رہ گئے۔ اس کا سفر ختم ہوگیا تھا اور اس کو ایک نوجوان بھی مل گیا تھا جس کو لے کر وہ آ رہی تھی۔ اُسی تاریخ کو جس کے دوسرے دن اس کی منگنی سیٹھ عاطف کے بیٹے کے ساتھ ہونے والی تھی۔ وہ غصے سے تڑپ اٹھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ اظفر تو ان سے ہر فون پر کہتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ نشالہ اب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ اب ان کی پسند کو ہی ترجیح دے گی۔ اس نے اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کی ہے اور اس کی جاسوسی بہت قریب سے کی ہے۔ وہ مطمئن ہوگئے تھے مگر نشالہ کا فون ان کی امیدوں پر پانی پھیر گیا۔ اس آدمی نے جھوٹ بولا تھا، نشالہ اس کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ نشالہ کی واپسی سے پہلے ہی اچانک سیٹھ عاطف نے اس کی منگنی کی تاریخ دے دی تھی۔ سیٹھ اعظم نے منظور بھی کر لیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ لڑکا کیسا ہوگا اور سیٹھ عاطف کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ لڑکے اور لڑکی نے

ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا اور وہ نہ صرف شادی طے کر بیٹھے تھے منگنی کی تاریخ بھی دے دی تھی۔ سچ ہے دولت میں اتنی طاقت ہوتی ہے۔ ورنہ اتنے امیر آدمی کا لڑکا بغیر لڑکی دیکھے شادی کے لیے تیار تھا اور اپنی لڑکی کا مزاج جانتے ہوئے بھی سیٹھ اعظم منگنی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن نشالہ جس کے ساتھ آئی اس کو دیکھ کر سیٹھ کا پارہ چڑھ گیا۔ یہ تو وہی نوجوان تھا جس کو انہوں نے نشالہ کا باڈی گارڈ بنا کر بھیجا تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنی تباہی کا سامان مہیا کر لیا تھا ورنہ ہوسکتا تھا کہ نشالہ بغیر کسی آدمی کے لوٹ آتی۔ وہ غصے سے چیخ کر بولے۔ ''تو میرا نوکر میری لڑکی سے شادی کرے گا۔ میرے بخشے ہوئے ٹھاٹ باٹ کو اپنے باپ کا مال سمجھ بیٹھا۔ رئیس زادے کا رول کھیلنے لگا میری لڑکی کو پٹانے کے لیے۔ نکل جا ابھی میرے گھر سے ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔''

نشالہ حیرت میں پڑ گئی تو اس کا شک صحیح تھا۔ وہ واقعی میں اس کے باپ کا بھیجا ہوا آدمی تھا جو اس کی نگہبانی کر رہا تھا۔ نگہبانی کرتے کرتے خود ہی نگہبان بن بیٹھا۔ مگر پھر بھی اب وہ اس کا تھا اور اس کا ہی رہے گا اس کی پوری زندگی کا محافظ۔ ایسا محافظ تقدیر والوں کو ہی ملتا ہے۔ پورے سفر میں کتنی حفاظت کتنا تحفظ اس نے دیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''ہمارے پاس تو دولت ہے اور اتنی دولت ہم لوگوں کے لیے کافی ہے۔''

''یہ دولت تمہاری نہیں میری ہے۔ دولت کو دولت کھینچتی ہے کنگال نہیں۔ جا میں نے تجھے نوکری سے نکال دیا۔'' نشالہ چیختی رہ گئی مگر دو نوکروں کے ذریعے وہ گھر سے باہر پھینکوا دیا گیا۔ اس نے پہلے ہی اظفر سے کہہ دیا تھا کہ ہر حال میں وہ انگوٹھی لے کر آئے اور منگنی کے ہنگامے میں وہ انگوٹھی پہناتے ہوئے ڈرے نہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہے اور اظفر کا انتظار کرے گی۔ اس کو امید تھی کہ وہ ضرور آئے گا مگر یہ خوف تھا کہ کہیں وہ ڈر نہ گیا ہو اور آنے کی ہمت نہ کرے اس کے ڈیڈی نے اس کی کتنی بے عزتی کر کے نوکروں کے ذریعے گھر سے باہر پھینکوا دیا تھا۔ اتنی بے عزتی کے بعد کیا وہ آئے گا؟ بار بار اس کا دل یہی سوچ رہا تھا۔ اس کو آنا پڑے گا اس کے لیے۔ اس نے تو اس کی بے عزتی نہیں کی تھی، مگر وجہ تو وہی تھی اس لیے خطاوار بھی وہی تھی۔ اگر وہ نہ آیا تو زبردستی کی یہ منگنی اس پر سوار ہو جائے گی۔ مگر وہ مانے گی نہیں۔ وہ صرف اظفر سے شادی کرے گی۔ کوئی اور اس کو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس کے پل پل بدلتے روپ سے صرف اظفر متاثر ہوا تھا۔ وہ اظفر کی جدائی میں روتی رہی تھی مگر سب بیکار تھا۔ ماما ڈیڈی ذرا بھی نہیں پسیجے۔ ان کی منگنی کی تیاریاں جاری رہیں

تھیں۔اظفرنہیں تھا تو اس کو لگ رہا تھا کہ جیسے دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔سب کچھ ختم ہو گیا اظفر اس کی زندگی کا نور اس کی زندگی کی روشنی تھا۔اس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اس کے دل میں یادگار بن گیا تھا اس کے دل کا قرار بن گیا تھا۔

دوسرے دن نشالہ کہتی رہی کہ اس کو منگنی نہیں کرنی ہے مگر تیاریاں تو زوردار طریقے سے ہو چکی تھیں۔سب ہی مہمان آ گئے تھے۔دولہا کے ماں باپ بھی آ گئے تھے۔دولہا دوسرے شہر سے آ رہا تھا، اس لیے ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ایک دم سے اس کو اظفر آتا دکھائی دیا۔نشالہ خوشی سے چیخ پڑی۔

''اظفر تم آ گئے۔میں تمہارا انتظار بہت دیر سے کر رہی تھی۔'' یہ سنتے ہی سیٹھ اعظم نے ہنگامہ مچا دیا اور کہا۔''اس کنگال سے شادی کرے گی۔جس کے پاس اب میری بخشی ہوئی نوکری بھی نہیں ہے۔''

''ڈیڈی! کوئی بات نہیں آدمی ہوشیار ہے اس کو دوسری نوکری مل جائے گی۔''

''کتنے ٹکے کی ملے گی؟''

''جتنے کی ملے۔میں خود نوکری کر لوں گی۔''

''تم نوکری کرو گی۔جس کو میں نے شہزادیوں کی طرح رکھا۔یہ عالیشان محل دیا۔قیمتی قیمتی کاریں دیں۔نوکر چاکر مہیا کیے۔''

''ڈیڈی آپ نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔یہ محل صرف دور سے دیکھنے کے لیے ہیں۔پانچ سال کی عمر سے میں ہوسٹل میں رہ رہی ہوں تاکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں، اعلیٰ انسان بن سکوں، ہوسٹل میں کون اعلیٰ انسان بنانے والا ہے؟ وہاں تو ہم جیسے ماں باپ سے بچھڑے بچے گھر کے آرام سے دور ملتے ہیں جو راتوں کو ڈرتے اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔جن کو اچھے برے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔کیونکہ ان کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اچھا کیا ہے؟ برا کیا ہے؟ ان کو جو چیز خود سے اچھی لگی وہ اچھی ہے۔ان کے لیے بری چیز بھی اچھی ہو جاتی ہے جس کو کرنے کی ان کو آزادی ہوتی ہے۔کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ایک معمولی کمرے میں رہتے ان کی عمر گزر جاتی ہے۔وہ اپنے محلوں پر فخر کرتے رہتے ہیں جہاں مشکل سے چند دن ان کے گزرتے ہیں۔یہ کاریں گیراج سجانے کے لیے ہیں۔ہم ہوسٹل میں پیدل چلتے ہیں، بسوں میں دھکے کھاتے ہیں یا پھر ٹیکسی میں سفر جاری رکھتے ہیں۔یہ ہوائی جہاز ضرور اپنی ملکیت بنتے ہیں جن پر ہم آسانی سے سفر کر لیتے ہیں پوری دنیا

اپنی لگتی ہے جب چاہیں جہاں چاہیں پہونچ جاتے ہیں۔ ہوٹل اپنے لگتے ہیں جہاں ہم ٹھہرتے ہیں کھانا کھاتے ہیں۔ اب تعلیم ختم کرتے ہی شادی۔ آپ ہی سوچیے کہ میں کب اس گھر میں رہی؟ میں نے آنکھ کھول کر ایک معمولی زندگی دیکھی ہے ڈیڈی، میں بہت معمولی لڑکی ہوں۔ میری گزر کسی معمولی آدمی کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔''

''اگر تم نے اس سے شادی کی تو میں تمہیں اپنی دولت میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔''

''ڈیڈی، میری تربیت بہت معمولی طریقے سے ہوسٹل میں ہوئی ہے میں ایک معمولی لڑکی ہوں۔ میں آپ کی دولت لے کر کیا کروں گی جس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں آپ اور ماما کی طرح میں بھی لگ جاؤں گی۔ میرے پاس بھی آپ لوگوں کی طرح وقت تنگ ہو جائے گا۔ بچے ہوسٹل میں چلے جائیں گے۔ چند گھنٹے میری قربت کے ان کی زندگی کو نصیب ہوں گے۔ جیسے جب میں گھر آتی تھی تو آپ لوگ مجھے صرف دو منٹ ہی تو دیتے تھے پھر نوکر چاکر ہی میری نگہداشت کرتے تھے۔ نوکر چاکر معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا معمولی پن ہی مجھے ملا جو میری زندگی میں اتر گیا۔ میں اپنے بچوں کو اپنا پیار اور وقت دوں گی ان کی زندگی کو اپنے پیار کے لیے ترساؤں گی نہیں۔ میری خواہش یہ معمولی آدمی ہی پوری کرسکتا ہے آپ کے سیٹھ کا بیٹا نہیں۔ میں آپ کی دولت کو ٹھوکر مار رہی ہوں۔ آپ اپنے بعد یہ دولت، یہ محل خیرات کر دیجیے گا غریب بے سہارا یتیم بچوں کو دے دیجیے گا۔ جس چیز سے میں انجوائے نہیں کر پائی وہ لوگ کرلیں۔ آپ بھی اپنے والدین کی اکیلی اولاد تھے۔ ماما بھی اکیلی تھیں اور اتفاق سے میں بھی اکیلی اولاد ہوں۔ اتنی دولت کس کے لیے جمع ہوئی ہے؟ زندگی نے کبھی آپ کو، ماما کو، مجھے مل کر زندگی کا لطف نہیں لینے دیا۔ آپ لوگ صرف دولت بڑھاتے گئے، بڑھ جانے کے بعد اب بھی ہوس کم نہیں ہوئی تو اپنے سے دس گنا زیادہ دولت کے اندر مجھے دفن کرنے کی سوچی۔ اتنی دولت کے نیچے میں ہرگز دفن ہونا پسند نہیں کروں گی۔ میں اس گھٹن سے نجات پانا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ آزاد کر دیجیے۔۔ اپنی زندگی جینے دیجیے۔ اپنی اولاد ہونے کی اتنی بڑی سزا مجھے مت دیجیے۔''

اس نے اظفر کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور کہا۔ ''اگر تم اپنی انگوٹھی لائے ہو تو نکالو جلدی سے مجھے پہنا دو، ورنہ ان کا بیٹا آجائے گا۔''

''چلو میں اپنے بیٹے کے آنے سے پہلے ہی انگوٹھی پہنائے دیتا ہوں۔ شاباش میں خود تمہیں انگوٹھی پہناؤں گا۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔'' سیٹھ عاطف نے کہا۔

''نہیں۔'' وہ چیخ کر بولی۔ ''انگوٹھی اظفر پہنائے گا۔''

''نشالہ! ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ بزرگ انگوٹھی پہناتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اظفر نے نشالہ کی انگلی سیٹھ عاطف کے سامنے کر دی انہوں نے انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی اور دعائیں دیں۔ پھر بولے۔ ''نشالہ، مجھے تمہارے خیالات نے بہت متاثر کیا۔ اظفر میرا بیٹا ہے میں اس کے لیے ایسی ہی لڑکی ڈھونڈھ رہا تھا جو میری دولت کی طمع میں نہ آئے، بلکہ ایک اچھی سیرت کی لڑکی ہو۔ ہمارے پاس باپ دادا کی پشتوں کی دولت ہے۔ میری بیوی جہیز میں دولت نہیں لائی تھی۔ وہ گھریلو عورت بن کر اپنے گھر اور اپنے بچے سے انجوائے کرتی رہی، اس کو اعلیٰ تربیت انہوں نے خود دی۔ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی جو گھر اور بچوں کی قدر کرے۔ دولت اور محلوں کے خواب دیکھتے دیکھتے ان کو ہی کھنڈر نہ بنا دے۔ ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ آخر میں انسان کو کھا جاتی ہے۔ آپس میں میل ملاپ محبت اور کوآپریشن ہو تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی بہت بڑی دولت لگتی ہیں۔ قناعت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ انسان کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرح جیے اور دوسروں کو جینے دے۔ ہر کسی کو جینے کا حق ملنا چاہیے۔ سیٹھ صاحب، مجھے آپ کے گھر سے ہیرا مل گیا۔ آپ اپنی دولت ویسے ہی خرچ کیجیے جیسا آپ کی بیٹی چاہتی ہے۔ یہی اس کا جہیز ہے۔ مجھے جہیز میں اس کے اصول ملے ہیں۔ آپ کی دولت کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے جب شادی کی بات شروع ہوئی تو آپ کی خواہش کے مطابق میں نے اظفر کو بھیجا تھا کہ آپ اور آپ کی لڑکی اس کو دیکھ لیں اور وہ آپ لوگوں کو۔ جیسے ہی آپ نے اس کو دیکھا اس کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ زبردستی اس کو اپنا نوکر بنا لیا۔ ایسا نوکر بننے کے لیے میں نے اس کو خوشی خوشی اجازت دے دی۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر آپ کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ ایسا پرکھنا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ چیز آپ کی طرف سے آئی۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ آپ نے اپنی بیٹی کے لیے اچھا محافظ ڈھونڈھا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا محافظ بن گیا۔ اس محافظ کو اپنانے میں اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

سیٹھ اعظم حیران کھڑے رہ گئے۔ واقعی یہ اتفاق کتنا حیران کن مگر کتنا خوبصورت تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

◆÷◆

آنسو

شاید آنسوؤں سے اس کو بہت پیار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہنستی تھی تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں، روتی تھیں تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی، غصہ ہوتی تھی تو آنسو نکل پڑتے تھے۔ جب بھی کوئی اس کی بات نہیں سنتا تھا یا بلا وجہ کی بحث کرتا تھا، اپنی غلط بات اس پر لادتا تھا یا اس کی صحیح بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا تب وہ رونے بیٹھ جاتی تھی۔ غرض کہ بات بات پر رونا اس کی عادت بن گئی تھی۔ کاشیانۂ سیماب کے ہر فرد کو اس سے اور اس کے آنسوؤں سے نفرت تھی۔ کاشیانۂ سیماب جو اپنی شان وشوکت اور آن بان کے لیے مشہور تھا اس کے مالک مقصود الزمان اور خدیجہ بی تھے۔ خدیجہ بی بڑی بیگم کے نام سے بھی مشہور تھیں۔ ان کے آٹھ بیٹوں میں ایک بیٹے ساجد کا طویل بیماری کی وجہ سے انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی بیوی ثروت بیگم اور بیٹی عرشاں کاشیانۂ سیماب کے ایک معمولی پورشن میں رہتی تھیں۔ وہ حصہ شاید بہت زیادہ خوشحالی کے زمانے میں سرونٹ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ساجد نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی جس میں ماں باپ کی رضامندی شامل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ وہ نہیں جانتے کہ کب شادی ہوئی؟ کب عرشاں پیدا ہوئی؟ نہ تو انہوں نے شادی دیکھی تھی اور نہ عرشاں کی پیدائش۔ تو وہ کیسے سمجھ لیں کہ وہ دونوں ان کے اعلیٰ امیر خاندان کا حصہ ہیں، ہاں اگر انہوں نے دیکھا تھا تو ساجد کی غریبی، ان کی طویل بیماری اور موت۔ یہ ساجد کے مرنے کا زمانہ نہیں تھا۔ یہ دونوں ماں بیٹی ہی منحوس تھیں جو اس کو کھا گئی تھیں۔ ایسی منحوس عورتوں کے لیے نہ تو ان کی محل نما کوٹھی میں جگہ تھی اور نہ ان کے دلوں میں۔ دوسرے سات بیٹوں کی بیویاں مقصود صاحب اور بڑی بیگم کی پسند کی تھیں۔ ان سب کا اعلیٰ مقام تھا۔ وہ سب امیر ترین خاندان کی خاندانی عورتیں تھیں اور اس خاندان کی بھی عزت سمجھی جاتی تھیں۔

سب سے بڑے بیٹے گلفام کی بیوی رقیہ بہت اعلیٰ خاندان کی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ

ان کا خاندان مقصود صاحب کے خاندان کے ٹکّر کا تھا۔ان کے بیٹے صمد، عذیر، اور حماد تھے۔کوئی بیٹی نہیں تھی ۔بس یہ بیٹوں کے والدین سب سے زیادہ غریب ثروت بیگم اور عرشاں کے دشمن تھے۔ یہ ہی دشمنی انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی دے دی تھی ۔دوسرے بیٹے احتشام تھے۔ان کی بیوی خالدہ تھیں۔ یہ بھی اپنے بڑے بھائی، بھابی اور ماں باپ کے نقشِ قدم پر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی بیٹیاں گلفام کے بیٹوں سے ہی بیاہی جائیں۔ان کے تین بیٹیاں تھیں سنجیہ، صغرا، ثمرا، تیسرے بیٹے جادیش اور ان کی بیگم حسنیٰ، امریکا میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ان کے بیٹے ثوبان تھے۔ چوتھے بیٹے فہیم اور ان کی بیگم رافعہ تھیں۔ان کے بیٹے نجیف تھے۔ پانچویں بیٹے ساجد تھے جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ان کی بیوی ثروت بیگم اور بیٹی عرشاں تھیں۔ چھٹے بیٹے کاظم تھے۔ان کی بیگم رشدہ تھیں۔نہایت رئیس ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔اپنی فیملی کے ساتھ اپنے میکے میں ہی رہتی تھیں۔ان کے تین بچے تھے عماد، جاسیہ اور نشابہ۔ساتویں بیٹے اسلم تھے جن کی بیگم صوفیہ، رقیہ کی سگی بہن تھیں اور ظاہر ہے کہ صوفیہ اور رقیہ مل کر غریب ثروت بیگم اور عرشاں پر کیا کیا ظلم نہ ڈھاتی ہوں گی۔ دونوں بڑی بیگم کی چہیتی اور فرماں بردار بہوئیں تھیں۔ وہ ان دونوں کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھتی تھیں۔ان کے چار بیٹے عارش، شہاب، شایاب، میشاز تھے اور ایک بیٹی فاطمہ تھی، آٹھویں بیٹے لقمان کی بیوی نصیرہ تھیں۔ان کے دو بیٹے عرفاد اور جاوید تھے اور دو بیٹیاں عمیرا اور نشا تھیں۔مقصود صاحب اور بڑی بیگم کی چار بیٹیاں سلمہ، ناظمہ، شمع اور رعنا تھیں۔سب بہت ہی اعلیٰ خاندانوں میں بیاہی تھیں اور ایک ہی شہر میں رہنے کی وجہ سے ان کا کاشانۂ سیماب میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ان کے بچے ریحان، یاشان، فرخ، رفاق، شامیہ، سویرا، مینا اور تبسم تھے۔

کاشانۂ سیماب کا نام اصل میں مقصود اور خدیجہ بی کے پہلے بچے کے نام سے تھا جو پیدا ہونے کے آٹھ دن بعد ہی ماں کی گود خالی کر گیا تھا۔ بڑی بیگم اس کے غم میں پاگل سی رہیں۔مگر خدا نے جلد ہی ان کی گود ایک بیٹی سے بھر دیں۔اس کے بعد دوسری بیٹی ہی پیدا ہوئی۔ بڑی بیگم اپنے پہلے بیٹے کو نہیں بھول پائیں۔اسی زمانے میں یہ محل نما کوٹھی تعمیر ہوئی۔ دونوں ماں باپ نے اس کو کاشیانۂ سیماب کا نام دے دیا۔اس طرح انہوں نے جیسے مرے ہوئے بیٹے کو واپس پالیا۔

کاشیانۂ سیماب کی تعمیر ہوتے ہی اللہ نے ان کے گھر میں بیٹوں کی پیدائش کا سلسلہ سا شروع ہو گیا جو آٹھ بیٹوں پر جا کر ختم ہوا۔اس کے بعد دو بیٹیاں شمع اور رعنا پیدا ہوئیں۔اس کے

علاوہ اس خاندان کی ایک قابلِ ذکر فرد اور بھی تھیں انّا بی جو دراصل ساجد کی انّا تھیں ۔ بعد میں انہوں نے دوسرے بچوں کو بھی کھلایا اور ان کے بچوں کو بھی۔ وہ واحد شخصیت تھیں جن کو عرشاں اور اس کی ماں سے دلی ہمدردی تھی۔ کبھی کبھی انہیں یہ ہمدردی بہت مہنگی پڑتی تھی۔ دوسری بہوئیں ان کو بھی ذلیل کرنے لگتی تھیں۔

عرشاں ایک عجیب وغریب شخصیت کی مالک تھی۔ ایک عام سی لڑکی مگر نہایت غصہ ور۔ اس کی زندگی میں آنسوؤں کی بہت اہمیت تھی۔ کاشیانۂ سیماب کے سب ہی لڑکے اس کو بات بات پر خفا کرتے اور رلاتے رہتے تھے۔ وہ بات بات میں رونے بیٹھ جاتی تھی۔ سب ہی پریشان تھے کہ وہ اتنا روتی کیوں ہے؟ نہ صورت، نہ سیرت، بات بات پر رونے والی یہاں تک جب ہنستی تھی تب بھی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ رونا اور غصہ تو قیامت لاتا تھا۔ بڑے ابا کے بیٹے صمد اور چچا کے بیٹے نجیف اس سے بہت چڑھتے تھے۔ 'رونی منہ دھونی' کے نام سے سب ہی کزن چڑھاتےتھے ۔اس کی کسی بھی مرد کزن سے نہیں بنتی تھی۔ اصل میں غصہ بھی وہی لوگ دلاتے تھے، رلاتے بھی وہی لوگ تھے۔ اس پر سے اگر ہنسی بھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی تو اس میں عرشاں کا کیا قصور؟ ثروت بیگم الگ پریشان۔ ایک ہی لڑکی تھی وہ بھی ایسی بے تکی۔ ویسے بھی سجاد کی پسند کی شادی ہونے کی وجہ سے ساس سسر انہیں وہ عزت واحترام نہیں دے سکے تھے جو دوسری بہوؤں کے حصے میں آئی تھی۔ ان کو اور عرشاں کو نہ صرف منحوس کے نام سے پکارا جاتا تھا بلکہ ان کے اوپر کافی مظالم بھی ڈھائے جاتے تھے۔ ان کے پاس صرف انّا بی کی حمایت کا کمزور سہارا تھا یا پھر سب لڑکیاں اس کی حمایت یا فیور میں لگی رہتی تھیں۔ بے زبان ثروت بیگم ہر بات، ہر ظلم کا جواب اب خاموشی سے دیتی تھیں۔ ان کا اور بیٹی کا سہارا یہ گھر ہی تو تھا جس کے ایک معمولی سے حصے میں وہ رہ رہی تھیں۔ سب سے تعلق بھی تھا اور نہیں بھی تھا۔ عرشاں کی زبان اور لڑائی کی عادت ایک پرابلم پیدا کرتی تھیں۔ خاندان کے ہر لڑکے سے اس کی لڑائی ہوتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ لڑکیوں سے اس کی بہت دوستی تھی۔ لڑکیوں میں اس کا ایک الگ اور اہم مقام تھا۔ سب ہی اس کو بہت چاہتی تھیں۔ ہر وقت اس کی حمایت بھی کرتی رہتی تھیں۔ لڑکوں سے نفرت اور لڑائی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، شاید سب کی ماؤں نے یہ نفرت ان کے دل میں بھر دی تھی کہ کہیں کوئی عرشاں کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کی مانگ نہ کر بیٹھے اور ایک فضول، بدتمیز، منحوس اور غصیلی لڑکی اپنی ماں کی طرح

ان کے خاندان کا حصّہ بن جائے۔اب آٹھ دس لڑکوں کی فوج ہوتی تھی اور ایک اکیلی عرشاں۔ مقابلہ زبردست تھا مگر وہ بھی کم نہیں تھی۔ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھی۔کیا مجال جو ہار جائے۔کبھی کبھی وہ غصے سے پاگل ہو جاتی تھی،اور اگر یہ آنسو ساتھ نہ دیتے تو شاید وہ پوری دنیا کا تو نہیں پورے گھر کا تہس نہس ضرور کر دیتی۔مگر یہ آنسو باہر آ کر اس کو ناکام کر دیتے تھے،کمزور کر دیتے تھے اور لڑکوں کو فتحیاب کر دیتے تھے۔سب سے زیادہ ستانے اور پریشان کرنے والے صمد اور نجیف تھے۔وہ سب لڑکوں کے لیڈر تھے۔ہمیشہ اس کے خلاف مورچہ بنائے رکھتے تھے۔نفرت پھیلاتے رہتے تھے، اس کی برائیوں میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے رہتے تھے۔کوئی ان کو منع نہیں کرتا تھا بلکہ دادا دادی،ماں باپ،چچا چچیاں،پھوپھیاں سب ہی ان سے بہت خوش ہوتے تھے،جیسے وہ لوگ ان کے دل کی بات کرتے تھے۔اس کو رلانا اور ستانا ان دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔دادا دادی اپنے سب پوتے پوتیوں،نواسے نواسیوں کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے،پیار بھری خوبصورت آنکھ سے۔ مگر ان کی محبت بھری اس ایک آنکھ میں عرشاں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔عرشاں پروا بھی نہیں کرتی تھی۔پیار کا یہ اپنا حق مانگتی بھی نہیں تھی۔ہاں حقارت کی ایک نظر وہ بھی دے دیتی تھی۔غصے کے الفاظ کہنے میں چوکتی بھی نہیں تھی۔سب یہی کہتے تھے کہ ثروت بیگم ایک لڑکی بھی قاعدے سے نہیں پال سکیں اور بے جا لاڈ و پیار میں خراب کر دی۔اس کو تمیز اور سلیقہ بھی نہیں سکھایا۔پتا نہیں کس گھر جائے گی یا ان کی طرح کس گھر کو خراب کرے گی۔ثروت بیگم عرشاں کو بہت سمجھاتیں مگر ہمیشہ وہ یہی کہتی۔''امی! آپ مجھ کو ہی سمجھاتی ہیں۔دوسروں کو نہیں دیکھتی ہیں۔جو میرے ساتھ جیسا ہے میں بھی اس کے ساتھ ویسی ہی ہوں۔''

ثروت بیگم سمجھاتیں۔''بیٹی وہ تمہارے بزرگ ہیں۔تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ سب مجھ کو ہی الزام دیتے ہیں کہ میں تم کو بگاڑ رہی ہوں اور ان کے خلاف بھڑکا رہی ہوں۔''

تو وہ آنسو چھلکاتے ہوئے کہتی۔''امی! آپ ان کی بہو ہیں۔وہ آپ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ٹھیک ہے۔مگر میں ان کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں ان کی بہو نہیں ان کے بیٹے کی بیٹی ہوں۔ان کا خاندان ہوں۔آپ کی رنجش مجھ پر کیوں نکالتے ہیں؟ چچا چچیاں اور ان کے بچے میرے ساتھ برے ہیں ٹھیک ہے مگر دادا دادی کا میں نے کیا بگاڑا ہے۔جو مجھ سے ایک الگ رویہ رکھتے ہیں۔دوسروں کے ساتھ اتنے اچھے ہیں۔میرے ساتھ کتنے برے۔جیسے ان کا دادا دادی

ہونا بے عزتی ہے۔ مگر سچائی کو تو نہیں مٹا سکتے۔ میں ان کی پوتی کہلاتی ہوں، کہلاتی رہوں گی۔ وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مجھے پروا نہیں ہے۔ ہم لوگ منحوس ہیں۔ ان کا بیٹا کھا گئے۔ کتنی واہیات باتیں ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔'' پھر اس کا غصہ شدت اختیار کر لیتا وہ روتی جاتی اور کہتی جاتی۔ ''ہر کوئی ہم سے نفرت کرتا ہے میں بھی سب کی نفرت کا جواب نفرت سے ہی دوں گی۔'' یہ کہتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے اور وہ رونے بیٹھ جاتی۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ صمد اور نجیف اس کو مکاری اور اداکاری کا نام دے کر اس کا خون اور جلاتے تھے۔ جاسیہ، فاطمہ، صغرا، نجیہ وغیرہ لڑکیوں کا گروپ اس سے ہمدردی کرتیں اور سمجھاتیں تو وہ ان کو کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ جاسیہ عرشاں کو بہت چاہتی تھی۔ وہ نہ صرف اس کی کزن تھی بلکہ اس کی کلاس فیلو اور بہت پیاری دوست بھی تھی۔ وہ بھی اکثر اس کو سمجھاتی اور کہتی۔ ''عرشاں! تم بات بات پر رویا مت کرو۔ مجھے تمہارا رونا پسند نہیں ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔''

تو وہ ہنس کر کہتی۔ ''کیا کروں جاسیہ۔ مجھ کو آنسو بہت پسند ہیں۔ آنسو جو ہنسی میں بھی ساتھ دیتے ہیں اور رونے میں بھی۔ غم میں بھی تڑپ اٹھتے ہیں اور خوشی میں بھی ہنس پڑتے ہیں۔ وہ میرے دوست ہمدرد اور غمخوار ہیں۔ سچ پوچھو تو آنسو ہی اس دنیا کی سب سے خوبصورت اور قیمتی شئے ہیں۔ اسی لیے تاج محل کو بھی محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کہا گیا ہے جو وقت کے رخسار پر ٹھہر گیا ہے، رات بھی شبنم کے آنسو روتی ہے جس کو پھول اپنے عارض پر سجا لیتے ہیں، چاند کے آنسو تارے بن کر پورے آسمان پر چھٹک جاتے ہیں، سمندر کے آنسو سیپ میں ٹھہر کر موتی بن جاتے ہیں، بادل پوری کائنات کے آنسو بن کر برستے ہیں، یہ میرے بھی دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ جب میں ہنستی ہوں تو بھی آنکھیں بھگو دیتے ہیں۔ جب میں روتی ہوں تو وہ بھی رو پڑتے ہیں۔ میرے غصے میں آپے سے باہر ہو کر برس پڑتے ہیں۔''

جاسیہ ہنس کر کہتی۔ ''کتنی خوبصورت شاعری کر لیتی ہو۔ واقعی میں تم تو اس شہزادی کی طرح ہو جو جب روتی تھی تو آنکھوں سے موتی نکلتے تھے اور جب ہنستی تھی تو پھول جھڑتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب تم ہنستی ہو تب بھی موتی نکلتے ہیں اور جب روتی ہو تب بھی موتی نکلتے ہیں۔ وہی بیش قیمت موتی جس کو ہم سب نادانی سے آنسو کہتے ہیں۔'' وہ جاسیہ کی بات پر ہنس پڑتی تھی۔

جاسیہ ایک ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی آنکھوں اور ہنس مکھ چہرے کی

مالک تھی۔اس لیے شاید اس کو ہنسنا بہت پسند تھا۔ وہ ہر وقت ہنستی رہتی تھی ۔اس نے ایک دن نجیف کا جملہ بھی سن لیا تھا کہ اس کو ہنستے ہوئے لوگ اور ہنس مکھ چہرے بہت پسند ہیں۔اس کو خوش فہمی ہوگئی کہ نجیف اس کو پسند کرتا ہے اور اس نے درپردہ اس سے اظہارِ عشق کیا ہے۔ وہ بھی نجیف کو پسند کرتی تھی۔بس ایک بات اس کو نجیف کی ناپسند تھی۔اس کی عرشاں سے نفرت اور طرح طرح کے ناموں سے پکارنا۔عرشاں اس کی بہت پیاری دوست تھی۔راز دار تھی۔عرشاں کو نجیف اور صمد سے نفرت اور چڑھ تھی۔ان دونوں کو عرشاں سے۔ جاسیہ نے دونوں کی صلح اور صفائی کرانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔وہ جب بھی کاشیانۂ سیماب آتی عرشاں کو ایک نئی الجھن میں گرفتار پاتی۔عرشاں جو عمیرا،صغرا، فاطمہ اور دوسری لڑکیوں کی طرح سرخ وسفید رنگت اور لازوال حسن کی مالک نہیں تھی مگر وہ ایک جینیس تھی اور بہت زوردار شخصیت کی مالک تھی۔ وہ اپنے اسکول کی بہت مشہور اور ہردلعزیز ہستی تھی۔ ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ ہمیشہ پورے کالج میں ہی نہیں پوری اسٹیٹ میں ٹاپ کرتی تھی۔بچپن سے ہی اپنے کزن کے رویے اور خاندان کے دوسرے افراد کے برتاؤ سے اس کو دنیا کے ہر آدمی سے نفرت ہوگئی تھی۔اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔آخر اس کی امی کو شادی کرکے کون سا سکھ ملا تھا۔شادی کے کچھ عرصے کے بعد ابو کتنی بے مروتی سے دنیا ہی سے چلے گئے اس کو اور ثروت بیگم کو اکیلا ، بے یارو مددگار چھوڑ کر۔اس بھرے پرے کاشیانۂ سیماب میں وہ اکیلی ہی تھیں۔اکیلی غریب ولاچار، دوسروں کے رحم وکرم پر، یا یوں کہنا چاہیے دوسروں سے ذلت اور رسوائی اٹھوا کر جی رہی تھیں۔کبھی کبھی وہ اور جاسیہ جب باتیں کررہی ہوتیں تھیں تو پتا نہیں کہاں سے نجیف اور صمد برآمد ہوجاتے۔ دونوں آوازیں کستے۔''جاسیہ کو یہ روتے ہوئے لوگ کیوں پسند ہیں؟''

جاسیہ جلدی سے جواب دیتی۔''پتا نہیں آپ لوگ کیسی عجیب اور بے تکی باتیں کرتے ہیں۔'' جاسیہ ڈرتی تھی کہیں بات بڑھ نہ جائے اور عرشاں لڑنے کھڑی ہو جائے، مگر عرشاں خاموش نہیں رہتی تھی فوراً جواب دیتی۔''جاسیہ تمہیں ان لوگوں کے دماغ کھسکے ہوئے نہیں لگتے ہیں۔'' پھر ہمیشہ کی طرح بات بڑھ جاتی اور ایک ہنگامہ اور رونا دھونا شروع ہوجاتا۔

کاشیانۂ سیماب میں اچانک شادیاں طئے کرنے کا موسم آگیا۔ نجیف اور جاسیہ کے والدین نے ایک دوسرے کی شادی کی بات چیت چھیڑ دی۔دادا، دادی اس رشتے کو کروانے میں

آگے آگے تھے۔ جاسیہ نجیف کو بہت چاہتی تھی۔ اس کی ہنستی آنکھیں بچپن سے ہی اس کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ نجیف کی ماں رافعیہ چچی اس کو اپنی بہو کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ سب ہی خاندان والے خوش ہوا کرتے تھے۔ جب بھی نجیف عرشاں کو زیادہ پریشان کرتا تو وہ جاسیہ سے کہتی۔ ''نجیف اور صمد پاگل ہیں۔ تم پھنس رہی ہو جاسیہ۔ اب بھی وقت ہے انکار کردو نہیں تو تمہاری زندگی روتے ہوئے کٹ جائے گی۔ ایسے اذیت پسند لوگ بدلتے نہیں ہیں۔ میرے ساتھ بلا وجہ کے لیے ایسا سلوک ہے تو بیوی کو کہاں خوش رکھ پائیں گے۔ صرف عمر بھر رلائیں گے۔'' جاسیہ ہنس کر ٹال جاتی تھی اور سوچتی۔ ''عرشاں بھی کتنی نادان ہے۔ یہ پیار و محبت کو نہیں سمجھتی۔ نجیف اس کو کتنا چاہتا ہے تب ہی تو اس کے ساتھ شادی طئے کروا رہا ہے۔ کہیں چاہنے والے بھی کسی کو رلاتے ہیں۔ وہ تو آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ تڑپ اٹھتے ہیں۔ نجیف نے اس کو تو آج تک نہیں رُلایا۔'' جاسیہ اور نجیف کی شادی طئے ہوگئی بلکہ کاشانۂ سیماب کی ایک رنگین شام کو بہت دھوم دھام کے ساتھ ان کی منگنی بھی ہوگئی۔ جاسیہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا اور نجیف پتا نہیں وہ کتنا خوش تھا۔ صمد کے ماں باپ بھی ان کی شادی طے کردینا چاہتے تھے اور ان کے لیے لڑکی دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ کسی بھی لڑکی کی طرف مائل نظر نہیں آتے تھے۔ ویسے خاندان کی سب ہی لڑکیاں خاص کر صغرا، نجیہ، نشوا، شامیہ، نشابہ سب ہی منتظر تھیں کہ وہ کب اور کس کو اپنائیں گے اور وہ خوشی خوشی ان کی ہو جائیں گی۔ عرشاں دل ہی دل میں ہنستی اور سوچتی، ''ان لڑکیوں کی پسند بھی کیا ہے؟ پاگل کا انتظار کر رہی ہیں، زندگی بھر رونے کے لیے۔''

جب بھی خاندان کے لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوتے وہ وہاں جانے سے گریز کرتی تھی۔ ان سب کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ جہاں آئی، سمجھو لو لڑائی، جھگڑا، ہنگامہ آ گیا۔ اپنا بھی دماغ خراب کرتی ہے اور دوسروں کا بھی، خود تو خیر خراب دماغ کی ہے ہی۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا تھا کہ شروعات صمد اور نجیف کی طرف سے ہوتی ہے۔ سب بدنام اس کو ہی کرتے تھے۔ وہ شریف کے شریف بنے رہتے تھے۔ اب اسی دن کاشانۂ سیماب کی رونق عروج پر تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پیلے گلاب کی خوشبو سے پورا ماحول مہک رہا تھا۔ سب ہی خاندان کے لوگ کاشانۂ سیماب کے خوبصورت لان میں بیٹھے تھے۔ جاسیہ کی فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔ اصل میں جاسیہ کو اپنے ہوم ورک میں عرشاں کی مدد درکار تھی۔ وہ اس کا پروجیکٹ تیار کروا رہی تھی۔ ایک

طرف سب کی مائیں بیٹھی سلائی، بنائی اور بات چیت کر رہی تھیں۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ اندر سے گرم گرم پکوڑے بھی آ رہے تھے۔ صمد اور نجیف بہت زور زور سے بول رہے تھے۔ کانوں میں پڑنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ موضوع عرشاں ہی ہے۔ لڑکے بکے جا رہے تھے اور لڑکیاں ہمیشہ کی طرح اس کی حمایت میں دل و جان لگائے ہوئے تھیں۔ پاس بیٹھی مائیں ناگواری سے لڑکیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ویسے ہی نجیف نے آواز لگائی۔ ''جاسیہ! تم اس بد دماغ، بدتمیز اور روتی لڑکی کے ساتھ کیا کر رہی ہو۔ اس کے رنگ ڈھنگ تمہارے اوپر بھی اثر انداز ہو جائیں گے۔''

جاسیہ نے ناگواری سے کہا۔ ''بس آپ لوگ چپ چاپ بیٹھے رہیے۔ دوسروں کی غیبت سے آپ کو کیا مل رہا ہے؟''

نجیف کی امی رافعیہ نے جاسیہ کی امی رشدہ کی طرف نہایت ناگواری سے دیکھا۔ انہوں نے فوراً جاسیہ کو ڈانٹ کر کہا۔ ''دیکھ رہی ہوں لڑکی! تمہاری زبان بہت تیز ہوگئی ہے۔ صحبت کا اثر واقعی تم کو خراب کر رہا ہے۔''

عرشاں فوراً وہاں سے اٹھ گئی، مگر جاتے ہوئے کہہ گئی۔ ''جاسیہ ایک سمجھدار اور بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کو کوئی صحبت خراب نہیں کر سکتی۔ ہاں نشابہ کو آپ ان بدتمیز لڑکوں کی صحبت سے الگ کر دیجیے۔ وہ ضرور خراب ہو جائے گی۔''

یہ کہہ کر وہ تو وہاں سے چلی گئی۔ رشدہ چچی اور چچیوں نے خوب باتیں اس کو سنائیں۔ جاسیہ کو بھی برابر ڈانٹ پڑ رہی تھی اور وہ کہے جا رہی تھی۔ ''آپ لوگوں نے میرا ہوم ورک کرنا مشکل کر دیا۔ یہ دیکھیے اس نے کتنا بہترین پراجیکٹ تیار کروایا ہے کسی اور کو بھی توفیق ہوئی ہے۔ کل صبح مجھے انعام ملے گا تو سب کو میری قابلیت پر فخر ہوگا۔ آپ لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری قابلیت کس کی رہینِ منت ہے اور میرے فرسٹ آنے میں کس کا ہاتھ ہے۔ وہ ہر لڑکی کی مدد کرتی ہے۔ اگر عرشاں اتنی قابل نہ ہوتی تو آج ہر لڑکی ان لڑکوں کی طرح خراب گریڈ لا رہی ہوتی۔ ہم لوگ کیوں آپ لوگوں کی طرح اس سے بلاوجہ کی دشمنی رکھیں؟ وہ بہت اچھی ہے ہماری بہن ہے، ہماری کزن ہے۔''

لیکن سب ہی چچیاں اور اس کی امی برابر چیخے جا رہی تھیں اور عرشاں کو برا بھلا کہہ رہی

تھیں۔ اگر وہ ٹھہر گئی ہوتی تو ضرور قیامت آ جاتی، ایک بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ سب لڑکے بھی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ صمد اور نجیف ہمیشہ کی طرح آگے آگے تھے۔ وہ نہ صرف رشدہ بیگم سے بدتمیزی کر کے گئی تھی بلکہ لڑکوں اور ان کی ماؤں کو بھی خفا کر کے گئی تھی۔ صمد اور نجیف آگ پر پانی چھڑک رہے تھے۔ جیسے اسی موقع کے منتظر تھے۔ انّا بی جو عرشاں کو بہت چاہتی تھیں اپنے سجاد کی نشانی سمجھتی تھیں۔ ان سے برداشت نہیں ہو سکا وہ کہہ اٹھیں۔ ''ارے کاہے کو بے زبان بچی کا صبر لے رہے ہو، اللہ سے ڈرو تم لوگ۔''

صمد نے ان کو ڈانٹ کر کہا۔ ''بڑی بی! بس خاموش بیٹھی رہو، اگر اس بدتمیز لڑکی کی طرف داری کرنا ہے تو یہاں سے چلی جاؤ۔''

انّا بی بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئیں۔

عرشاں میں یہی تو ایک بات تھی کہ وہ کسی کی غلط بات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بڑا دیکھتی تھی نہ چھوٹا جواب ضرور دیتی تھی۔ جواب بھی اتنا کڑا جو اینٹ کا جواب پتھر بن کر لگتا تھا۔ جہاں وہ لان میں آ کر بیٹھی پورا خاندان اس کو اپنا نشانہ بنا لیتا تھا خواہ مخواہ کے لیے۔ اس کو معلوم تھا ظلم کرنا ظلم سہنا دونوں گناہ ہیں۔ ایک نڈر اور باہمت مسلم کو ظلم کے خلاف آواز ضرور اٹھانا چاہیے۔ تب ہی تو انہیں اللہ کی طرف سے جہاد کا حکم ملا ہے۔ اس کے نزدیک ہر ظلم، ہر غلط بات پر آواز اٹھانا بھی جہاد ہے اور وہ جہاد کر رہی تھی بچپن سے اب تک اور اس کو یقین کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ فتح پائے گی۔ ثروت بیگم چاہے جتنا منع کرتیں سمجھاتیں مگر وہ بے جا مخالفت اپنی اور ان کی ذات کے لیے برداشت نہیں کرتی تھی۔

زندگی کبھی ایک جیسی نہیں چلتی۔ وقت کچھ نہ کچھ تبدیلیاں لا ہی دیتا ہے۔ ایک ہنگامے پر موقوف گھر ہی کہ نہیں زندگی کی رونق بھی ہے۔ کاشیانۂ سیماب میں بہت دن سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ زندگی ایک طرح سے چل رہی تھی۔ مگر کب تک ایک دن اچانک جادیش چچا کی فیملی امریکا سے وزٹ کرنے آ گئی۔ کاشیانۂ سیماب کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ ہلچل بڑھ گئی مگر جادیش چچا کے اکلوتے بیٹے ثوبان کو پتا نہیں اس روتی بسورتی لڑاکا، بد دماغ، معمولی شکل وصورت کی لڑکی میں کیا خوبی دکھائی دی کہ گھر والوں سے اس سے شادی کرنے کا اظہار کر بیٹھے۔ پورے خاندان پر جیسے ایٹم بم گر پڑا۔ قیامت آ گئی، ایک کہرام، ایک ہنگامہ ہوا۔ ہر کوئی

مخالف، ان مخالفت کرنے والوں میں دادا، دادی سب سے آگے تھے۔ صرف لڑکیوں کے گروپ کو چھوڑ کر۔ وہ سب خوش تھیں کہ خاندان کے سب سے اچھے لڑکے نے عرشاں کو پسند کیا۔ سب ہی اپنے ماں باپ کو سمجھا رہی تھیں۔ بھائیوں کو منع کر رہی تھیں۔ مگر لڑکوں کا گروپ کھل کر اس کی برائی اور مخالفت کر رہا تھا۔ گھر کے بزرگوں نے خاندان کی دوسری خوبصورت لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ مگر ثوبان ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ کوئی پرائی تو نہیں ہے جیسے اور لڑکیاں آپ کی پوتیاں، بھتیجیاں اور بھانجیاں ہیں، ویسے ہی وہ بھی ہے۔ وہ اپنے مرحوم سجاد چچا کی بیٹی ہے جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ دوسری خوبصورت لڑکیوں کی شادیاں آپ لوگ آپس میں کر لیجیے۔ ویسے بھی ان کو دوسرے اچھے لڑکے مل جائیں گے، مگر مجھے تو وہ بد دماغ، معمولی لڑکی ہی پسند ہے۔ مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔''

سب ہی نے معصوم ثروت بیگم کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ بیٹی کے ذریعے ایک بار پھر خاندان کا سب سے اچھا لڑکا ہڑپ لیا۔ وہ اس کام میں ماہر ہیں۔ پہلے بھی یہ کام کر چکی ہیں۔ سجاد جیسا ہیرا ہتھیا لیا تھا۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی منحوسیت سے اس کو جینے نہیں دیا۔ ایک بار پھر اسی خاندان کو نشانہ بنا کر اکلوتے اور ہونہار بیٹے کو چھین لیا۔ پتا نہیں کیا جادو ٹونا، دعا تعویذ کر دیا ورنہ ان کی اس ذلیل لڑکی کو کون پوچھتا۔ لڑکیوں کی مائیں تو آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ انہوں نے سب سے زیادہ ان کو برا بھلا کہا، عرشاں نے سب کا مقابلہ کیا اور کہا۔ ''اپنے لاڈلے پوتے، بھتیجے اور بھانجے کو منع کر دیجیے۔ میری طرف سے انکار ہے۔'' وہ عادت کے مطابق رو رو کر جانے اور کیا کیا کہے جا رہی تھی ثوبان سنتے جا رہے تھے۔ نجیف اور صمد اس کو یقین دلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''کس چکر میں پڑے ہو یار! چھوڑو۔ یہی اس کا اصلی روپ ہے۔ یہ بہت غلط قسم کی لڑکی ہے۔ بچپن سے ہم سب کا ناطقہ بند کیے ہے۔ رو رو کر سب کچھ کہہ جاتی ہے پھر بھی مظلوم کی مظلوم بنی رہتی ہے۔''

ثوبان کو صمد اور نجیف کی باتیں بہت بری لگیں۔ انہوں نے کہا۔ ''تم دونوں کو اس معصوم اور مظلوم لڑکی سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اس کو بدنام کرنے اور رلانے میں تم دونوں کا ہاتھ ہے مگر کیوں؟'' دونوں چپ ہو گئے۔ واقعی میں کوئی وجہ نہیں تھی یا ہو سکتا ہے کہ کوئی وجہ ہو جس کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے ہوں یا خود نا آشنا ہوں۔ بچپن سے ایک ہی گھر میں رہتے رہتے وہ ان کی ناپسندیدہ شخصیت بن گئی تھی پورے خاندان میں اپنے ماں باپ کے پاس۔ جہاں وہ جاتے تھے

سب عرشاں اوراس کی ماں کے خلاف زہر اگلتے تھے۔ وہ زہر کو تو نہیں ڈھونڈھ پائے مگر اگلنے میں آگے نکل گئے۔ مگر کیوں؟ دونوں کے پاس اب بھی کوئی جواب نہیں تھا سوائے خاموشی کے۔ ہزاروں مخالفتوں کا سامنا کرنے کے باوجود ثوبان عرشاں سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ ان کے والدین بھی یہی چاہتے تھے اور وہ ان کے ساتھ تھے۔ اس کے کچھ دن بعد نجیف اور جاسیہ کی بھی شادی ہوگئی۔ ثوبان اپنے والدین کے ساتھ عرشاں کو لے کر امریکا چلے گئے۔ کاشیانۂ سیماب کی زندگی پھر نارمل طریقے سے چلتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

بہت عرصے کے بعد عرشاں امریکا سے واپس آئی بہت خوش وخرم۔ اب نہ تو ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اور نہ روتے ہوئے۔ آنسوؤں سے اب اس کا دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔ ثوبان اتنے اچھے رفیق حیات ثابت ہوئے تھے کہ آنسوؤں کا وجود ہی اس کی زندگی سے ختم ہو گیا تھا۔ واقعی میں اگر اچھا شوہر مل جائے تو زندگی میں غم وآنسوؤں کا وجود نہیں رہ جاتا۔ اس کا جذباتی پن غائب ہو گیا۔ اب وہ بات بات میں ہنسنے والی عرشاں تھی۔ ماحول کی تبدیلی نے اس کی شکل وصورت بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ معمولی صورت وشکل کی لڑکی اب بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ اس کا اخلاق بات چیت کا ڈھنگ سب بدل گیا تھا۔ ثوبان صحیح معنوں میں ایک گوہر نایاب پا گئے تھے۔ ان کی تیز نظروں نے اس بیش قیمت ہیرے کو پہچان لیا تھا جس کی صورت اور سیرت ماحول کی گرد میں چھپی ہوئی تھی ذرا سی گرد صاف ہوگئی تو وہ اپنی آب وتاب کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ کاشیانۂ سیماب کے لوگوں کا رویہ اب اس کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اگر نہیں بھی بدلا تھا تو اس کو پروا نہیں تھی کیونکہ ثوبان ،اور جادیش چچا کا پیار اور مضبوط سہارا اس کے ساتھ تھا۔ اس کی ماں کے ساتھ بھی ویسے ظلم نہیں ہوتے تھے۔ کچھ لوگ اس سے مرعوب دکھائی دیتے تھے۔ صمد اب خاموش خاموش ہو گئے تھے۔ اب کوئی ٹارگٹ جو نہیں رہا تھا ان کے نشانے کے لیے۔ نہ اس نے صمد سے بات کی اور نہ صمد نے اس سے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی عرشاں کو یاد آجاتا تھا کہ یہ شخص اس کو کتنا کرب دیتا تھا، کتنا ٹارچر کرتا تھا۔ اس کو ہمیشہ روتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اب وہ ہنستی ہے اور بات بات پر روتی نہیں تو یہ شخص کتنا مایوس دکھائی دیتا ہے جیسے اس کی ہنسی اس کے چہرے سے چھین لینا چاہتا ہے مگر اب یہ خود اتنا غمزدہ کیوں ہے؟ جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو۔ بہت بیمار رہنے لگا ہے۔ سنا ہے کہ کسی کے عشق نے دنیا سے بیگانہ کر دیا ہے کسی کی بے وفائی نے دل میں چھید کر دیے

ہیں۔ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں صرف وقت کا انتظار ہے۔

نجیف بھی اپنی پسند کی شادی سے خوش نہیں تھا۔دیوانہ سا لگتا ہے اس کے پاس فیملی ہے وہ مر نہیں سکتا۔صرف مرنے کی آرزو کرسکتا ہے۔جینے کے لیے مجبور ہے۔مگر صمد مر تو سکتا ہے بے فکری کی موت۔وہ بے فکری کے ساتھ دل کے زخم پر موت کا پھاہا رکھنا چاہتا تھا۔اس کا اپنا دل ان کے لیے نہ پسیجا۔اس نے سوچا، خدا نے کیسی سزا دی کسی بے قصور کو ستانے کی۔سچ ہے خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔دوسروں پر ظلم وستم ڈھاتے وقت پتا نہیں لوگ اللہ کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ ان دونوں کی طرف سے اس کا دل جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔سوچیں پتھر سے بھی سخت ہو گئیں۔اس کو اگر غم تھا تو جاسیہ جیسی معصوم ومظلوم لڑکی کا۔ہر وقت ہنسنے مسکرانے والی جاسیہ اب بدل گئی تھی جیسے عرشاں کہا کرتی تھی کہ واقعی نجیف نے اس کی زندگی آنسوؤں میں بدل دی تھی۔اب وہ ہر وقت رونے بسورنے والی لڑکی بن گئی تھی۔جیسے عرشاں کی جگہ جاسیہ نے لے لی ہو۔جاسیہ کو رونے بسورنے سے جتنی نفرت تھی۔نجیف اپنے برے سلوک سے ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رکھتا تھا جیسے عرشاں کی کمی پوری کر رہا ہو۔نجیف کو تو آنسوؤں سے نفرت تھی۔پھر جاسیہ کی زندگی میں آنسو کیوں؟ جب وجہ معلوم ہوئی تو عرشاں حیران رہ گئیں۔جاسیہ نے بہت عجیب بات بتائی لیکن اس نے یقین نہیں کیا۔جاسیہ نے بتایا کہ اصل میں نجیف اور صمد عرشاں سے نفرت نہیں کرتے تھے پوشیدہ طور پر اس سے محبت کرتے تھے۔دونوں دوست ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے عشق سے ناواقف تھے۔صرف جاسیہ کو معلوم ہو گیا اور وہ عرشاں کا انتظار بہت بیتابی سے کر رہی تھی۔اس کی زندگی کا یہ رخ بتانے اور دکھانے کے لیے بے چین تھی۔ان دونوں کی نفرت دراصل چاہت کا رنگ تھی، چاہت کا ہی انوکھا انداز تھی۔وہ دونوں جھوٹ موٹ کی نفرت ظاہر کرتے تھے۔ان کی نفرت، ایک دھوکا، ایک فریب تھی۔مگر وہ اتنی بڑی فلسفی نہیں تھی وہ تو ایک عام سی لڑکی تھی جو نفرت کو نفرت ہی سمجھتی تھی اور سمجھتی رہے گی۔اتنی عجیب وغریب چاہت اور محبت کی وجہ سے بے چاری جاسیہ اس کو اپنا پرانا انداز لگی تھی ہر وقت روتی سسکتی ہوئی۔مگر پھر بھی اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔اس نے جاسیہ کو جھٹلانے کی کوشش کی اور کہا۔''جاسیہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ہم لوگوں کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔تم یہ وہم اپنے دل سے نکال دو۔''

جاسیہ نے کہا۔''اب بھی تم کو ثبوت کی ضرورت ہے۔نجیف کی محبت کا ثبوت میں خود

ہوں اور میرے آنسو ہیں۔صمد کی محبت کا تو بہت ٹھوس ثبوت ہے میرے پاس۔تم دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی اور وہ ثبوت ہے صمد کی ڈائری جو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گئی ہے اور میں نے تمہارے لیے چھپا کر رکھ دی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گی اور نہ کرنے کی بات ہی تھی۔'' یہ کہہ کر جاسیہ نے صمد کی ڈائری اس کے حوالے کر دی اور وہ پڑھنے لگی۔

پہلا صفحہ

عرشاں جب روتی ہے تو اس کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔دل چاہتا ہے کہ بس دیکھتا ہی رہوں۔عرشاں بھی عجیب ہے۔جب ہنستی ہے تو آنسو، روتی ہے تو آنسو، غصہ ہوتی ہے تو آنسو۔ بات بات پر روتی ہے۔اس کے آنسو نہیں موتی ہیں۔دل چاہتا ہے کہ سمیٹ لوں اپنے دل کے دامن میں۔کاش! میں اس کو اپنا کندھا دے سکتا رونے کے لیے تاکہ اتنا روئے کہ پھر رونے کی ضرورت نہ پڑے۔اس کا یہ انداز یہ انوکھا انداز بہت دلکش ہے۔دل چاہتا ہے کہ دیکھتا رہوں، دیکھتا رہوں اور یہ دیکھنا کبھی بھی ختم نہ ہو۔تب ہی تو اس کو بات بات پر غصہ دلاتا ہوں اور اس کی یہ ادا، یہ انداز سامنے آتا ہے۔وہ سمجھتی ہے کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں مگر یہ نہیں جانتی کہ نفرت ہی تو محبت کا آغاز اور انجام ہے۔عرشاں میری محبت کو نہیں سمجھے گی۔صرف میری نفرت کو دیکھتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ کون بلاوجہ کسی پر نفرت بھی لٹاتا ہے۔سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نفرت نہیں انداز محبت والفت ہے۔صرف میں سمجھتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ بیل منڈھے کبھی نہیں چڑھے گی۔میرے ابا اماں کی نفرت، میرے دادا، دادی کی نفرت، مجھ جیسے چہیتے بیٹے اور پوتے کو اپنی من پسند چیز حاصل نہیں کرنے دے گی۔اس سے نفرت کرنے کا میرا انداز ہی تو ان لوگوں کو پسند ہے۔میری نفرت ہی تو اس کے قریب لاتی ہے ورنہ محبت تو اب تک مجھ کو اس سے دور بہت دور لے گئی ہوتی، لیکن وہ اب بھی میری پہونچ سے بہت دور ہے شکل وصورت معمولی مگر اداؤں کا جادو زبردست جو سیدھا دل پر وار کرتا ہے۔

کچھ صفحوں کے بعد

دنیا اور خود میں نے اس کو بہت ستایا ہے۔میرا ستانا تو ایک شرارت اور ایک مذاق تھا۔ کاش وہ اس شرارت، اس مذاق کو سمجھ سکتی اور میں اس کو اپنا دل چیر کر دکھا سکتا کہ اس میں وہی ہے۔

میں انتظار کر رہا ہوں شاید زندگی میں ایسا موڑ، ایسا وقت آجائے جب میں اس کی حمایت کر سکوں اس کو اپنا سکوں۔ انتظار بہت طویل ہے جو ختم نہیں ہو رہا ہے۔ مخالفت بڑھتی جا رہی ہے کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرا بویا ہوا بیج میرا مذاق، میری شرارت بہت سیریس ہوگئی۔ وہ میری پہونچ سے بہت دور ہوتی جا رہی ہے۔ کاشیانۂ سیماب کی دیواریں صرف میرے غم، میرے راز سے آشنا ہیں۔ کاش! ان کی زبان ہوتی تو وہ میرے پیار کی داستان اس کو بتا سکتیں، میرے دل کا حال پہنچا سکتیں اور میری آہوں کو سنا سکتیں۔ مگر یہ دیواریں بہت سخت ہیں بالکل اس کے دل کی طرح۔

آخری صفحہ

اب تو ایک رقیب بھی پیدا ہو گیا ہے اس نے ہیرے کو پہچان لیا ہے۔ میں نے بچپن سے ہی اس کی ہر خوبی چھپا دی تھی کہیں کوئی اس کو مجھ سے چھین نہ لے۔ چھیننے والوں میں ہمت ہونی چاہیے۔ آج ثوبان نے اپنی ہمت دکھا دی۔ میری محبت دیکھتی رہ گئی ماں باپ، دادا، دادی کا خوف بن کر......ثوبان اس کو لے گیا دور بہت دور۔ وہ بھی خوشی خوشی چلی گئی مجھ بیدرد کی دنیا سے۔ میرا دل ناسور ہو گیا۔ اس میں چھید ہو گئے۔ میری آنکھیں کبھی نہیں روئی تھیں۔ شاید اس کے سارے آنسو میری آنکھوں میں سما گئے۔ وہ ہمیشہ ہنستی رہے۔ مسکراتی رہے اس کے بدلے میں میری آنکھیں روتی رہیں۔ یہی تو اس کی یاد کا نذرانہ ہے اس کی جدائی کا تحفہ ہے۔ صرف آنسو......
میری آنکھوں سے برستے آنسو......!

وہ ڈائری پڑھ رہی تھی اور جاسیہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ ’’دو انوکھے عاشق تمہاری زندگی میں تھے جن کو نہ تم سمجھ سکیں نہ میں اور نہ یہ دنیا۔ ایک نے مجھ بے گناہ کی ہنسی چھین کر میری ہنستی آنکھوں میں آنسو بھر دیے صرف تمہاری ادا دیکھنے کے لیے۔ دوسرے نے اپنے دل کو چھید کر اپنی آنکھوں میں خون کے آنسو بھر لیے تم کو ہنستا مسکراتا دیکھنے کے لیے۔‘‘

ڈائری کا آخری صفحہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا، واقعی جاسیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے آنسو بٹ گئے دو حصوں میں اور وہ خود شاید ان سے وقتی طور پر نجات پا گئی، مگر کسی نے آنسوؤں سے بھی نجات پایا ہے کبھی۔ ٹپ اسی وقت اس کی آنکھ سے آنسو گرا اور ڈائری کے کاغذ پر لکھے آنسو میں جذب ہو گیا۔

◆÷◆

سرخ جوڑا

باہر بہت سخت طوفان تھا۔

حویلی کے اندر بھی ہوا کے تھپیڑے دل کو دہلائے دے رہے تھے۔ بادلوں کے گرجنے کی خوف ناک آوازیں، تیز ہوا اور پانی برسنے کا شور مل کر جنگ کا سماں پیش کر رہے تھے۔ بجلی کی چمک پل بھر کے لیے نور سے نہلا دیتی تھی مگر پھر وہی گھنگھور اندھیرا رہ جاتا تھا۔ یہ سب چیزیں سُبنا کو ڈرا رہی تھیں۔ اتنی بڑی حویلی میں وہ اکیلی تھی۔ دادی ماں کو اس نے نیند کی دوا دے دی تھی۔ وہ اب کسی اور ہی دنیا میں میں جا پہونچی تھیں جہاں سے ہوش و حواس کی واپسی ناممکن تھی۔ برستا پانی، گرجتا بادل، کڑکتی بجلی ہی کیا کم تھی اس کے ساتھ دادی ماں کے زوردار خراٹے ماحول کو اور بھی خوف ناک بنا رہے تھے جیسے گھر میں ہزاروں بھوت گھس آئے ہوں۔ درختوں کے سائے بھی چمکتی بجلی میں بھوت کی شبیہ لگ رہے تھے۔ وہ ڈر سے کانپ رہی تھی۔ ایسے میں زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز تو اور بھی دل کو دہلا رہی تھی۔

''اتنی رات میں اور وہ بھی اتنی طوفانی بارش میں کون یہاں آسکتا ہے؟'' یہ سوال اٹھنا لازمی تھا۔ عام دنوں میں بھی یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ ہر وقت موت جیسا سناٹا چھایا رہتا تھا۔ مالی حالت کی خرابی کی وجہ سے نوکر نکال دیے گئے تھے۔ کبھی کبھی گاؤں کی عورتیں حال چال دریافت کرنے آجاتی تھیں۔ اب وہ بھی نہیں آرہی تھیں۔ دادی ماں نے ان کا آنا بھی بند کر دیا تھا کہ کہیں حویلی کی زبوں حالی کا قصہ گھر گھر نہ پہونچ جائے۔ یہ حویلی، یہ زمین، یہ جائیداد اپنی کہاں رہی تھی۔ دادی ماں کی آن کی نظر ہو گئی تھی۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھی۔ اس نے اسی سال انگلش میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کیا تھا۔ وہ چاہتی تو حویلی میں ہی اپنا اسکول کھول سکتی تھی مگر دادی ماں کی اونچی ناک کے کٹنے کا ڈر تھا۔

دادی ماں کے دونوں بیٹے اپنی عیاشیوں اور چال چلن کی وجہ سے ایک ایک کر کے ختم

ہو چکے تھے۔ حویلی اور ساری جاگیریں مہاجن کے حوالے کر چکے تھے۔ دونوں بہوئیں سگی بہنیں تھیں۔ دادی ماں کی سگی بھانجیاں بھی تھیں جو کہ سُبنا کی ماں اور خالہ تھیں۔ اس کی اپنی ماں کو تو ابا کا کردار کھا گیا تھا۔ بڑے ابا کو ان کا اپنا کردار نگل گیا تھا۔ یہ سب واقعات اس کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے کے تھے۔ اس حویلی میں بس ایک کہانی رہ گئی تھی۔ اس کی خالہ کی کہانی جو اس گھر کے ایک آدمی کے ساتھ شادی کر کے حویلی کی سب سے قیمتی چیز چرا کر چلی گئی تھیں۔ شاید وہ کوئی قیمتی ہیرا تھا یا بہت ہی نایاب چیز۔ اس نے ہمیشہ دادی ماں کو جس کا ماتم کرتے ہوئے پایا تھا۔ اس شئے کے لیے روتا اور خالہ کو ہمیشہ کوستا ہوا بھی دیکھا تھا۔ پھر بھی سُبنا کو خالہ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ کوئی بھی نفرت نہیں تھی۔ اس کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب اس کی اپنی بن گئیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی طرح سسکتی اور تڑپتی ہوئی یہاں نہیں پڑی تھیں۔ ان میں اتنی تو ہمت تھی کہ وہ دادی کی کوری ہڈی کی روایات سے نکل گئی تھیں۔ اس کی طرح بے بس اور لاچار تو نہیں رہی تھیں، بس اس کو ان سے شکایت تھی تو اتنی کہ وہ حویلی کی قیمتی چیز کو کیوں لے کر گئیں۔ وہ قیمتی ہیرا جو دادی ماں کو سب سے زیادہ پیارا تھا۔ ان کی جان تھا۔ اس کو چرانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی چیز سُبنا کو کمزور کر دیتی تھی، ورنہ وہ دادی ماں کے سامنے خالہ کے قصیدے پڑھتی دکھائی دیتی۔ ان کی نفرت میں محبت کے چراغ جلا دیتی۔ اس کو اپنی پڑھائی کے لئے بھی تو کبھی جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔

اس کو یاد تھا کہ وہ بچپن میں کتنی تنہا تھی۔ حویلی میں صرف وہ تھی، دادی ماں تھی اور نوکر چاکر تھے۔ دادی ماں بھی اس کا کہاں تک ساتھ دیتیں۔ وہ اسکول بھی نہیں جا رہی تھی۔ بس پاگلوں کی طرح حویلی میں گھوما کرتی تھی۔ صرف اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اپنے دماغ میں اس نے پتا نہیں کتنے خیالی دوستوں کو جمع کر لیا تھا یا پھر باغ کے کسی گوشے میں بیٹھ کر آسمان کو دیکھا کرتی تھی۔ آسمان پر دوڑتے بادل اس کو بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ان بادلوں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ ایک دلچسپ تماشے کی طرح اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔ وہ اس کے دل کو کتنی راحت دیتے تھے۔ وہ ان کو دیکھتے ہوئے ذرا بھی نہیں اُکتاتی تھی۔ کیسے کیسے رنگ اور شکلیں بناتے تھے۔ کبھی سفید دکھائی دیتے تو کبھی سیاہی مائل ہو جاتے تھے۔ شام کے وقت لال، نیلے اور پیلے ہو جاتے تھے۔ ایک دن دادی ماں نے دیکھ لیا اور بولیں۔ ''سُبنا، گھنٹوں سے آسمان کو کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''دادی ماں! میں آسمان کو نہیں بادلوں کو دیکھ رہی ہوں جو سفید سفید روئی کے گالوں کی

طرح نظر آتے ہیں۔ کبھی دھیرے دھیرے چلتے ہیں تو کبھی ٹھہر جاتے ہیں اور کبھی بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی بہت خوبصورت گڑیوں میں بدل جاتے ہیں۔ کبھی ٹیڈی بیئر بن جاتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر تھام لوں۔ کبھی جوکر بن جاتے ہیں اور مجھے خوب ہنساتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ میرے دادا ابا ہیں جو مجھے اشارے سے بلا رہے ہیں۔ کبھی مجھے اپنی امی دکھائی دیتی ہیں جیسے جنت سے نکل کر بادلوں پر کھڑی ہوگئی ہوں۔ صرف میرے لیے اور مجھے پیار سے دیکھتی ہوئی بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی امی اور ابو دونوں ایک ساتھ ہوتے ہیں، دونوں مجھے دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں اور بادل بن کر تیزی سے بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''سُبنا اب تم اسکول جایا کرو۔''

دادی ماں چونک پڑی تھیں۔ واقعی یہ سُبنا کا اسکول جانے کا زمانہ تھا۔ اس کو ہنسنے کھیلنے کے لیے اپنے ہمعمر بچے چاہیے تھے۔ پھر دادی ماں نے دوسرے شہر کے سب سے بڑے اور سب سے مشہور انگلش اسکول میں اس کا داخلہ کروا دیا تھا۔ اس کو دادی ماں کو اکیلے چھوڑنے کا غم تھا مگر ویران حویلی سے جانے کی خوشی بھی تھی۔ ہاسٹل میں بھی وہ اکثر گھنٹوں دنیا سے بے نیاز ہوکر بادلوں کو دیکھا کرتی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کو پاگل کہتی تھیں مگر وہ پروانہیں کرتی تھی۔ اپنا شغل جاری رکھتی، بس دادی ماں کی یاد کے موتی ان میں پرو دیتی تھی۔ وہ اکثر بادلوں سے کہتی۔ ''میری دادی ماں کا خیال رکھنا۔''

سینئر کیمبرج کرنے کے بعد وہ پھر گھر بٹھالی گئی۔ دادی ماں اب اس حیثیت میں نہیں تھیں کہ اس کو آگے پڑھاتیں۔ وہ اب بڑی ہوگئی تھی۔ پندرہ سال کی ہاسٹل کی زندگی کے بعد حویلی کی یہ ویرانی اسے اور بھی بری لگتی تھی۔ جبکہ ہاسٹل کے اندر اور باہر ہر طرف زندگی تھی۔ اس کے کمرے سے سڑک پر چلتے ہوئے لوگ دکھائی دیتے تھے۔ ٹریفک کا شور تھا، گہما گہمی تھی۔ دور ندی کا چمکتا ہوا پانی دکھائی دیتا تھا۔ شام کے وقت ڈوبتا سورج کتنا خوبصورت لگتا تھا۔ اس کے اندر کا آرٹسٹ جاگ جاتا تھا۔ وہ پینٹنگ اور ڈرائنگ بنانے لگتی تھی، اس کی بنائی ہوئی ڈوبتے سورج کی پینٹنگ مقابلے میں اوّل آئی تھی۔ وہ کبھی کبھی شاعری بھی کرتی تھی۔ ہاسٹل کی دوسری سائیڈ پر ہرے بھرے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ چشمہ بہتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چشمے پر جھکے ہوئے اُودے اُودے پھول کتنے دلکش لگتے تھے۔ قوس قزح سے بنا ہوا گیٹ ہمیشہ خوش آمدید کہتا ہوا دکھائی دیتا

تھا۔ایک دلکش زندگی تھی۔خوبصورت مناظر اور زندگی سے بھر پور۔وہ سوچا کرتی تھی کہ وہ ایسی ہی کسی جگہ پر رہے گی جہاں زندگی ہوگی، سڑک پر چہل پہل ہوگی۔دور سمندر ہوگا یا ندی بہتی ہوگی جس میں رنگ برنگی کشتیاں چلتی ہوں گی۔زندگی میں جمود کو توڑتی، ہلچل مچاتی ہوئی۔دوسری طرف ہرا بھرا پہاڑ، چشموں، جھرنوں اور پھولوں کا حسن لیے ہوگا۔

مگر افسوس، خیال خیال ہی رہا۔وہ اپنی ادھوری تعلیم کے ساتھ واپس آ گئی۔اس ویران حویلی میں اس کے باہر کی دنیا کیسی تھی اس کو کچھ پتا نہیں تھا کیونکہ اس حویلی کی عورتیں باہر نہیں دیکھ سکتی تھیں۔صرف آسمان یا باغ کا ڈھکا ہوا گوشہ ہی دیکھ سکتی تھیں۔محسوس کر سکتی تھیں۔دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی مگر اس حویلی میں رہنے والوں کی دنیا وہی تھی جو ان کے بزرگوں کی تھی۔حویلی اب کچھ اور بھی ویران لگنے لگی تھی۔اس کو یہ ویرانی اور بھی بری لگتی تھی۔اب تو حویلی میں آنے جانے والوں کا سلسلہ بھی کم ہو گیا تھا۔دادی ماں بھی کچھ بیمار رہنے لگی تھیں۔اب وہ تھی اور آسمان پر دوڑتے بھاگتے بادل۔اچانک بادل دیکھتے دیکھتے وہ رو پڑتی تھی۔ایک دن دادی ماں نے دیکھ لیا تو اسے پھر سے پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔

اب وہ ایم اے کرنے کے بعد دادی ماں کی بیماری کی وجہ سے واپس آ گئی تھی۔اس کو اپنے اسکول میں ہی نوکری مل گئی تھی اور ساتھ میں اس کا پی ایچ ڈی کرنے کا بھی ارادہ تھا۔اسے اپنا بوجھ خود اُٹھانا تھا، دادی ماں کا کیا بھروسہ کب چل دیں۔جب وہ آئی تو دیکھا دادی ماں واقعی بہت بیمار تھیں۔اب وہ اتنی خود غرض بھی نہیں تھی کہ ان کو اکیلا اور لاوارث چھوڑ دیتی۔آخر دادی ماں نے ہی اس کو ماں اور باپ بن کر پالا تھا بلکہ وہ اس کا پورا خاندان تھیں۔اس کی کائنات تھیں۔اس کے لیے ایک مضبوط ستون، ایک سائبان تھیں۔

وہ اب پھر پہلے کی طرح تنہا اور اداس تھی۔وہ اب بھی بادل دیکھا کرتی تھی۔اب بھی اس کو امی اور ابو کی شکلیں بادلوں میں دکھائی دیتی تھیں۔جن کو اس نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔دادی ماں سوچتی تھیں کہ کوئی رشتہ آ جائے گا تو اس کی شادی کر دیں گی۔وہ رشتہ جس کا ان کو انتظار تھا، نہیں آیا۔وہ رشتہ جو ویران حویلی کو پھر سے آباد کر دیتا۔سُبنا کو دادی ماں کو اکیلا چھوڑ کر کہیں اور نہ جانا پڑتا۔اب بادل دیکھ دیکھ کر دل کتنا ویران ہو جاتا تھا۔یہ ہی بادل بچپن میں کتنا مزہ اور دل کو سکون دیتے تھے، اب الجھن بن گئے تھے۔کبھی کبھی یہ بادل غائب ہو جاتے تھے۔نظر نہیں آتے تھے۔

صرف نیلا شفاف آسمان رہ جاتا تھا اور نیلے آسمان سے اس کو دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ بادل سفیدی سے سیاہی میں بدل جاتے تھے۔ سیاہی میں بدلا ہوا ان کا انداز کتنا خوفناک ہوتا تھا۔ اُس دن بھی وہ روئی کے گالوں جیسے بادلوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جو ہوا کے کندھوں پر اڑے چلے جا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے رنگ بدلنا شروع کر دیا، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ایک جگہ جمع ہونے لگے، پھر خوفناک طوفان میں بدل گئے۔ گرجنے برسنے اور چمکنے لگے۔ پوری رات کو خوفناک بنا گئے۔

طوفان اب بھی اپنے عروج پر تھا۔ حویلی کا دہشت زدہ ماحول اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتی۔ وہ برابر یہ ہی سوچے جا رہی تھی۔ اس کے پاس کتنی اچھی نوکری تھی۔ وہ دادی ماں کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی اور نہ ہی ان کے علم میں لا کر نوکری کر سکتی تھی، اسی لیے اس نے پی ایچ ڈی جوائن کر لی تھی تاکہ دادی ماں سمجھیں کہ وہ پڑھائی میں لگی ہوئی ہے۔ دادی ماں کے خاندان میں بھوکا مر جانا عیب نہیں تھا لیکن اگر کوئی کنواری لڑکی نوکری کرے تو یہ بہت بڑی برائی سمجھی جاتی تھی۔ اگر یہ برائی یا عیب سُبنا میں پیدا ہو جاتا تو اس کی شادی کیسے ہوتی۔ دادی ماں کتنے مغالطے میں تھیں جبکہ اس سے شادی کرنے کون آ رہا تھا؟ کوئی کوری خاندانی ہڈی خاندان میں بچی کہاں تھی؟ جب خود ان کا سگا بھتیجا کوری ہڈی میں شامل نہیں تھا جس کے ساتھ خالہ دوسری شادی کر کے چلی گئی تھیں۔ آج وہ ایک حقیر چیز تھیں۔ صرف اس لیے کہ بھتیجے کی ماں کی غلطی یہی تھی وہ ان کے خاندان کی نہیں تھیں۔ غریب گھر کی تھیں اور ان کے بھائی سے لو میرج کر بیٹھی تھیں۔ ان کا بھتیجا جو خالہ کا بھی کزن تھا ان کا ہمدرد بن گیا۔ ایک دن کھوکھلی حویلی کے کھوکھلے خیالات سے ان کو نکال کر لے گیا۔ دادی ماں نے پھر ان سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ ہی سُبنا نے کبھی ان کو دیکھا۔ اب گھر کیسے چل رہا تھا؟ دادی ماں کا علاج کیسے ہو رہا تھا؟ یہ صرف سُبنا ہی جانتی تھی۔

دادی ماں نے خوشحالی کے دنوں میں کتنے ارمان سے اس کے لیے شادی کا سرخ جوڑا بنوایا تھا اور ایک الماری میں وہ سرخ جوڑا بہت سے قیمتی زیوروں کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ وہ سب خاندانی زیور تھے۔ اب وہاں صرف وہ جوڑا رہ گیا تھا۔ سارے زیور ایک ایک کر کے غائب ہو چکے تھے۔ وہ منہ چڑھا مہاجن جو ساری زمین و جائیداد کھا گیا تھا، حویلی کی عزت بچانے کے لیے اب

وہ ہی سارا قیمتی زیور بھی ایک ایک کر کے کھا گیا تھا۔ اس بار اس کام کو سُبنا نے کیا تھا۔ دادی ماں کی لاعلمی میں ان کی جان بچانے اور گھر کو چلانے کے لیے۔ اب صرف وہ سرخ جوڑا ایک حسرت لیے پڑا تھا جس میں سچے موتیوں، ہیرے جواہرات اور سونے کا کام تھا۔ وہ اس گھر کی اکلوتی شہزادی کا ارمان تھا۔ دادی ماں تو بستر پر تھیں۔ چلنے پھرنے سے مجبور تھیں۔ بڑی مشکل سے تھوڑا بہت چل پاتی تھیں۔ مہاجن نے ان پر ترس کھا کر ان کی آن قائم رکھنے کے لیے یا اس کو بٹا لگنے سے بچانے کے لیے اس حویلی میں رہنے دیا تھا۔ دادی ماں اس حویلی میں دلہن کا سرخ جوڑا پہن کر آئی تھیں۔ ان کا جنازہ بھی اسی حویلی سے عزت کے ساتھ نکلنا چاہیے۔ اس کے بعد سُبنا کا کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ دادی ماں کی موت کے دوسرے ہی دن حویلی خالی کرنی تھی۔ حویلی کی چھت دادی ماں کے دم سے تھی اور وہ ہر حالت میں ان کا دم رکھنا چاہتی تھی۔ ان کی دن رات خدمت کر کے۔ ان کا بیدم ہونا اس کی زندہ لاش اٹھوا دے گا۔ دور دور تک کوئی بھی روشنی کی کرن نہیں تھی۔ صرف اندھیرا تھا۔ ایک گھنگھور اندھیرا، آج کی رات جیسا۔ بجلی وغیرہ سب طوفان لے گیا تھا۔ گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ چمکتی بجلی کی پل بھر کی روشنی تو اور بھی دل کو دہلانے والی تھی۔ چاروں طرف اس کو بھوت دکھائی دے رہے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے تو اس کی چیخ ہی نکل گئی تھی۔ باہر کہیں ڈاکو تو نہیں تھے جو اس طوفانی رات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ اس گھر میں تو ان کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، سوائے اس کے یہ سوچ کر اس کے ہوش وحواس غائب ہو گئے۔

وہ جو ذرا دیر پہلے دادی ماں کے خراٹوں سے گھبرا کر اپنے کمرے میں آئی تھی اب چیختی ہوئی دادی ماں کے کمرے کی طرف بھاگی، جو ہر چیز سے بے نیاز صرف خراٹے لے رہی تھیں مگر وہ خراٹے کسی زندگی کی موجودگی کے آثار تھے۔ وہ تھر تھر کانپتی وہیں بیٹھی رہی اور نمازیں پڑھتی رہی۔ نمازوں کو اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہی اس کی ساتھی تھی، دل کا سکون تھیں اور زندگی کی رہبر تھیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا رہا۔ طوفان کم ہو گیا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹانا بھی بند ہو گیا۔ ہوسکتا ہے کہ تیز ہوا سے آہٹ ہو رہی ہو۔

وہ رات بھر جاگتی رہی۔ صبح صبح پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ اب اس نے ہمت پیدا کی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

ایک جوان آدمی ہاتھ میں سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہو رہا تھا۔

اس کو دیکھتے ہی زور سے بولا۔ ''چلو تمہارے کانوں نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز تو سنی، رات سے کھڑا کھٹکھٹا رہا ہوں جیسے گھر میں مردے رہتے ہوں۔ کیا بہت گہری نیند سو رہی تھیں؟''

''مگر آپ کون ہیں؟ رات بھر دروازہ کھٹکھٹانے کا مطلب؟'' وہ غصے سے بولی۔

''میں ایک بھوت ہوں، خطرناک بھوت۔'' وہ غصے سے چیخا۔

''میں تو یہ ہی سمجھ رہی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب اپنے آنے کا مقصد بھی بیان کر دیجیے۔''

''میں آسیہ بیگم سے ملنے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اتنی رات میں؟ یہی طوفانی رات ملی تھی ان سے ملنے کے لیے جبکہ نیند کی دوا کھا کر وہ بے ہوشی کی نیند سو رہی ہیں۔'' وہ بولی۔

''مگر تم تو بے ہوش نہیں تھیں؟'' وہ ویسے ہی غصے میں بولا۔

''ذرا تمیز سے بات کیجیے۔'' وہ بھی غصے میں آ گئی۔

''رات بھر طوفانی رات میں دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، یہاں دم نکلا جا رہا تھا کہ پتا نہیں ڈاکو ہے یا کوئی بھوت۔''

''بھوت دروازے نہیں کھٹکھٹاتے، خود بخود سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ رہے ڈاکو تو وہ دروازہ کھلنے کا انتظار نہیں کرتے، دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاتے ہیں۔''

''مگر آپ ڈرا تو ایسے ہی رہے تھے خواہ اندر آتے یا باہر رہتے۔ پوری رات دروازہ کھٹکھٹا کر مجھ کو ڈراتے رہے۔ طوفان کے شور کے ساتھ دروازے کی کھٹ کھٹ کتنی خوفناک تھی یہ صرف میں ہی سمجھ سکتی ہوں آپ نہیں۔''

''کاش میں واقعی بھوت ہوتا اور خود بخود اندر گھس کر تمہاری وہ حالت دیکھ سکتا۔ کتنا مزہ آتا۔ بیوقوف کہیں کی، بھوتوں سے ڈرتی ہے۔ رات بھر طوفان میں مجھے باہر سڑاتی رہی۔''

''تمیز سے بات کرو۔'' وہ بھی طیش میں آ گئی۔

''لگتی تو نوکرانی ہے مگر مزاج دیکھو جیسے گھر کی مالکن ہو۔ شاید گھر والوں نے بہت منہ چڑھا رکھا ہے۔ ایڈیٹ، کریزی۔'' وہ بھی چیخ کر بولا۔

''شٹ اپ''۔ وہ زور سے چیخی۔ ''صرف تم پر انگلش ختم نہیں ہو گئی۔ پتا نہیں دو چار

الفاظ رٹ کر کہاں سے آ گئے۔" اس نے انگریزی میں کہا اور دروازہ بند کر کے اندر جانے لگی۔

"اچھا تو پڑھی لکھی ہو۔ لہجہ تو یورپین جیسا ہے مگر دیکھنے میں پھٹیچر۔" وہ بڑبڑایا اور دھکا دیتا ہوا اندر گھس آیا۔ وہ ڈر کر بھاگی اور دادی ماں کے کمرے میں پناہ لی۔ دادی ماں جاگ چکی تھیں اور وہ کہہ رہی تھی۔ "دادی ماں گھر میں چور گھس آیا ہے؟"

"کون ہے تو؟" دادی ماں چیخ کر بولیں۔

"دادی ماں! مجھے آسیہ بیگم سے ملنا ہے وہ آپ ہی ہیں نا۔ میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے کسی نے آپ کے علاج کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کوئی آپ کے وفادار ملازم تھے جو چل پھر نہیں سکتے مگر مجھ کو یہاں بھیج دیا۔ یہ بہت بد تمیز لڑکی ہے۔ اس نے مجھے اندر ہی نہیں آنے دیا۔ میں رات بھر دروازہ کھٹکھٹا تا رہا۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"واہ بھئی میں کسی اجنبی کو گھر میں کیسے گھسنے دیتی۔" وہ تڑ سے بولی۔

"گھر میں کیا بہت قیمتی مال چھپا ہے؟" وہ چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے بڑے طنز سے بولا۔

"سب سے قیمتی مال تو میں ہی ہوں۔" وہ زور سے چیخ پڑی۔

"دادی ماں! آپ نے بہت لڑاکا عورت گھر میں رکھ چھوڑی ہے۔" وہ اس کو چڑھاتا ہوا بولا تو دادی ماں نے کہا۔ "چپ رہ بچی۔ کیا ہوا ہے تجھے؟ تو تو بہت سیدھی لڑکی ہے۔ آج کیوں ایسے لڑ رہی ہے۔"

"دادی ماں! گھر میں تھا ہی کون جس سے میں لڑتی۔ آج موقع ملا ہے تو میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں سیدھی سادی اللہ میاں کی گائے نہیں ہوں۔" وہ باضابطہ ہاتھ چلاتے ہوئے بولی تو وہ ہنس دیا۔ دادی ماں نے بہت غور سے اس کو دیکھا۔

"دادی ماں! میں اپنا سامان کہاں رکھوں؟" اس نے پوچھا۔

"ارے واہ"۔ جواب سُبنا نے دیا۔ "مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ اے مسٹر یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

"محاورے سنا سنا کر آپ بہت دیر سے مجھے ڈرا رہی ہیں۔ مانا کہ میں محاوروں سے گھبراتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ڈر کر بھاگ جاؤں گا۔ میں بھی محاورے بول سکتا

ہوں۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام، دودھ کا دودھ پانی کا پانی، چشم بدور، عید کا چاند وغیرہ وغیرہ۔“

سُبنا کو اس کے کہنے کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ وہ پھر بولا۔”ارے آپ کو ہنسنا بھی آتا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ صرف لڑنا آتا ہے۔“

”ہنسنے کا کوئی موقع ہی کب آتا ہے یہاں۔ اگر ہنسی کی بات ہوگی تو ہنسی آئے گی ہی۔“ نہایت معصومیت کے ساتھ کہا گیا۔

”ایڈیٹ۔“ وہ پھر بولا۔

”کیا؟“ وہ انگلش میں بولی۔”اپنی یہ انگلش کہیں اور بگھاریے گا۔ اردو میں تو محاورے یاد دلا دیے ہیں مگر انگلش میں آپ کی چھٹی ہی کر دوں گی۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے انگلش میں پوچھا۔

”انگلش میں ایم اے ہوں اور اب پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”واقعی؟“ اس کو پھر حیرت ہوئی، اس نے سوچا۔”اتنی میلی کچیلی اور دعوے کتنے بڑے بڑے ہیں۔“

پھر اس نے خود ہی ایک کمرے پر قبضہ کر لیا۔ باتھ روم کی طرف بھی خود ہی چلا گیا۔ سُبنا سوچ رہی تھی اس آفتِ جاں سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کو چائے، ناشتہ اور کھانا کیسے کھلائے گی۔ وہ نہا کر باہر آیا تو اس نے خود ہی کہہ دیا۔”آپ باہر جا کر چائے ناشتہ کر لیجیے۔“

”مہمان نوازی اسی کو کہتے ہیں یعنی آپ چائے تک نہیں دیں گی؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”کیونکہ یہاں کوئی چائے نہیں پیتا۔“ سُبنا نے جھوٹ بولا۔”آپ باہر جا کر چائے پی لیجیے۔“

”یہاں کوئی کھانا بھی کھاتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب بھی دے دیجیے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا مگر سُبنا نے اس کے لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔”دادی ماں کھانا نہیں کھاتیں۔ مجھے کھانے کا شوق ہے اور نہ ہی پکانے کا۔ آپ کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔“

”آپ کیا ہوا کھاتی ہیں؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”یہ آپ کی فکر کرنے کی بات نہیں ہے کہ میں کیا کھاتی ہوں اور کیا نہیں۔“ وہ روڈ ہو گئی۔

''چلیے کچن ہی دکھا دیجیے میں خود کھانا بنا لوں گا۔ آپ کو بھی کھلاؤں گا۔'' وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔

''میں اتنی بے تکلفی پسند نہیں کرتی کہ کوئی اجنبی آدمی میرے کچن میں جائے، آپ سے کہہ دیا نہ کہ آپ تشریف لے جائیے۔ ناشتہ کر کے واپس آجائیے گا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''کہاں پھنس گیا ہوں؟'' وہ بڑبڑایا۔

''میں نے مشورہ تو نہیں دیا تھا آپ مجھ سے شکایت کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ بہت رُکھائی سے بولی تو وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ سُبنا نے کچن میں جا کر دیکھا چائے شکر کچھ بھی نہیں تھیں۔ ذرا سی مسور کی دال اور تھوڑا سا آٹا پڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی دال اور چار روٹیاں بنا ڈالیں۔ ابھی کھانے کی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ پھر دوڑتا ہوا کچن میں داخل ہوا اور بولا۔ ''اچھا، کھانا پک گیا۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔ اس نے دال روٹی نکالا اور مزے سے کھانے لگا۔ ساتھ ہی وہ کہے جا رہا تھا۔ ''یہ منہ اور مسور کی دال! اچھا تب ہی آپ مجھے ٹرخا رہی تھیں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں صرف مسور کی دال کھاتا ہوں اس کے علاوہ کچھ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔'' وہ آدھا کھانا کھا گیا اور آدھا اس کے لیے چھوڑ دیا۔

اس کے جانے کے بعد سُبنا نے بھی کھانا کھالیا۔ اس کو بہت شرمندگی تھی۔ گھر میں پہلی بار کوئی مہمان بن کر آیا تھا۔ سُبنا کا سلوک اس کے ساتھ کتنا خراب تھا مگر وہ بھی کیا کرتی کتنی مجبور تھی وہ۔ گھر میں اب زیور بھی نہیں بچے تھے۔ موجودہ حالات میں وہ مہمان نوازی کی حیثیت میں نہیں تھی، گھر میں صابن تک نہیں تھا۔ وہ خود کتنی گندی ہو رہی تھی، اس کے سامنے جانے سے شرم آ رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی اس کو نوکرانی سمجھ رہا تھا۔ انگلش کی تکرار نے اس کا پول کھول دیا۔ وہ خود پتا نہیں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اپنے آپ کو ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ کسی نے اسے دادی ماں کے علاج کے لیے بھیجا تھا۔ دادی ماں بھی جانے کیسے اسے اپنے گھر میں رکھنے کو راضی ہوگئی تھیں۔ پتا نہیں اس نے کیا پٹی پڑھا دی تھی۔ اس نے ہمت جمع کر کے اس سے کہہ دیا۔ ''آپ اپنے رہنے کا ٹھکانا کہیں اور کر لیجیے۔ میں یہاں اکیلی ہوں۔ مجھے پسند نہیں کہ کوئی اجنبی یہاں رہے اس میں میری بدنامی ہے۔''

''کیا میں آپ کو کھا جاؤں گا؟'' وہ بہت ناگواری اور بدتمیزی سے بولا۔ تھوڑی دیر

خاموشی رہی پھر اسی نے بات شروع کی۔ ''ہم اور آپ اکیلے کہاں ہیں؟ دادی ماں بھی تو ہیں۔''

''دادی ماں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مجھے پتا نہیں آپ کون ہیں؟ معاف کیجیے گا اگر آپ ان کے رشتے دار یا سگے پوتے یا نواسے بھی ہوتے تب بھی میں آپ کو یہاں نہیں رکنے دیتی۔ اس حالت میں آپ دادی ماں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے تب بھی میں نہیں جاتی۔ ہاں اگر ان کے بیٹے ہوتے تو میں بھی خوشی خوشی آپ کے ساتھ چلی جاتی''۔ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ پوتے اور نواسے کے ساتھ کیسے جاتیں؟ یہ بتا دیجیے میں وہی انتظام کرلوں گا۔'' وہ بڑی خوش اخلاقی سے بولا۔

سُبنا جھینپ کر چپ ہوگئی۔ وہ اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ خود ہی بولا۔ ''محترمہ فکر مت کیجیے۔ آج کی دعوت میری طرف سے ہے۔ کیا میں آپ کا کچن استعمال کرسکتا ہوں؟ میں خود کھانا پکاؤں گا، سب لوگ کھائیں گے۔ مجھے بازار کا کھانا پسند نہیں ہے۔ آپ کھانا پکانا نہیں چاہتیں ہیں، میں آپ کا سامان نہیں چھوؤں گا۔ خود اپنا سامان لے آؤں گا۔ صرف اپنا کچن استعمال کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ اب تو آہی گیا ہوں واپس جا نہیں سکتا۔ یہ جگہ میرے لیے نئی ہے، میں یہاں کسی کو نہیں جانتا ہوں۔ ورنہ آپ کو تکلیف نہیں دیتا۔'' وہ اصلی بات اڑا کر دوسری بات کرنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر چلا گیا۔ بہت دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو سُبنا حیران رہ گئی۔ وہ ٹرک بھر کر سامان لایا تھا۔ تیل، گھی کے بڑے بڑے کنستر، چائے، دودھ، شکر، گوشت، مچھلی، انڈے، ترکاریاں، دالیں، چاول، آٹا، ایندھن سب کچھ اتنا زیادہ تھا کہ جیسے یہ کوئی شادی کا گھر رہا ہو۔

''اتنا سامان کیوں لائے ہیں؟ کیا گھر میں کوئی شادی ہے؟'' اس کے منہ سے نکل گیا۔

''کیا پتا وہ بھی ہو جائے۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''فی الحال تو میں ابھی کھانا بنانے جارہا ہوں۔''

سُبنا نے فوراً ہی سب سامان اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ جہاں پر اس کی مدد کی ضرورت تھی اس کی مدد بھی لی۔ سامان کی زیادتی نے اس کے کچن کی غریبی کا بھرم رکھ لیا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کبھی وہ کچن سامان سے خالی تھا بلکہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سچ ہے رزاق خدا ہے، جو بھی وسیلہ بنا دے رزق پہنچانے کا۔ ورنہ اس گھر میں اب زبردست فاقوں کا دور شروع ہونے والا تھا جسے شاید

موت ہی ختم کرتی۔ ورنہ دور دور تک سوائے خدا کی ذات کے کچھ بھی نہیں تھا۔ جب وہ کچن میں آیا تو سارا سامان قرینے کے ساتھ رکھا جا چکا تھا۔ وہ بڑے آرام سے ہانڈی چڑھا کر پکانے میں لگا ہوا تھا۔ سُبنا اتنی نروس اور پریشان تھی کہ اس کے منہ سے یہ بھی نہیں نکلا کہ وہ خود کھانا بنا دے گی۔ وہ بس خاموش تماش بین کی طرح تماشا دیکھتی رہ گئی۔ وہ کھانا بنا رہا تھا۔ اس نے صرف گھر کے باورچیوں کو کھانا بناتے دیکھا تھا مگر کسی ایسے آدمی کو پہلی بار کھانا بناتے دیکھا تھا جو خود کو ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ویسے بھی اس کے گھر میں کبھی آدمی تھے ہی نہیں۔ سب اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ختم ہو چکے تھے۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ کر دادی ماں کے کمرے میں آ گئی۔ دادی ماں جاگ رہی تھیں اور چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی تھیں۔ تھوری دیر کے بعد بولیں ''وہ لڑکا کہاں ہے؟''

''کچن میں کھانا بنا رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کھانا بنا رہا ہے؟ مگر تم کیا کر رہی ہو۔'' دادی ماں نے دھیرے سے کہا۔

''دادی ماں! میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ نہ مجھے کھانا پکانے کا شوق ہے اور نہ ہی کھانے کا۔''

''کھانے کا شوق تو ابھی پیدا ہو جائے گا۔'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''چلیے کھانا تیار ہے۔'' پھر دادی ماں سے مخاطب ہوا۔ ''آپ بھی اُٹھیے، پڑے پڑے اور بیمار ہو جائیں گی۔ تھوڑا تو چلا پھرا کیجیے۔'' اس نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کر دیا۔ پھر سُبنا اور وہ ان کو پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل پر لے آئے۔ وہ حیران رہ گئی۔ کھانے کا کمرہ خوب صاف اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ میز بھی قاعدے سے لگی ہوئی تھی۔ پلاؤ، قورمہ، شامی کباب، کھیر، سلاد سب ہی کچھ تو تھا مگر اتنی جلدی یہ سب لوازمات کیسے تیار ہو گئے۔ تعجب کی بات تھی۔ دادی ماں بھی حیران رہ گئیں اور بولیں، ''میاں یہ سب تم نے بنایا ہے اتنی جلدی۔ تعجب ہے کسی عالیشان دعوت کا کھانا لگ رہا ہے، کتنے عرصے کے بعد یہ کراکری استعمال ہوئی ہے۔ اس سُبنا کو تو کوئی شوق ہی نہیں ہے۔''

''سُبنا؟'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ تو یہ سُبنا ہی ہے، اس کا شک ٹھیک تھا۔ وہ اتنی سختی دکھا رہی تھی کہ اس نے اس کا نام ہی نہیں پوچھا اور نہ ابھی تک اپنا نام بتایا تھا مگر یہ سُبنا اتنی میلی کچیلی کیوں ہے؟ انگلش میں ایم اے ہے مگر ہر چیز سے بیزار۔ دادی ماں نے یہ عقلمندی کا کام کیا کہ اس کو اتنی اعلیٰ تعلیم دلوا دی۔ ورنہ طور طریقوں سے تو بالکل جاہل نظر آتی ہے۔ مہمان تو شاید اپنی پوری

زندگی میں دیکھا ہی نہیں ہے۔پہلی بار اس حویلی میں کوئی آدمی نظر آیا تو کتنی صفائی سے ٹرخانے کی کوشش کی مگر وہ ڈھیٹ بن کر ڈٹا ہی رہا۔رات بھر اتنی بڑی حویلی میں تنہا طوفان سے ڈرتی رہی۔ دروازے کی آواز کو چور ڈاکو یا بھوت سمجھ کر کانپتی رہی۔رات بھر نہیں سوئی۔کیا زندگی ہے بچاری کی۔اتنی بڑی حویلی کتنی ویران دکھائی دیتی ہے۔آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ایک دادی ماں ہے اور یہ غریب لڑکی۔دادی ماں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے تو خود پاگل ہو جاتی ہے۔اس کی دولت، اس کا خزانہ دادی ماں ہی تو ہیں۔جیسے ان کو پھونک پھونک کر زندہ رکھ رہی ہے مگر کب تک؟ دال روٹی کھائے جا رہی تھی، یہ کھانا نعمت لگا ہوگا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ ٹھیک وقت پر آ گیا تھا۔اس نے سوچا۔

کھانا بہت خاموشی کے ساتھ کھایا گیا۔اس نے اس وقت سُبنا کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔سُبنا اور سب لوگوں نے کھانا خوب اچھی طرح سے کھایا۔پھر وہ خاموشی سے برتن دھونے میں لگ گئی۔صفائی کر کے سب سامان اپنی جگہ پر پہنچایا۔اچانک اس کی نظر صابن اور ڈیٹرجنٹ پر پڑی تو وہ دونوں چیزیں باتھ روم میں رکھ آئی۔پھر اپنے، دادی ماں اور مہمان کے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔اس نے سوچا کتنے دن بعد اس کے کپڑے دھلیں گے اور وہ صاف ستھری نظر آئے گی۔اس نے جلدی جلدی کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلا دیے۔جب وہ سوکھ گئے تو ان کو اٹھا کر نہانے چلی گئی۔جب نہا کر دھلے کپڑے پہننے کے بعد تیار ہوئی تو وہ اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔وہ واقعی میں بہت خوبصورت تھی۔ویسے گندے کپڑوں میں بھی گودڑ میں لعل نظر آ رہی تھی۔

''آپ تو بہت شریف نظر آ رہی ہیں۔یہ کیا ہے؟'' اس نے خواہ مخواہ اس کو چھیڑنے کی کوشش کی۔

''میں شریفوں کے ساتھ شریف ہوں۔'' وہ بڑی ادا سے بولی۔''رذیلوں کے ساتھ رذیل اور لڑاکوں کے ساتھ لڑاکا ہوں۔''

''اتنا پڑھ لکھ کر گھر میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔کسی اسکول میں ٹیچر بن جائیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں ہمیشہ فرسٹ آئی ہوں۔دادی ماں نے بہت بڑے بڑے اسکولوں میں مجھے پڑھایا ہے۔نوکری تو مجھے تعلیم ختم کرتے ہی مل گئی تھی۔زندگی کے بہت سے منصوبے تھے۔

پی ایچ ڈی جوائن کر لی تھی مگر دادی ماں بہت بیمار پڑ گئیں تو مجھے واپس آنا پڑا۔ان کو کس پر چھوڑتی ۔ دادی ماں کی ناک سے بھی ڈر لگتا ہے، کہیں وہ نیچی نہ ہو جائے ۔ان کے خاندان میں لڑکیاں نوکری کے لیے نہیں ہوتی ہیں، زندہ اس حویلی میں دفن کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''اور لڑکے؟'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''عیاشی کے لیے جو زمین جائیداد اور رہنے کا ٹھکانا سب کھا کر مر جائیں ۔ پیچھے اپنی اولادیں غریبی اور مفلسی میں لپیٹ کر جھوٹی شان اور روایت پر قربان ہونے کے لیے چھوڑ جائیں۔''

''دادی ماں آپ کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''خاندانی ہڈیاں ختم ہو چکی ہیں۔ غیر خاندانی ہڈی ان کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ویسے بھی مجھ سے شادی کون کرے گا؟ میرے پاس دولت بھی تو نہیں ہے۔ فاقے اور مفلسی میں پڑی ہوئی لڑکی کے لیے کون باہر کا آدمی آئے گا۔ زمین جائیداد اور حویلی ہمارے باپ دادا گروی رکھ چکے ہیں۔ دادی ماں کو نہیں معلوم کہ مہاجن ترس کھا کر ان کو رہنے دے رہا ہے۔ وہ اس حویلی میں سرخ جوڑا پہن کر رانیوں کی طرح آئی تھیں اور کفن پہن کر رخصت ہو جائیں گی۔ مہاجن بھی اس خاندانی روایت کو جانتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے۔ دادی ماں بیمار تو ہیں ہی جلدی ہی مر جائیں گی پھر میں ان کی اونچی ناک، خاندانی روایات کو لے کر سڑک پر آ جاؤں گی۔ تب میرا حشر کیا ہوگا آپ ہی سوچیے ۔ میری شادی کا سرخ جوڑا جو سچے موتیوں ، ہیرے جواہرات اور سونے کے کام سے بنا ہے دادی ماں کی کسی خاندانی ہڈی کا انتظار کرتا رہ جائے گا۔ میں آپ کو جانتی نہیں مگر اپنی زندگی کی یہ دردناک داستان آپ کو سنائے دے رہی ہوں ۔ پتہ نہیں کیوں؟ شاید آج تک کوئی ملا ہی نہیں تھا جو اتنے سوالات کرتا اور میں جواب دیتی۔''

تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہا۔اس خاموشی کو سُبنا نے ہی توڑا اور اپنی بات پھر شروع کر دی۔

''دادی ماں کی بیماری میں کروڑوں کے زیور مہاجن لے گیا۔بس چکر لگا تا رہتا ہے کسی نہ کسی قیمتی چیز کے لیے۔ ہم لوگوں کی مجبوری سے وہ خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ نہیں نہیں کر کے بھی عیاشوں کی اس حویلی میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے اسی لیے اس نے روک رکھا ہو کہ اگر ہم لوگ چلے جائیں گے تو وہ سامان بھی چلا جائے گا۔ اس سرخ جوڑے کی کہانی بھی اس کو معلوم ہوگی ۔ اس کی وقعت جانتا ہوگا ۔ دادی ماں کی نظروں میں تو اس کی اہمیت بس ان

کی پوتی کودلہن کے روپ میں سجانا ہے۔ وہ سرخ جوڑا دادی ماں کی آخری خواہش ہے، ان کی پوتی اس کو پہن کر رخصت ہو جائے۔ وہ آج بھی پتا نہیں کیوں میرے دولھا کے انتظار میں ہیں، شاید وہ کوئی خاندانی ہڈی ہے جس کے انتظار میں ان کی آنکھیں صدر دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ ضرور کوئی نہ کوئی آئے گا اور مجھے ان کی نظروں کے سامنے بیاہ لے کر جائے گا۔ ان کی کوئی پسندیدہ شخصیت جوان کے خیالوں میں بسی ہے، میرا گھر بسائے دے رہی ہے مگر ان بے چاری کو معلوم نہیں ہے کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ آپ بھی یہاں سے جلد از جلد رخصت ہو جائیے۔ ہمارا حال بہت برا ہونے والا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ہماری کہانی کا اختتام آپ دیکھیں۔''

''کیا میں آپ سے شادی نہیں کر سکتا؟'' وہ ایک دم سے بولا۔

''شادی اور مجھ سے؟'' وہ دردناک ہنسی کے ساتھ بولی۔

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟'' اگر اس شاندار حویلی کی وجہ سے آپ مجھ پر ڈورے ڈال رہے ہیں تو آپ کا اندازہ غلط ہے۔ شاید آپ نے ہماری زمین و جائیداد کے بارے میں سن رکھا ہوگا تب ہی آپ کو یہ خیال آیا۔ مگر میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ سب ہمارا نہیں مہاجن کا ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے ایک دادی ماں کے۔''

''مجھے آپ کی دولت سے کچھ بھی نہیں لینا۔ آپ سے مطلب ہے۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

''لڑکے''۔ دادی ماں کی چیخ سنائی دی۔ انہوں نے شاید اس کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ ''پاگل ہو گیا ہے اگر تو اس مقصد سے یہاں آیا ہے تو یہاں سے ابھی اور اسی وقت نکل جا۔ پتا نہیں تو کون ہے تیری ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔'' دادی ماں چیختے چیختے بیدم ہو کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

کئی دن کے بعد ہوش میں آئیں مگر زبان گونگی ہو چکی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔ جسم کی جنبش بھی ختم ہو چکی تھی۔ صرف آنکھیں حرکت کر رہی تھیں، یوں لگتا تھا، جیسے اب گئیں اور تب گئیں۔ سُبنا بھی نارمل نہیں تھی۔ آخر اس نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''دادی ماں! مجھے معلوم ہے کہ آپ مر نہیں سکیں گی۔ آپ کی جان مجھ میں اٹکی ہوئی ہے۔ میں آپ کو اب زیادہ نہیں روک سکتی، آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی اور میں اتنی خودغرض نہیں ہوں۔ آپ کو اپنی منزل کی طرف جانا

ہوگا اور مجھے اپنی منزل کی طرف۔'' پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔''آپ نے مجھے شادی کا پیغام دیا تھا جو مجھے منظور ہے۔'' دادی ماں غصے سے کانپنے لگیں۔تھوڑی دیر خاموشی رہی۔سُبنا پھر دادی ماں سے مخاطب ہوئی اور بولی۔''دادی ماں! آپ ہمیشہ میری خالہ کو ایک بری عورت کہتی رہیں، میرے دل میں ان کے خلاف نفرت بھرتی رہیں مگر مجھے پتا ہی نہیں چلا کب وہ میری پسندیدہ ہستی بن گئیں۔ مجھے وہ دنیا کی عظیم ترین عورت نظر آنے لگیں۔ میں اپنے آپ ان کی بنتی چلی گئی اور وہ میری۔بغیر ان کو دیکھے، بغیر ان سے ملے ہوئے۔انہوں نے ہمت تو کی۔اس حویلی میں زندہ دفن تو نہیں ہوئیں۔ایک موقع ان کو ملا جسے انہوں نے نہیں کھویا اور اپنی زندگی بنا لی۔ان کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔وہ آپ کی جھوٹی شان اور اونچی ناک پر قربان نہیں ہوئیں۔ایک بیوہ کی زندگی نہیں گزار پائیں، جو اس حویلی کی روایت ہے اور نہ ہی اب میں زندہ دفن ہوں گی۔ مجھے بھی ایک موقع مل رہا ہے۔کسی نے پہلی بار مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے میں اس کو رد نہیں کروں گی۔ یہ آدمی مجھے قبول ہے جو میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے، جس کو میں جانتی تک نہیں ہوں، جو میرے لیے اجنبی ہے۔ یہ آدمی شریف اور ڈاکٹر نہ ہوکر اس گھر کا نوکر بھی ہوتا تب بھی میں اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔اب یہ جو بھی ہے مجھے پروا نہیں ہے۔ایک پڑھا لکھا شریف آدمی ہے، بس اتنا کافی ہے۔ جایئے آپ قاضی کو لے آیئے۔ میں ابھی وہ سرخ جوڑا پہن لوں گی جو دادی ماں کا ارمان بنا کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی اور جلدی سے سرخ جوڑا پہن کر واپس آ گئی۔وہ جوڑا اتنا بھاری تھا کہ اس کا نازک وجود اس میں دبا جا رہا تھا مگر روشنی کی شعاعیں اس جوڑے سے نکل کر اس کے چہرے کو منور کیے دے رہی تھیں۔ دادی ماں اور وہ دونوں مبہوت سے اس کو دیکھے جا رہے تھے۔اُسے وہاں موجود پا کر اس کو غصہ آ گیا۔اس نے کہا۔''آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔سُنا نہیں میں نے کیا کہا۔'' پھر دادی ماں سے مخاطب ہوئی۔''دادی ماں! یہ جوڑا خود ہی اتنا بھاری ہے کہ مجھے زیور پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ نے بھی کبھی زیور نہیں پہننے دیے۔صرف دور سے دیکھنے کے لیے زیوروں کے انبار لگا دیے۔ ہمیشہ آپ نے یہی کہا کہ مجھے زیوروں کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو بغیر زیوروں کے ہی اتنی حسین لگتی ہوں۔ٹھیک ہے نا دادی ماں!''

دادی ماں ابھی تک ان دونوں کو غصے سے گھور رہی تھیں۔ چمکتے ہوئے چہرے کے حسن

کا سحراب ختم ہو چکا تھا۔ ان کی اٹکی ہوئی جان پھر بھی اٹکی رہی۔ سُبنا کا بولنا تب بھی ختم نہیں ہوا۔ وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

''دادی ماں! سن لیجیے، میں نے خود کو کبھی بھی تنہا یا لا وارث نہیں سمجھا۔ میری خالہ میرا خاندان اور میری وارث ہیں۔ میں دنیا میں اکیلی نہیں ہوں۔ وہ اور ان کی فیملی میری اپنی ہے۔ یہاں سے باہر جا کر ایک دنیا میرا انتظار کر رہی ہے۔ میری خالہ کی دنیا۔ میں ان کو ڈھونڈھوں گی اور جو سوال میں آپ سے نہیں کر سکی وہ ان سے کروں گی۔ کیونکہ جواب انہیں کے پاس موجود ہے۔ مجھے انہیں سے پوچھنا ہے کہ خالہ! جب آپ اتنی ہمت والی تھیں تو حویلی کا قیمتی ہیرا اپنے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے حویلی اور اس کی دولت کو ٹھکرا کر اتنا بڑا کام کیا مگر میں اس ہیرے کی وجہ سے ہمیشہ دنیا کے سامنے شرمندہ رہی، دادی ماں کے سامنے بھی۔''

ایک دم سے بولتے بولتے سُبنا ہانپنے لگی۔ رونے اور چلانے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے دادی ماں کے پاؤں پکڑ لیے مگر اس کا رونا کم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ وہ پریشان ہو گیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے سُبنا نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ ''دادی ماں! مجھے معاف کر دیجیے میں بہت مجبوری میں یہ کام کر رہی ہوں۔ میرے پاس جینے کا کوئی اور سہارا ہوتا تو میں اس حالت میں آپ کا دل کبھی نہ توڑتی۔ آپ کو پریشان نہ کرتی۔ آپ کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور کوئی غیر بغیر کسی رشتے کے میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میرا شوہر بن کر ہی یہ ڈاکٹر آپ کی خدمت کر سکتا ہے۔ آپ دلہن کا سرخ جوڑا پہن کر اس حویلی میں آئی تھیں اور کفن پہن کر اس حویلی سے نکلیں گی۔ میں بھی آپ کے سامنے آپ کے ہاتھوں عزت کے ساتھ سرخ جوڑا پہن کر اس حویلی سے چلی جاؤں گی مگر کسی غیر کے ساتھ نہیں، اپنے شوہر کے ساتھ۔ بغیر سرخ جوڑا پہنے بغیر شادی کیے اس حویلی سے نکلنا میں اپنی توہین سمجھوں گی اور یہ میرا فرض بھی ہے کہ میں آپ کی آخری خواہش پوری کروں تا کہ آپ ایک اطمینان، ایک سکون لے کر اس دنیا سے جائیں۔'' وہ اب بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ دادی ماں ساکت تھیں پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ''جلدی سے قاضی کو لائیے کہیں دیر نہ ہو جائے اور دادی ماں کا ارمان، ارمان ہی نہ رہ جائے۔''

ایک دم سے اس نے بھی دادی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ ''دادی ماں! ناراض مت ہوئیے، خوشی خوشی سُبنا کو میرے ساتھ رخصت کر دیجیے۔ سُبنا کوئی

غیر جگہ نہیں جا رہی، وہ میرے گھر جا رہی ہے۔ میں ارکاش ہوں آپ کا پوتا، آپ کا ہیرا۔ آپ کی بہو اور سُبنا کی خالہ مجھے یہاں سے لے گئی تھیں۔ آخر وہ مجھ کو یہاں کیوں چھوڑتیں، میں ان کا بیٹا تھا۔ سُبنا کو بھی انہوں نے مجبوری کی حالت میں چھوڑا تھا مگر اس کی یاد میں ہمیشہ آنسو بہاتی رہیں۔ آپ کے لیے اور آپ کے خاندان کے لیے میں ایک قیمتی چیز، قیمتی ہیرا تھا۔ آپ کے مرحوم بیٹے کی نشانی تھا مگر اپنی ماں کے لیے بھی میں ہی سب کچھ تھا۔ ان کی زندگی، ان کی اولاد۔ حویلی کے قاعدے قانون کے مطابق سُبنا پر میرا حق ہے۔ مجھے سُبنا کی رائے چاہیے تھی جو مجھے مل گئی۔ میں اب آپ سے اجازت مانگتا ہوں۔ اپنا حق مانگتا ہوں۔ آپ کی بہو کی دوسری شادی ہو جانے سے میرا آپ سے رشتہ تو نہیں ٹوٹ گیا۔ میں اب بھی آپ کے بیٹے کا بیٹا، آپ کا ہی پوتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ہمیشہ میرا انتظار رہا ہے۔ اس وقت سے بہت زیادہ جب سے آپ بیمار پڑی ہیں اور سُبنا بڑی ہوئی ہے۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں قاضی اور بارات لینے جاؤں؟''

ایک دم سے دادی ماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر ان آنکھوں میں لاتعداد محبت کے آنسو جھلملانے لگے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے سُبنا کا ہاتھ اٹھا کر ارکاش کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیسے اپنے بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہوگئی ہوں۔ ان کو شاید ہمیشہ سے اسی کا انتظار تھا ارکاش باہر چلا گیا۔

سُبنا خاموش تھی۔ وہ اپنی کہانی کے اس موڑ کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حویلی کا قیمتی ہیرا جو خالہ چرا کر لے گئی تھیں وہ خود ان کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ تو آنکھ کھولتے ہی خالہ کو چور ڈاکو سنتی آ رہی تھی۔ جبکہ اپنا بیٹا اپنے ساتھ لے جانا کوئی چوری یا بری بات تو نہیں تھی۔ دادی ماں کے پاس رہ کر وہ کیا بنتا۔ ایک عیاش، ان کے شوہر اور بیٹوں کی طرح۔ اب تو زمین جائیداد بھی نہیں تھی جس کو وہ اڑاتا پھر کیا کرتا۔ حویلی میں قید ہو کر اس کی طرح فاقے کرتا۔

حویلی کی جو روایات دادی ماں لے کر چل رہی تھیں کیا وہ واقعی ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کو لگا کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کی طرح اس کی شادی بھی اپنے بڑے ابا کے بیٹے کے ساتھ ہو رہی تھی جو اس کی خالہ کا بیٹا بھی تھا۔ وہ اب بھی خاندانی روایات کے اندر تھی بلکہ اس نے تو خود کو اور بھی زیادہ خاندانی روایت میں جکڑا پایا۔ کچھ اور ذمہ داریوں کے ساتھ۔ روایات کی ذمہ داری کا بوجھ

دادی ماں کے کندھوں سے اتر کر اس کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ اس کو نباہ پائے گی یا نہیں۔ وہ تو ان سے فرار چاہتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ ایک نئے خاندان یا باہر کے خاندان کا آدمی اس کی زندگی میں آ گیا۔ وہ اجنبی کہاں تھا۔ وہ تو دادی ماں کا سب سے زیادہ سگا تھا۔ ان کا انتظار تھا برسوں کا انتظار۔ وہ جب تک اسے اپنا نہیں سمجھ رہی تھیں تو اس کے پیغام پر کیسے غصے سے پاگل ہو گئی تھیں، بستر سے لگ گئی تھیں مگر اب کتنی راضی، کتنی خوش نظر آ رہی تھیں۔ برسوں کا انتظار جو ختم ہو گیا تھا۔ ان کی تمنا جو پوری ہو گئی تھی۔ سُبنا ایک مضبوط سائبان کے اندر تھی، یہی بات دادی ماں کے سکون اور اطمینان کا باعث تھی۔ ان کو امید نہیں تھی کہ وہ اور اس کے بچے اب بھی اسی روایت کو لے کر آگے بڑھتے جائیں گے۔ حویلی رہے یا نہ رہے مگر ان کو روایات کا بوجھ دے کر رخصت کیا جائے گا۔ یہ حویلی اسے اور اس کے خاندان کو ایک روایت بن کر باندھے رہے گی۔ اس کو امید تھی کہ اب اس کے گھر میں کوئی عیاش پیدا نہیں ہوگا۔ جو اپنی عیاشی سے دوسرے انسانوں کو زندہ دفن کر دے گا۔ اس کے بچے قاعدے کے لوگوں کے ساتھ بیاہے جائیں گے۔ خواہ ان کے پاس خاندانی روایات یا رشتے داری نہ ہو۔ یہ اس کا وعدہ تھا۔ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اپنی آنے والی نسل سے بھی۔

ارکاش نہ صرف قاضی کو بلانے باہر گیا تھا بلکہ اس نے ذرا سی دیر میں پورا گاؤں حویلی میں جمع کر دیا تھا۔ ایک بہت بڑی بارات خالہ اور مع ان کے آٹھ بچوں کے لے کر آیا تھا۔ بڑے بڑے باورچی ساتھ آئے تھے۔ لڑکیوں نے فوراً کھانے پینے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ پورا گھر رنگ برنگے گلابوں سے سج گیا تھا۔ اتنے پھول تو اس نے اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ واقعی اس وقت پھولوں کی بہت ضرورت تھی، دلہن کے لیے بھی اور بیمار دادی ماں کے لیے بھی۔ سُبنا پہلے ہی سے سرخ جوڑا پہنے تھی۔ اس کو خوبصورت اور قیمتی زیوروں سے سجا دیا گیا تھا۔

پھر اس کا نکاح ہو گیا۔ دادی ماں اب بھی خاموش تھیں۔ صرف حرکت کرتی آنکھوں اور ساکت وجود کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ سُبنا ان کی زندگی تھی۔ اگرچہ لڑکی والوں کی طرف سے پورا گاؤں جمع تھا مگر رشتے داروں میں صرف دادی ماں تھیں۔ جو کام ان کا بدن نہیں کر پا رہا تھا وہ کام ان کی آنکھیں کر رہی تھیں۔ صرف آنکھیں، خوشی وغم کا اظہار کرتی آنکھیں، آنسو بھری آنکھیں، درد بھری آنکھیں اور دنیا سے جاتی آنکھیں جو زبردستی موت کو ٹال

رہی تھیں۔ کہیں ان کی وجہ سے اس وقت کی خوشی غم میں نہ بدل جائے۔ کتنی مشکل سے اور کتنی مدت کے بعد یہ دن آیا تھا۔ سُبنا کی شادی کا دن۔ یہ خوشیاں اس حویلی میں ایک زمانے کے بعد آئی تھیں مگر غم اور موت میں لپٹی ہوئی۔ کفن میں ڈھکی ہوئی۔ ان کو مرنا ہی تھا تو آج اور ابھی کیوں؟ آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں ان کو دیکھنے دیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے، ان کی دعاؤں کے ساتھ سُبنا ارکاش کے ساتھ رخصت کر دی گئی۔ سرخ جوڑا پہنے حویلی سے باہر چلی گئی مگر تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئی۔ تب تک کھلی آنکھوں میں نہ خوشی تھی، نہ درد اور نہ ہی آنسو تھے۔ وہ آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر ایک سکون تھا، ایک ابدی سکون۔ اتنے رنگ برنگی گلابوں سے اب ایک اور کام لے لیا گیا۔ ان کا جنازہ سر سے پیر تک گلابوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ پھر سب کے رونے اور سسکیوں کی آواز میں سُبنا کی آواز بھی شامل ہو گئی جو اب بھی سرخ جوڑا پہنے روئے جا رہی تھی۔

◆ ÷ ◆

دوسری پسند

''نبینہ! میرے ساتھ بازار چلوگی؟ کل شائستہ کی سالگرہ ہے اس کا تحفہ خریدنا ہے۔'' شہمانے کہا۔

آرام سے بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھتی نبینہ نے جواب دیا۔''نہ بابانہ، مجھے پاگل کتے نے تھوڑی کاٹا ہے جو گرمیوں کی اس دوپہر میں تمہارے ساتھ بازار جاؤں۔''

شہما بڑبڑاتی ہوئی اپنی امی کے پاس گئی۔ان کے پاس اشہاب کو بیٹھا دیکھ کر وہ رک گئی اور سوچنے لگی، جائے کہ نہ جائے۔کچھ سوچ کر چلی گئی اور بولی۔''امی میرے ساتھ ابھی اسی وقت بازار چلیے۔کل شائستہ کی سالگرہ ہے اس کے لیے تحفہ خریدنا ہے۔''

امی نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔''اتنی گرمی میں، میں باہر نہیں جاؤں گی۔تم نبینہ کو ساتھ لے لو۔''

''آپ بھی انکار کر رہی ہیں اور نبینہ بھی جانے کو تیار نہیں ہے۔میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

''چلو میں تم کو بازار پہنچادوں۔''اشہاب نے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ کہا۔

''جی شکریہ! مجھے کسی کی مہربانی نہیں چاہیے۔''یہ کہہ کر وہ چل دی۔دور دور تک سواری کا پتا نہیں تھا۔وہ پیدل ہی چلی جارہی تھی۔اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو اشہاب اپنی موٹر دھیرے دھیرے چلاتا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔اس نے اس کو اگنور کر دیا۔پھر اپنا نام سن کر اس نے مڑ کر دیکھا تو نبینہ بھاگی چلی آرہی تھی قریب آکر بولی۔''توبہ کب سے آوازیں دے رہی ہوں مگر تم نے تو جیسے نہ سننے کی قسم کھالی تھی۔''

وہ بھی بولی۔''مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنے زبردست انکار کے بعد بھی تم چلی آرہی ہوگی۔''

''اشہاب سے لفٹ کیوں نہیں لے رہی ہو؟''وہ اس کے کان میں چپکے سے بولی۔

''میں کسی سے لفٹ نہیں لوں گی۔''وہ بیزاری سے بولی۔''اگر کوئی ٹیکسی یا آٹو رکشا مل

گیا تو ٹھیک ہے۔''

''مجھ سے تو اتنی گرمی میں اتنی دور پیدل نہیں چلا جائے گا۔ پھر پیسے خرچنے کی کیا ضرورت ہے وہ پیچھے پیچھے آ ہی رہا ہے۔ آخر تمہارا منگیتر بھی تو ہے۔''

منگیتر پر اس نے برا سا منہ بنایا۔ شہما نے اس سے بھی برا منہ بنایا۔

آخر نبینہ نے آواز لگا دی۔ ''اشہاب بھائی!'' وہ قریب آ کر رک گیا اور دروازہ کھول دیا شہما پیچھے بیٹھ گئی۔ نبینہ نے آگے بیٹھنا چاہا مگر وہ بولا۔ ''آپ بھی اپنی تشریف پیچھے لے جایئے۔ پیچھے والوں کو آپ کی کمپنی کی زیادہ ضرورت ہے۔'' اس نے سامنے کا دروازہ بند کر دیا اور پیچھے شہما کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ پیچھے بیٹھ کر طرح طرح کے منہ بناتی رہی شہما بھی ساتھ دیتی رہی وہ یہ سب کچھ آئینے میں دیکھتا رہا ساتھ میں دونوں کی کانا پھوسی بھی چل رہی تھی۔ بازار آ گیا شکریہ کہے بغیر وہ اتر گئی۔ نبینہ بولی۔ ''اشہاب بھائی بہت بہت شکریہ! آپ ہم لوگوں کو واپس بھی لے جائیں گے؟''

''اگر شہما کو ضرورت ہو تو۔'' وہ طنز سے بولا۔

شہما آگے بڑھ گئی۔ جب وہ شاپنگ ختم کر کے لوٹیں تو وہ انہیں آئس کریم کی دکان میں بیٹھا دکھائی دیا۔ شہما تو اگنور کرنا چاہتی تھی مگر نبینہ جھٹ سے آئس کریم کی دکان میں گھس گئی۔ اشہاب نے آئس کریم کا آرڈر دے دیا۔ مجبوراً شہما کو بھی آئس کریم کھانی پڑی۔

نبینہ اور شہما دونوں کے لیے اشہاب ایک ناپسندیدہ شخصیت تھا۔ دونوں کو اس سے چڑھ تھی، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ چڑھ نبینہ نے پیدا کی تھی اور برابر پیدا کرتی جا رہی تھی اور یہی چیز دن بہ دن شہما کو اشہاب سے بہت دور لیے جا رہی تھی۔ وہ شہما کی خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا اور امی کا چہیتا بھانجا۔ نبینہ اس کے ماموں کی بیٹی تھی۔ شہما اور نبینہ کی فیملی الگ الگ پورشن میں ایک ہی کوٹھی میں رہتی تھیں۔ خالہ بہت امیر تھیں۔ بہت بڑے بزنس مین کی بیوی تھیں اور بہت ہی عالیشان محل نما کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ذرا بھی غرور نہیں تھا۔ بہت سادہ مزاج خاتون تھیں۔ شہما دو بہنیں تھیں۔ شہما اور بسمہ۔ نبینہ بھی دو بہنیں تھیں نبینہ اور نجینہ۔ نبینہ اور شہما ہم عمر تھیں۔ دونوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں دونوں میں بہت دوستی تھی۔ بسمہ اور نجینہ بھی ایک دوسرے کے برابر تھیں اس لیے ان میں بھی بہت دوستی تھی۔

خالہ نے اپنی اکلوتے بیٹے اشہاب کی شادی کے لیے بھائی کی بیٹی نہ مانگ کر شہما کو

بچپن سے مانگ رکھا تھا۔ وہ اشہاب کی پسند بھی تھی ۔بچپن سے ہی اشہاب اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔اس کے لیے ہمیشہ خوب اچھی اچھی چیزیں لاتا تھا۔اس کو اپنے بچپن کا وہ دن یاد تھا جب امی، خالہ اور ممانی سب ہی لان میں بیٹھے تھے۔ہوا بہت تیز چل رہی تھی مگر خوشگوار بھی بہت تھی۔ پاس ہی گلاب کے بہت خوبصورت تراشے ہوئے پودے لگے ہوئے تھے جو سرخ سرخ گلابوں سے بھرے تھے۔اچانک بہت سے سوکھے ہوئے گلابوں کی پنکھڑیاں ہوا کے ساتھ اوپر اڑنے لگیں۔ سب ہی بچے ان کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے وہ اُڑتی گلاب کی پنکھڑیاں ماحول میں عجب رنگ جما رہی تھیں۔ایک بڑے سے سوکھے گلاب کی پتی بہت اونچائی پر اُڑ رہی تھی کوئی بھی اس کو نہیں پکڑ پا رہا تھا۔اچانک خالہ نے اعلان کر دیا جو بچہ اس پنکھڑی کو پکڑ لائے گا وہ اس کی ایک خواہش پوری کریں گی۔ یہ سنتے ہی سب بچے اس کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ وہ پنکھڑی اونچی بہت اونچی ہوتی جا رہی تھی کسی کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی جیسے اس کو بھی اُس وقت اپنی وقعت پتا تھی۔ اشہاب جو سب سے بڑا تھا اس نے اُچک کر اس کو پکڑ لیا۔سب نے تالیاں بجائیں۔شہما اور نبینہ دونوں کو اس کی جیت پسند نہیں آئی وہ خود اس کو پکڑنا چاہتی تھیں اور خالہ سے اپنی خواہش پوری کروانا چاہتی تھیں۔اب اشہاب پتا نہیں خالہ سے کیا مانگ لے۔

خالہ نے پوچھا۔’’اشہاب تمہاری کیا خواہش ہے؟‘‘

اشہاب نے شہما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔’’میں شہما سے شادی کروں گا۔‘‘

سب ہنسنے لگے۔خالہ نے کہا۔’’چلو ٹھیک ہے یہ ہی تو میری بھی خواہش ہے۔‘‘نبینہ گلاب کے پودوں کے پاس کھڑی تھی چیخ کر روئی سب اس کی طرف مخاطب ہو گئے۔وہ روئے جا رہی تھی۔ممانی گھبرا گھبرا کر پوچھ رہی تھیں۔’’کیا ہوا؟‘‘

اس نے کہا۔’’میری انگلی میں کانٹا چبھ گیا۔‘‘

ممانی اس کو گھسیٹتی ہوئی بولیں۔’’چیخ تو ایسا تھی جیسے دل میں کانٹا چبھ گیا ہو۔‘‘ وہ اس کو لے کر وہاں سے چلی گئیں۔امی نے خالہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔وہ بہت چھوٹی تھی۔کچھ بھی نہیں سمجھ پائی۔اس دن سے نبینہ اشہاب کے خلاف ہو گئی۔اس مخالفت اور نفرت کو اس نے شہما کے دل میں بھی بھر دیا۔وہ اس کو چیپ شخصیت کا آدمی کہتی جس کو نہ اٹھنے کی تمیز تھی اور نہ بیٹھنے کی، نہ بات چیت کا ڈھنگ آتا تھا نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ۔شہما اور اپنے کو بہت اونچی بہت شاندار شخصیت

کہتی تھی جن کے لیے ایسے معمولی شخص کی نہیں، بہت اعلیٰ انسان کی ضرورت تھی۔ایک ایسا انسان جو اُن کی شخصیت کو اور بھی شاندار اور جاندار کر دے۔ دھیرے دھیرے شہما کے دل میں بھی اشہاب کے خلاف بغض بھر گیا۔نبینہ صرف شہما کے سامنے اشہاب کے خلاف بات کرتی تھی مگر اشہاب کے سامنے بہت شریف بنی رہتی تھی لیکن شہما اشہاب کے منہ پر ہی جو چاہتی کہہ دیتی تھی۔ اس کی بے عزتی کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔اس کو ہمیشہ نبینہ کی بات یاد رہتی تھی جو کہا کرتی تھی کہ شہما جیسی شاندار شخصیت، قابل اور خوبصورت لڑکی کے لیے اشہاب جیسا معمولی آدمی نہیں جچتا۔اس لیے اس کو اپنے آپ اشہاب سے چڑھ ہوگئی۔اس کی بات چیت، چال ڈھال،لباس اور طور طریقے سب اس کو چیپ اور برے لگتے تھے۔جب خالہ اور امی ممانی کے سامنے شہما اور اشہاب کے رشتے کی بات کرتیں تو ممانی اور نبینہ دونوں کو برا لگتا۔ممانی کہہ بھی دیتی تھیں۔''اپنے لڑکے کے لیے بہن کی لڑکی نظر آئی بھائی کی نہیں۔'' امی ممانی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھیں۔ ورنہ ممانی کو بھی پتا تھا کہ شہما بچپن سے ہی خالہ کی مانگ تھی۔اشہاب کی پسند تھی اشہاب کو امی کتنا چاہتی تھیں وہ تو ان کا بیٹا بنا ہوا تھا۔

دوسرے دن شائستہ کی سالگرہ میں شہما اور نبینہ گئیں۔ دونوں کا پروگرام ہمیشہ ساتھ ساتھ بنتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ایک ساتھ اسکول اور کلاس میں بھی دیکھی جاتی تھیں۔اشہاب بھی وہاں موجود تھا۔ وہ شائستہ کے بھائی کا دوست تھا جیسے ہی دونوں کی نظریں اس پر پڑیں دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔''لو شیطان یہاں بھی موجود ہے۔''

اشہاب نے سن لیا۔ وہ تو سبز کپڑوں اور اسی رنگ کے زیوروں سے سجی شہما کو دیکھتا ہی رہ گیا۔سبز رنگ کسی پر اتنا اچھا بھی لگ سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن ان کا بدتمیزی سے بھرا جملہ سن کر اس کا موڈ خراب ہوگیا اور وہ کہہ اُٹھا۔''زبان دن بہ دن بہت تیز ہورہی ہے۔اب تو بڑے چھوٹے اپنے پرائے کی تمیز بھی نہیں رہ گئی۔صحبت کا اثر خوب رنگ دکھا رہا ہے۔ زندگی میں پچھتاوے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔''

پھر وہ وہاں نہیں رکا فوراً چلا گیا۔نبینہ پورے وقت اس کا ذکر کرتی رہی۔ شائستہ کی سالگرہ کی ساری خوشی اس نے ختم کردی۔اشہاب اگر وہاں موجود ہوتا تب بھی وہ موضوع بنا رہتا۔

وہ دوڑ دوڑ کر اس کو دیکھنے جاتی اور اس کے خلاف کچھ نہ کچھ لے کر آتی اب جب کہ وہ چلا گیا تھا تب بھی نبینہ کی گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا کیونکہ وہ نبینہ کو ہی ڈانٹ کر گیا تھا شہما کو نہیں۔

اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے۔ اس دن بہت خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ شہما کو بچپن سے ہی ہوا بہت پسند تھی۔ جب بھی اچھی خوشگوار ہوا چلتی وہ لان میں چلی جاتی اور ہوا سے خوب لطف اندوز ہوتی۔ ہوا ہر مردہ چیز میں جنبش پیدا کر دیتی تھی، جان ڈال دیتی تھی۔ یہ حرکت، یہ جنبش اس کو بہت اچھی لگتی تھی۔ بے جان کاغذ جیسے زندگی پا جاتے تھے اور اڑنے لگتے تھے۔ پھولوں کی سوکھی پنکھڑیاں بھی حرکت میں آ جاتی تھیں۔ سوکھے مردہ پتے ہوا کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر چلتے تو ایسا لگتا جیسے ہوا دھکیل دھکیل کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہی ہے اور وہ اس کے ساتھ دوڑے چلے جاتے۔ کبھی کبھی رات کو جب ہوا تیز چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے لان کے پکے فرش پر سینکڑوں لوگ دوڑ رہے ہیں۔ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ایسی ہی آواز پیدا کرتی تھی۔ جب ہوا سے درخت ہلنے لگتے، پتہ پتہ جھومنے لگتا تو اس کو یہ حرکت، یہ جنبش، یہ ہلنا بہت ہی اچھا لگتا۔ نبینہ اور شہما دونوں اچھے موڈ میں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح فضا میں گلاب کی سوکھی پنکھڑیاں اپنے اندر زندگی پیدا کر کے اڑ رہی تھیں۔ دونوں اُچک اُچک کر اس کو پکڑ رہی تھیں۔ اچانک ان کو اشہاب کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔ ''تم دونوں کا بچپن پھر لوٹ آیا کیا؟'' ان دونوں نے دیکھا اشہاب بہت دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھ رہا تھا۔

نبینہ نے کہا۔ ''اچھا اشہاب بھائی وہ جو گلاب کی پنکھڑی بہت اونچائی پر اڑ رہی ہے اگر ہم نے وہ پتی پکڑ لی تو آپ ہم کو کیا دیں گے؟''

اشہاب نے ہنس کر کہا۔ ''مجھ کو ہی لے لینا۔''

شہما نے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں ہر وقت اپنے کو ہی نیلام پر لگائے رہتے ہیں۔''

وہ سمجھا کہ اس کی بات سے شہما برا مان گئی اس لیے جلدی سے بولا۔ ''نبینہ کے لیے میں اپنی پسند کا دولھا ڈھونڈھ لاؤں گا۔''

دونوں کو ہنسی آ گئی۔ نبینہ نے شہما کے کان میں کہا۔ ''ان کو دیکھو اور ان کی پسند دیکھو۔''

اُسی وقت امی نے اشہاب کو بلا لیا۔ دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا جس میں تضحیک چھپی تھی۔ ان قہقہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا مگر اس میں سے ایک قہقہہ اس کے کانوں میں رس گھول گیا اور

بہت ہی اپنا اپنا لگا۔

اشہاب شہما کی نفرت کے اظہار کو محبت سمجھتا تھا۔ اس کی بے اعتنائی کو الفت اور اس کے مذاق اڑانے کو اس کی ادا سمجھتا تھا۔ مگر ایک دن جب شہما اور نبینہ اسکول سے واپس آ رہی تھیں اور اشہاب اپنے دوست کے ساتھ جا رہا تھا۔ اشہاب انہیں نہیں دیکھ پایا مگر اس کے دوست نے ان کو دیکھ لیا اور اشہاب کے کان میں ان کی موجودگی کا اعلان کیا۔ نبینہ اپنی نفرت کے باوجود بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ اشہاب سے بات کرنے اور اپنے گھر دعوت دینے کے لیے۔ شہما بیزار بیزار دکھائی دے رہی تھی۔ آخر نبینہ نے پکار ہی لیا۔ ''اشہاب بھائی آج ہمارے گھر آیئے گا۔ آپ کی پسند کی چیزیں بنی ہیں۔'' شہما کو برا لگا مگر کچھ بولی نہیں۔ اشہاب جب گھر آیا تو وہ شہما سے خفا تھا۔ بغیر پوچھے ہی خفگی کی وجہ بتا دی۔ ''اس کا دوست کہہ رہا تھا کیا اس کی شہما سے ان بن ہو گئی ہے جو وہ اتنی انجان بنی ہے۔ اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی ہے۔'' اس نے شہما سے پوچھ لیا۔ ''شہما آخر وجہ کیا ہے؟'' شہما بغیر جواب دیے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نبینہ کہنے لگی۔ ''ارے اشہاب بھائی جانے دیجیے۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کون غور کرتا ہے۔''

''یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات تو ہے جو میرے دوست نے غور کر لیا۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''آپ کے دوست نے غور کر لیا تو آخر اس میں شہما کا کیا قصور ہے جو آپ اس پر بگڑ رہے ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوئی بولی۔

''شہما سے میرا کیا رشتہ ہے سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ ایک تم اور شہما اس رشتے کو پتا نہیں کیوں مذاق سمجھتی ہو۔''

''نبینہ کیا کرے؟ جو شکوہ شکایت، مہربانی ہے تم شہما سے کہو۔ اپنی ماں سے کہو، اپنی خالہ سے کہو۔'' ممانی طنزیہ انداز میں بولیں۔

اشہاب ویسے ہی غصے میں بھرا رہا۔ شہما اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔ امی خالہ کے گھر گئیں تھیں۔ نبینہ بہت خوش تھی۔ اچھا ہوا اشہاب کو شہما کے دل کا حال پتا چل گیا۔ آگے زندگی خود بخود آسان ہوتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں شہما اس کی پہونچ سے دور ہو جائے گی یا خود اشہاب شہما

کی پہونچ سے دور ہو جائے گا اور یہ دوری اس کے لیے قربت کی راہیں کھول رہی تھی اور وہ دل وجان سے لگی اس دوری کو بہت دور لیے جارہی تھی ۔شہما کی بیزاری اشہاب کی دنیا سے بہت دور چلی جارہی تھی اور نبینہ اپنی کارروائی میں لگی ہوئی تھی ۔نفرت کی اس دیوار کو اونچا بہت اونچا کرنے میں تاکہ دیوار کے اندر چنی ہوئی محبت کبھی بھی ایک دوسرے کو نظر نہ آسکے۔ اس کو جلدی ہی دوسرا موقع مل گیا۔ یہ موقع تھا زیبا کی شادی کا۔زیبا جوان کی دور کی رشتے دار تھی اور شہما کی امی کی بچپن کی سہیلی کی بیٹی تھی۔نبینہ اور شہما کی بھی دوست تھی۔ دونوں نے شادی کی زبردست تیاریاں کی تھیں۔شہما لال رنگ کے کپڑوں اور لال ہی رنگ کے زیور میں کہیں کی شہزادی نظر آرہی تھی۔ اتنی خوبصورت، اتنی باوقار، اتنی شاندار کہ اشہاب کی نظریں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں وہ بغیر پلک جھپکائے اس کو دیکھے ہی جارہا تھا۔نبینہ ہر پانچ منٹ کے بعد آ کر کہتی ۔''اشہاب تو تمہیں نظروں سے نگلے جارہا ہے۔آج گھر چل کر تمہاری نظر اتاروں گی۔ اشہاب کی نظر ضرور لگ گئی ہوگی۔''

ادھر اشہاب سوچ رہا تھا اتنی خوبصورت شئے اس کی ہے۔آج کے یہ لال رنگ کے کپڑے کچھ اشارہ دے رہے ہیں کہ وقت آگیا اس کا بھی دلہن بننے کا۔ پھر وہ ایک دم سے اس کے سامنے پہونچ گیا وہ حیرت سے اس کو دیکھنے لگی۔اس نے کہا۔''آج کیا آپ کا دلہن سے مقابلہ ہے جو لال جوڑا پہن رکھا ہے۔''

شہما نے سوچا، نبینہ ٹھیک کہتی ہے۔ واقعی اس آدمی کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔اس کی باتیں کتنی چیپ اور گری ہوئی ہیں۔

شہاب اپنی دھن میں کہے جارہا تھا۔''یہ رنگ تمہارے اوپر خوب سجتا ہے۔لگتا ہے کہ اب تمہارا وقت بھی آگیا ہے۔ہم کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔''اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا وہ رکا نہیں برابر کہتا رہا۔''شہما! تم کو اس رنگ میں دیکھ کر اپنے بھی ارمان جاگ اٹھے ہیں۔ بہت جلد میں تم کو دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں اپنی دلہن کے روپ میں۔''

ایک دم سے شہما کو غصہ آگیا اور وہ ڈانٹتے ہوئے بولی۔''آپ کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔اتنی چیپ باتیں کرنے کی آپ کی ہمت کیسے ہوئی۔کیا ہر لڑکی سے آپ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں؟''

''ہر لڑکی سے کیوں میں ایسی باتیں کرنے لگا۔تم میری منگیتر ہو تم سے ایسی باتیں

کرنے کا میرا حق ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ حق آپ کو کس نے دیا؟'' وہ غصے سے بولی۔

''ہمارے والدین نے۔'' اس نے بھی غصے سے جواب دیا۔

''تو ان سے ہی جا کر ایسی گری ہوئی چیپ باتیں کریں۔ جنہوں نے آپ کو حق دیا ہے آئندہ مجھ سے ایسی باتیں مت کریے گا۔'' وہ ابھی اور کچھ کہتی اتنے میں نبینہ آ گئی۔ ایسے ہر موقعہ پر وہ آ جاتی تھی۔ وہ ہر وقت ان دونوں پر نظریں رکھتی تھی۔ اس نے دونوں کو غصے میں بھرا پایا۔ وجہ وہ خود بخود جان گئی کہ ان دونوں کی بات ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ لگ رہا تھا کہ آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کر رہی تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ بہت جلد وہ گھڑی آنے والی ہے۔ اشہاب اب دیر نہیں کرے گا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اشہاب نے شہما کی باتوں کا برا نہیں مانا تھا۔ وہ شاید اس کی ادا سمجھا تھا یا اشارہ سمجھا تھا کہ شادی سے پہلے ایسی باتیں چیپ اور گری ہوئی لگتی ہیں۔ جنہوں نے شادی طئے کی ہے انہیں سے بات کرو۔ واقعی میں وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ایسی باتیں شہما سے کرنے کے بجائے اسے اپنے والدین سے کرنی چاہیے تھیں۔ لڑکی سے بذاتِ خود ایسی باتیں کرنا بدتہذیبی اور گری ہوئی حرکت تھی۔ وہ پچھتا رہا تھا، ناحق شہما کا موڈ خراب کیا اور اس کا امپریشن بھی شہما پر غلط پڑ گیا۔ ڈانٹ کے پردے میں شہما کا مشورہ اس کو مان لینا چاہیے اور والدین کے ذریعے شادی کا مسئلہ اٹھوانا چاہیے اور وہ یہ کام بہت جلد کرنا چاہتا تھا۔ نبینہ بہت پریشان ہوگئی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر بزرگ میدان میں اتر پڑے تو حالات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس سے پہلے کچھ کرنا چاہیے۔

دونوں ہر روز کالج میں انگلش کے پروفیسر کا ذکر کرنے لگیں۔ شہما کم نبینہ زیادہ کرتی تھیں۔ اصل میں وہ پڑھاتے وقت شہما کو بہت دیکھا کرتا تھا۔ شہما نے غور نہیں کیا مگر نبینہ ہر وقت کہتی رہتی تھی۔ ''ارے شہما! دیکھو تو سہی کتنا شاندار آدمی ہے۔ کتنی عظیم شخصیت ہے کتنی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر وقت تم کو دیکھتا رہتا ہے۔ تمہارے جیسی اعلیٰ ترین لڑکی کے لیے ایسا ہی اعلیٰ ترین آدمی چاہیے۔ آگے بڑھو شہما اگر اس چیپ آدمی سے نجات چاہتی ہو۔''

اس نے پروفیسر کو دیکھا مگر وہ اس کو کوئی خاص نہیں لگا بس عام سا آدمی تھا بلکہ عام سے بھی معمولی۔ مگر چونکہ نبینہ تعریف کر رہی تھی اس لیے وہ آدمی اس کو اپنا آئیڈیل لگنے لگا۔ ایک دن

جب وہ کالج میں نبینہ کے ساتھ جارہی تھی ایک دم سے پروفیسر دکھائی دیا۔اس کو دیکھتے ہی نبینہ اس کی جانب بڑھ گئی۔ پروفیسر نے پوچھا۔''آپ کی دوست کہاں رہ گئیں۔''

نبینہ نے کہا۔''وہ میری دوست ہی نہیں کزن بھی ہے۔ہم لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔''اس کے آگے اس نے کچھ بھی نہیں سُنا وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔اس نے سوچا کہ اپنے لیے نبینہ ہمیشہ جس آئیڈیل کے لیے سوچتی ہے شاید وہ یہی پروفیسر ہے مگر وہ نبینہ کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے صرف اُس کو ہی دیکھا کرتا ہے کیا وہ پروفیسر کی آئیڈیل ہے؟ واقعی میں نبینہ تو بہت اونچی شخصیت کی مالک ہے۔ پروفیسر اس پر جچے گا نہیں۔نبینہ کے خوابوں کا شہزادہ تو کوئی اور ہے جو عمر بھر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا اور وہ کنواری ہی رہ جائے گی۔صرف انتظار کرتی رہ جائے گی اس کو اپنا اسٹینڈرڈ تھوڑا کم کرنا ہوگا۔اگر صحیح معنوں میں کسی کا انتظار ہے وہ بہت تیزی سے پروفیسر کے بارے میں سوچنے لگی۔

شہما کے تصور کا شہزادہ پروفیسر کے بھیس میں نمودار ہوگیا۔یہ روپ رنگ اس نے نہیں نبینہ نے بنایا تھا۔اس کے آئیڈیل کے سارے انداز، سارے خواب پروفیسر کی شخصیت میں ڈال کر پیش کیے تھے جو قبولیت کا درجہ پا رہے تھے۔اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں سوگئیں تھی اور دماغ کے اندر سے آئیڈیل آئیڈیل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔اشہاب اپنی دنیا میں بچپن کے پیار کو بسائے اس کو دن بہ دن نکھار اور چمکا رہا تھا۔وہ اس کی ہر ادا کا دیوانہ اس کے ہر انداز پر فریفتہ تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے شہما کو دنیا کی ہر خوبصورتی لاکر دے دے۔اس کو مطمئن کر دے اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر دے۔وہ اس کی سب کڑوی باتیں بہت جلدی بھول جاتا تھا۔اس کی ادا سمجھ کر۔ اِس ادا پر ہی تو وہ فریفتہ تھا کیونکہ وہ اس کی زندگی، اس کی محبت، اس کی عبادت تھی۔اسی زمانے میں اچانک اشہاب نے ایک بڑی دعوت کا اعلان کر دیا۔کسی کو کچھ پکانا بھی نہیں تھا۔صرف دعوت میں آکر انجوائے کرنا تھا ایک بڑے ہوٹل کو کھانے کا آرڈر دے دیا گیا۔وجہ بس اتنی تھی کہ ایک دن شہما نبینہ سے کہہ رہی تھی۔''اپنی زندگی بھی کیا ہے اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول۔اس سے الگ کوئی تبدیلی نہیں ہے۔''

نبینہ نے کہا۔''تبدیلی ہوسکتی ہے اگر تم اپنی شادی کا اعلان کر دو۔ بڑا مزہ آئے گا۔ہم لوگ دن رات ڈھولک پر گانے گائیں گے مہمان آئیں گے۔رسمیں چلیں گی۔ سچ کہتی ہوں زندگی

میں تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئے گی۔''

''یہ نیک کام تو تم بھی کر سکتی ہو۔ دوسرے کام ہم سر انجام دے سکتے ہیں۔'' شہما نے ناگواری سے کہا۔

''تم بور ہو رہی ہو۔تمہاری شادی جھٹ پٹ ہو سکتی ہے۔تمہاری تو بات بچپن سے طئے ہے۔اپنے کو تو کوئی ابھی تک ملا نہیں۔ ملتے ملتے ملے گا۔ جب تک تو تمہاری بوریت بھی ختم ہو چکی ہوگی۔''

اشہاب اس کے آگے کچھ بھی نہ سن سکا۔بس اس کے لیے یہی کافی تھا کہ شہما بور ہو رہی ہے کوئی بڑی تقریب ہونی چاہیے۔واقعی میں شادی کی تقریب ہر بوریت کو ختم کر سکتی تھی۔مگر ابھی تو کچھ جلدی کرنا چاہیے اس کو خیال آیا کہ کیوں نہ بڑے پیمانے پر ایک پکنک رکھ دی جائے۔اپنے گاؤں والے باغات میں جس کے کنارے کنارے ندی بھی بہتی ہے یا پھر کسی مشہور پکنک اسپاٹ پر جہاں ندی بھی بہتی ہو۔جھٹ پٹ پکنک کا اعلان ہو گیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔سب لوگ بہت خوش تھے۔ندی کے کنارے دور تک چلنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

اچانک پتا نہیں کیسے وہاں پر پروفیسر دکھائی دے گیا۔نبینہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔اشہاب نے بہت غور سے دیکھا اُسے تو وہ آدمی بالکل پسند نہیں آیا۔نبینہ اس سے باتیں کرتی ہوئی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔اچانک اُسے شہما بھی اُدھر جاتی ہوئی دکھائی دی،لیکن جب تک وہ وہاں پہونچتی پروفیسر چلا گیا اس کی اور شہما کی ملاقات نہیں ہو سکی۔

نبینہ ہنس ہنس کر پتا نہیں شہما کو کیا بتا رہی تھی تب ہی ایک دم سے اشہاب وہاں پہونچ گیا اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''اچھا تو تمہیں اپنی اعلیٰ ترین پسند مل ہی گئی۔''

''جی نہیں مجھے اتنی اعلیٰ پسند نہیں مل سکتی۔ابھی تو مجھے اپنی پسند کی تلاش ہے۔''نبینہ نے جلدی سے جواب دیا۔

''جلدی کرو کہیں دیر نہ ہو جائے۔''اشہاب نے جل کر کہا۔

''دیر بھلے ہی ہو جائے مگر مجھے اپنی اعلیٰ پسند ملنی ہی چاہیے۔جب آپ دیکھیں گے تو خود ہی دنگ رہ جائیں گے۔میری پسند آپ کو بھی پسند آئے گی۔آپ رشک کریں گے اُس دن

جب آپ کو میری پسند معلوم ہوگی۔ کیوں شہما؟''

''اچھا تو ایک گواہ بھی ہے آپ کی اعلیٰ پسند کی تردید کا۔''

''کیوں نہیں، ہم شہما کی پسند جانتے ہیں شہما ہماری۔''

''شہما کی پسند کیا ہے؟''

''وہ تو سامنے ہے۔ شہما کے جیسا کوئی اعلیٰ انسان جو چیپ باتیں نہ کرے۔ اب جس کو اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ نہ ہو، بات چیت کی تمیز نہ ہو، پھوہڑ طریقے سے تیار ہوتا ہو۔ ایسی پسند ہماری شہما کی نہیں ہوسکتی یہ آپ بھی جانتے ہیں۔''

اشہاب کچھ بولے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس کو لگا جیسے شہما نے نبینہ کے ذریعے اپنی مرضی کہلوادی اس کی خوشی میں اور بھی اضافہ ہوگیا آج کا دن کتنا اچھا تھا۔ پکنک رکھنا رائیگاں نہیں گیا۔ اس کو سب کچھ مل گیا۔ نبینہ پکنک پر شہما سے صرف پروفیسر کی باتیں کرتی رہی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کا کیا ارادہ ہے اور اچانک وہ کیا سرپرائز دینے والا ہے۔ اس دن اس نے اشہاب کی باتیں بہت کم کیں اور نہ اشہاب کے خلاف اس کو ورغلایا۔ اور نہ اشہاب کے گھورنے اور باتیں کرنے پر پابندی لگائی۔ اور نہ اس کا مذاق اڑایا۔ پہلی بار وہ صرف پروفیسر کی باتیں کررہی تھی اس کو اعلیٰ ترین انسان کا خطاب دے رہی تھی۔ شہما کو خوش قسمت کہہ رہی تھی کہ اس کو پروفیسر کے بھیس میں اعلیٰ ترین شخصیت مل گئی۔ ایسا انسان ابھی نبینہ کو نہیں ملا ہے خیر جیسے شہما کامیاب ہوئی ہے ایک دن وہ بھی کامیاب ہوگی۔

پھر نبینہ اور شہما اکیلی ٹینس کھیلنے لگیں۔ دونوں بہت اچھا کھیلنا جانتی تھیں۔ اچانک اشہاب بھی ان میں شامل ہوگیا۔ شہما فوراً ہٹ گئی۔ نبینہ اور اشہاب ہی کھیلتے رہ گئے۔ کھیل بہت دلچسپ تھا۔ کبھی نبینہ جیت جاتی اور کبھی اشہاب کی جیت ہوتی۔ مقابلہ ٹکّر کا تھا۔ شہما بیزار بیزار دونوں کا کھیل دیکھتی رہی پھر وہ خالہ اور امی کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اشہاب کو کھیل پھیکا پھیکا لگنے لگا اس نے کھیل ختم کردیا۔ نبینہ کے ساتھ کوئی اور کھیلنے لگا۔ نبینہ نے کھیل جاری رکھا صرف شہما کو دکھانے کے لیے۔ شہما خالہ ممانی اور دوسری مہمان خواتین کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اشہاب اس کو ڈھونڈھتا ہوا وہاں پہونچ گیا۔ کھیلتی ہوئی نبینہ نے دور سے دیکھ لیا اس نے بھی جلدی سے کھیل ختم کیا اور وہاں پہونچ گئی۔

خالہ شہما سے کہہ رہی تھیں۔ ''شہما اگلے اتوار کو تم میرے گھر آ جاؤ۔ تم سے کچھ کام ہے۔''

شہما کے بولنے سے پہلے نبینہ بول پڑی۔ ''شہما اتوار کو کیسے آ سکتی ہے۔ اس دن ہماری دوستیں آ رہی ہیں۔''

شہما کو حیرت ہوئی اس کو تو پتا ہی نہیں تھا کون سی دوستیں آ رہی ہیں۔ نبینہ نے شاید بہانہ بنایا تھا کہ وہ خالہ کے گھر نہ جائے۔ حالانکہ وہ جانا چاہتی تھی۔ خالہ نے کتنے دنوں کے بعد اس کو بلایا تھا ضرور کوئی خاص بات رہی ہوگی۔ نبینہ کو آنے کو نہیں کہا، اس لیے وہ جلدی سے بول دی۔

''تم اپنی دوستیں دیکھنا شہما میرے پاس آئے گی۔'' خالہ نے ہار نہیں مانی۔

''وہ شہما کی دوستیں بھی تو ہیں شہما نے ان کو گھر پر بلایا ہے۔'' نبینہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

''اچھا خالہ میں دوسرے اتوار کو آ جاؤں گی۔'' شہما نے کہہ دیا۔

خالہ کو اچھا نہیں لگا نبینہ کی شہما کی زندگی میں اتنی دخل اندازی، مگر وہ چپ ہو گئیں۔ انہوں نے دوسرے اتوار کے لیے خاص تاکید کر دی تا کہ وہ کوئی اور پروگرام نہ رکھے۔ نبینہ کو تب بھی آنے کو نہیں کہا۔ پکنک ختم ہو گئی تو اشہاب نے شہما کو سنانے کو کہا۔ ''اب دوسری پکنک شہر سے باہر کسی خاص مقام پر ہوگی۔ آپ سب لوگ تیار رہیے گا۔''

لیکن دوسری پکنک کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ نبینہ اور پروفیسر کی گفتگو رنگ لائی دوسرے اتوار کو دوستوں کے بجائے پروفیسر کے گھر والے شہما کا رشتہ لے کر آ گئے۔ شہما کی امی حیران رہ گئیں نبینہ نے کہہ دیا کہ یہ شہما کی پسند ہے۔ امی گھبرائی ہوئی شہما کے کمرے میں گئیں اور بولی۔

''یہ لوگ کیسے آ گئے؟ تمہاری تو شادی اشہاب کے ساتھ طئے ہے۔ مگر نبینہ کہہ رہی ہے کہ وہ تمہاری پسند ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے؟ میں بھی تو سنوں۔ معمولی نوکری، معمولی شکل وصورت، معمولی گھر اشہاب جیسا امیر ترین، کوالیفائیڈ، خوبصورت آدمی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرو گی اشہاب اور اس آدمی کا کوئی مقابلہ نہیں ہے تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے بتاؤ۔ کہاں یہ دو ٹکے کا آدمی اور کہاں ہمارا اشہاب ایک اعلیٰ ترین انسان تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟''

''وہ آپ کی پسند ہے۔ آپ کا بھانجا ہے آپ اس کو بیٹے کی طرح چاہتی ہیں۔ اس میں آپ کو خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں مگر مجھے نہیں۔ اشہاب کے علاوہ کوئی بھی ہو مجھے منظور ہے۔''

''اچھا اشہاب میری پسند ہے اس لیے تمہیں ناپسند ہے۔ ٹھیک ہے جب اشہاب نہیں تو

کوئی دوسرا کیوں؟ یہ پروفیسر کیوں نہیں۔ میں ابھی ہاں کہے دیتی ہوں۔تم اشہاب کی عظمت اور اس کی چاہت کو پہچان نہیں پائیں۔ان لوگوں نے تمہارے کان بھر بھر کراس کی طرف سے تمہیں بدظن کر دیا ہے۔ یادرکھوتم اشہاب کوٹھکرا کر کبھی بھی خوش نہیں رہ سکوگی۔تم کو غلط آدمی سے شادی بہت مہنگی پڑے گی عمر پچھتاوے میں گزرے گی۔''

پروفیسر کے ساتھ اس کی شادی طئے ہوگئی۔ بارات والے دن بہت ہلچل تھی۔ رخصتی سے پہلے اشہاب اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ دلہن بنی کوئی حور لگ رہی تھی اشہاب نے اسے بس ایک بار دیکھا اورنظریں جھکالی۔ پھراس سے مخاطب ہوا۔''شہما میراقصور یہ ہے کہ میں نے بچپن سے تمہیں بہت چاہا۔مگرتم نے میری چاہت کا اندازہ نہیں لگایا۔تم مجھے اور میری چاہت کو پہچان نہیں پائیں۔تمہارے آئیڈیل کے بہت چرچے ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس میں کیا خوبی ہے؟ چلو میں تمہارے قابل نہیں تھاتم ایک اونچی چیز تھیں مجھ سے بہت اونچی۔تو تمہاری پسند اُسی مناسبت سے ہونی چاہیے تھی۔تمہاری پسند اتنی چیپ؟ اتنی گئی گزری، اتنی گھٹیا ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

شہما نے بہت غور سے اس کی باتیں سنیں اور ایک نظر اس پرڈالی شاید پہلی بار اس کوٹھیک سے دیکھا وہ تو کالی شیروانی میں بہت خوبصورت، بہت اسمارٹ بہت شاندار نظر آرہا تھا۔ باتیں کرنے کا انداز کتنا دلکش تھا دل چاہ رہا تھا کہ بس سنتی چلی جائے اور بات ختم نہ ہو۔ وہ کتنی جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔سامنے بیٹھا دولہا اس کا غلام نظر آرہا تھا۔ یہ تو وہی شخصیت، وہی آدمی تھا جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی صرف وہ ہی نہیں نبینہ بھی۔ وہ پہلے اس کونظر کیوں نہیں آیا وہ تو بچپن سے اب تک سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ پھراس کی خوبیاں، اس کی شخصیت، بات چیت کادلکش انداز کیوں اس سے پوشیدہ تھا۔وہ تواس کا تھا ہمیشہ سے اس کا۔آج جب وہ اس کے دل کا بنا،تو بہت دیرہو چکی تھی۔اس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوگئی تھیں مگراس وقت تو اصلی آنکھیں اندھیرے میں ڈوبی جارہی تھیں۔اس کو عجیب سا پچھتاوا ہورہا تھا سر چکرارہا تھا، دل ڈوب ڈوب کرابھر رہا تھا۔آج اس کو اپنے محبوب کے درشن ہوئے تو وہ کسی انجانے انسان کی ہو چکی تھی بلاوجہ زندگی میں ٹریجڈی آگئی تھی۔ وہ بدحال ہورہی تھی۔آنکھیں خشک تھیں۔دل رورہا تھا،فریادکررہا تھا یہ چیخیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں مگر کچھ فائدہ نہیں تھا۔رخصتی کا وقت آگیا

اوراشہاب دلہن کوسنبھالے بڑھ رہا تھا امی اور خالہ کی نظریں ایک ساتھ ان پر پڑیں۔خالہ رونے لگیں اور بولیں۔''ہائے ہائے کیسی شاندار جوڑی تھی جانے کس کی نظر لگ گئی جوایک لنگور لیے جا رہا ہے۔''امی نے بھی اپنا سر پکڑ لیا۔وہ رخصت ہوکر پروفیسر کے گھر چلی گئی۔

شہما کی شادی کے کچھ دن بعد ہی اس کو نبینہ کی شادی کا کارڈ ملا۔دولہا کا نام دیکھتے ہی وہ حیرت میں پڑ گئی۔وہ اشہاب تھا جس سے نبینہ نفرت کرتی تھی جواس کی ناپسندیدہ شخصیت تھا۔ پتانہیں نبینہ اس سے شادی کرنے پر کیسے راضی ہوگئی۔اس نے سوچا کہیں زبردستی کی شادی تونہیں ہے۔کارڈ کے ساتھ نبینہ کا خط بھی تھا جس میں لکھا تھا۔

''شہما! کارڈ پا کر تمہیں حیرت ہوگی اور ہونا بھی چاہیے۔تمہاری شادی کے فوراً بعد دونوں پھوپھیاں اشہاب کا رشتہ میرے لیے لائیں جواماں نے مجھ سے پوچھے بغیر منظور کرلیا۔ تب میں نے اشہاب کے لیے سوچا۔شہما! وہ اتنا برانہیں ہے جتنا ہم دونوں سوچتے تھے۔شادی طئے ہوتے ہی مجھے لگا کہ یہی تو میرا آئیڈیل تھا جس کا میں برسوں سے انتظار کررہی تھی جو مجھے کہیں نظرنہیں آرہا تھا۔خوبصورت،خوب سیرت،شاندار شخصیت کا مالک،اعلیٰ تعلیم یافتہ،دولت منداور بات چیت کا انداز اتنا دلکش کہ بس سنتے ہی چلے جاؤ دل نہ بھرے۔ہر خوبی تواس میں ہے جس کی ہر لڑکی کوتلاش رہتی ہےاورکسی ایک انسان میں ساری خوبیاں کم نظر آتی ہیں کوئی نہ کوئی خامی رہ جاتی ہے مگراشہاب ایک پرفیکٹ انسان ہے جوصرف خوبیوں کو لے کرہی بنا ہے۔ایک مثالی انسان ہے جوکسی کی زندگی کومکمل بنا سکتا ہے۔دنیا کی ہر خصوصیت اس میں موجود ہے۔جب وہ تمہارا منگیتر تھا تو مجھے یہ سب خوبیاں،اچھائیاں نظرنہیں آتی تھیں۔میرا منگیتر بنتے ہی اس میں مجھے خوبیاں ہی خوبیاں،اچھائیاں ہی اچھائیاں نظر آنے لگیں۔میں بہت خوش ہوں بہت زیادہ الفاظ میں اپنی خوشی بیان کرنے سے قاصر ہوں۔کاش تم اس وقت میرے پاس ہوتیں تو دیکھتیں کہ میرے چاروں طرف کیسا خوشیوں کا حصار ہے۔خوشیوں کا یہ ہالہ چاند کی طرح مجھے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔میں اس سے باہر نہیں آنا چاہتی اس کی قید میں رہنا چاہتی ہوں،عمر بھر کی قید میں۔ شادی میں تم کم از کم پندرہ دن پہلے آنا تب باتیں ہوں گی۔تمہاری اورتمہارے پروفیسر کی۔نبینہ۔''

خط پڑھ کروہ سکتے میں آگئی۔نبینہ نے کتنا بڑا گیم کھیلا تھااس کواوراشہاب کوالگ کرنے میں۔بچپن سے ہی وہ اشہاب کی نفرت لے کراس سے چپک گئی تھی۔جب وہ اس کا منگیتر تھا تو

حقیر تھا اب نبینہ کا منگیتر ہے تو عظیم ہے۔مگر وہ اس عظمت کو رہنے کہاں دے گی۔ پروفیسر جیسے گھٹیا آدمی سے اس کی شادی کروا کر نبینہ اپنا آئیڈیل کیسے پا سکتی ہے وہ کبھی بھی نبینہ کو چین نہیں لینے دی گی۔ وہ اب انتقام لینے کے لیے اس کی طرح اسی سے چپک جائے گی اور عمر بھر چپکی رہے گی اور یہ انتقام کتنا خوف ناک ہوگا نبینہ سوچ بھی نہیں سکے گی۔اس نے نبینہ کو جواب لکھا۔

''نبینہ تمہارا خط اور کارڈ دونوں ملے۔تمہارے پاس تو بہت سے لوگ ہیں خالہ کے پاس میرے سوا اپنا کوئی نہیں ہے۔ میں تو خالہ کی طرف سے شرکت کروں گی اور باراتی بن کر تمہاری شادی میں آؤں گی۔ پھولوں کی چھڑیاں کھانا مجھے کتنا پسند ہے یہ تم بھی جانتی ہو۔اشہاب جب میرا منگیتر تھا تو وہ حقیر اور چیپ نہیں تھا وہ ہمیشہ سے تمہارا آئیڈیل تھا تم اپنے آئیڈیل کی جو جو خوبیاں بیان کرتی تھیں وہ سب خوبیاں اشہاب میں موجود تھیں بلکہ تم نے اس کی خوبیوں کو لے کر ہی اپنا آئیڈیل بنا ڈالا بس کسی طرح اس کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تم سوچا کرتی تھیں۔تم مجھ کو بیوقوف بنا رہی تھیں۔ پروفیسر جیسے آدمی سے جھٹ پٹ میری شادی کروانے میں تم کامیاب ہو گئیں۔تم نے اپنا راستہ صاف کر لیا۔میری عقل پر پردہ ڈال دیا۔اشہاب سے نفرت اور حقارت کا پردہ۔مگر نبینہ! وہ پردہ اب ہٹ چکا ہے۔ایک مہینہ پہلے ہی خالہ کے پاس پہونچ جاؤں گی۔نئ دلہن ہوں ہر وقت سجی دھجی اس کے سامنے رہوں گی تم اس کی نظروں میں کبھی بھی نہیں چڑھ سکوگی اپنی خوبصورتی کے باوجود، تم کبھی بھی اس کی آئیڈیل نہیں بن سکوگی۔ یہ میرا دعویٰ ہے اب اس کو میرا پیار ملے گا جس کا وہ ترسا ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ صرف اِسی وجہ سے تم سے شادی کر رہا ہو کہ میں تمہارے بہت قریب ہوں اور اس کو ہمیشہ میری چاہت ملتی رہے۔بچپن میں جب اس نے مجھ سے شادی کے لیے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا تو تمہاری انگلی میں کانٹا چبھا تھا۔اب ممانی کا کہنا بھی پورا ہوگا تمہارے دل میں کانٹا چبھے گا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کی چاہت، اس کا پیار ہوں۔اس کی پہلی پسند ہوں تم یہ کبھی مت بھولنا کہ تم اس کی دوسری پسند ہو اور ہمیشہ دوسری پسند ہی رہوگی۔شہما۔''

اشہاب جیسے ہی شہما کے گھر اس کی امی سے ملنے پہنچا ڈاکیے نے شہما کا خط اس کو تھما دیا۔شہما کا خط نبینہ کے نام تھا۔اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ خط کو پڑھے اور دیکھے شہما کس حال میں ہے۔ وہ اپنا تجسّس نہیں روک سکا۔اور اس سے اخلاقی گناہ سرزد ہوگیا۔اس نے وہ خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔خط کتنا عجیب تھا۔کتنا درد، کتنی مایوسی بھری ہوئی تھی۔ایک ٹوٹے ہوئے مجبور

دل کی پکار تھا۔اس کے اپنے دل کا سارا درد جیسے باہر آ گیا۔زندگی کیسے کیسے ڈرامے کھیلتی ہے۔وہ اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے انجان رہا۔اس کو پتا ہی نہیں چل سکا ورنہ وہ اس ڈرامے کا یہ انجام نہیں ہونے دیتا۔وہ اس کو ختم کر سکتا تھا اس کا ختم کرنا خود اس کے اپنے ہاتھ میں تھا پتا نہیں وہ کیوں ایک خاموش تماشائی بنا رہا۔شاید اس موڑ پر لانے کے لیے یہ موڑ جو اچانک اس کی زندگی میں آ گیا تھا مگر کیسے؟ اور کب؟ اس کو پتا ہی نہیں چلا۔اس کا اپنا درد جیسے دل کے لہو میں غرق ہو گیا۔ اس نے خط کو ٹھیک سے بند کیا اور اندر چلا گیا۔جب نبینہ اس کی طرف سے گزری تو اس نے بلا کر وہ خط دے دیا۔

''کس کا خط ہے۔'' شہما کی امی نے پوچھا۔

''شہما کا خط ہے۔'' جواب اشہاب نے دیا۔

''شہما کا خط ہے۔ذرا زور سے پڑھو میں بھی تو سنوں اس نے کیا لکھا ہے؟ ہم لوگوں کو تو اس نے خط نہ لکھنے کی قسم کھا لی ہے۔'' شہما کی امی شکایتی لہجے میں بولیں۔

''بہت اچھا خیال ہے خالہ آپ کا۔واقعی میں یہ خط زور سے پڑھا جانا چاہیے۔تا کہ ہم لوگ بھی سن لیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا اور اس نے سوچا کہ سچ میں اگر نبینہ زور سے وہ خط پڑھ دے تو سننے والوں کو مزہ ہی آ جائے۔شہاب کی نظریں نبینہ کے چہرے پر رک گئیں جس کا چہرہ خاموشی سے خط پڑھتے پڑھتے رنگ بدلنے لگا تھا۔اچانک اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور خط اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔جب تک نبینہ جھک کر اُٹھاتی اشہاب نے لپک کر وہ خط اٹھا لیا اور نبینہ کو دیتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا،''دوسری پسند۔''

نبینہ لرز گئی اس نے سوچا کیا اشہاب نے وہ خط پڑھ لیا ہے؟ وہ اپنے آپ میں اور بھی کانپ گئی اس کو لگا جیسے اشہاب کہہ رہا ہو۔''تم میری دوسری پسند ہو مگر تمہاری اور شہما کی پسند ایک تھی،یعنی میں صرف میں۔''

◆÷◆

چاند کا چکور

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ باہر دلفریب چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کی خوشبو میں ڈوبے ہوئے خوشگوار ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ سب ہی لوگ چاندنی میں بیٹھے ہوئے چاند کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہنسی مذاق کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ صرف سنیجہ اپنے عالی شان محل کے بڑے سے ہال میں اکیلی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے بھی پڑے ہوئے تھے۔ چاندنی راتوں سے اس کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ کبھی بھی چاندنی میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ویسے رات کی دلکشی کا اس کو بھی احساس تھا۔ اس کا دل بند کمرے میں بھی اس کو محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اس کے سب پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہال میں داخل ہو گئے۔ سنیجہ کو جاگتا پا کر سب نے کہانی کی فرمائش کر دی۔ چھوٹے بچے لپکتے ہوئے اس کے بستر پر آ گئے۔ بڑوں کو بھی جہاں جگہ ملی وہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں آپس میں ایک دوسرے کے منگیتر تھے۔ کچھ کے عشق کا معاملہ چل رہا تھا۔ ندیرا اور سمران ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ صبال کا مذاق عروج پر تھا۔ اچانک راشف نے پوچھ لیا۔ ''ایک بات بتایئے دادی جان، آپ کے وقت میں عشق وغیرہ تو نہیں ہوگا۔ ادھر بڑی ہوئیں اور رخصت ہو گئیں ایک اجنبی کے ساتھ۔'' سنیجہ بیگم نے بہت پیار سے جواب دیا۔ ''بیٹا! کیا میں شاہجہاں اور ممتاز سے بھی پرانی ہوں؟ ان کے عشق کی مثال تاج محل تو سامنے ہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے بھی کسی سے پیار کیا تھا وہ ہمارے دادا جان تھے یا کوئی اور؟ سچ بتایئے گا دادی جان۔'' راشف کا یہ سوال اس کو خاموش کر گیا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ایک تڑپ باہر آنے کو مچلنے لگی۔ بچے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ وہ خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ سنیجہ کے لیے وہ رات بہت بھاری ہو گئی۔ آج برسوں بعد وہ نہ جانے کس دنیا میں چلی گئی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ وہ بھی جیسے ایک ننھی سی بچی بن گئی۔ پھر ایک حسین نازک سی دوشیزہ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ وہ دنیا تھی جہاں کتنے ہی لوگ اس کے ناز و نخرے

اٹھانے کو موجود تھے۔ وہ دور بہت دور اپنے باپ دادا کی حویلی میں پہونچ گئی۔ رونق سے بھری حویلی۔ دادا نانا سگے بھائی تھے۔ دونوں کی حویلیاں ایک ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ دونوں بہت بڑے نواب تھے، دونوں کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ گھر میں پچاسوں نوکر چاکر آگے پیچھے گھومتے تھے۔ دادا کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ نانا کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ سب ہی شادی شدہ بچوں والے تھے۔ سب ملا کر ایک بہت بڑا خاندان تھے، ایک ایسا خاندان جو آپس میں پیار و محبت سے جڑا ہوا تھا۔ سنیحہ سب سے چھوٹے بیٹے کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد شجاع کو دادا دادی بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا اپنے ددھیال اور ننھیال دونوں جگہ بہت اعلیٰ مقام تھا۔ سب ہی لوگ اس کو بہت چاہتے تھے۔ رواج کے مطابق سب کزن کسی نہ کسی کزن سے منسوب تھے اور بچپن سے ہی ایک دوسرے کے نام سے چڑھائے جاتے تھے۔ ایک سنیحہ کا جوڑا ان دونوں حویلیوں میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کے لیے کسی باہر کے خاندان سے کوئی شہزادہ آنا تھا۔ دادی مجیدہ بیگم اور نانی صابرہ خاتون جب بات کرتی تھیں تو یہی کہتی تھیں۔ ''ہماری سنیحہ تو تاروں کی شہزادی ہے۔ اس کے لیے تو چاند جیسا دولہا آئے گا۔''

عارف نے مذاق میں کہا۔ ''کہیں وہ خود چاند تو نہیں ہوگا؟''

سب ہنس پڑے تھے۔ پھر سب لوگوں کو ایک دوسرے کی منگیتر سے چڑھایا جاتا تھا اور اس کو چاند سے چڑھایا جاتا۔ جیسے ہی آسمان پر چاند نمودار ہوتا ہر طرف سے ایک ہی آواز آتی تھی۔ ''سنیحہ کا دولہا آ گیا۔'' سنیحہ سچ مچ شرما جاتی تھی۔ پتا نہیں چاند کے نام سے یا دولہا کے نام سے۔ شانجہ کہتی۔ ''ارے یہ چاند کتنی بے حیائی سے ہماری سنیحہ کو دیکھا کرتا ہے ہم سب کے سامنے۔'' فیما بھی پیچھے نہیں رہتی اور کہتی۔ ''چاند جب ہماری سنیحہ کو دیکھتا ہے تو وہ اور بھی پیاری ہو جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر کیسی چمک آ جاتی ہے جیسے چاند اس پر خود فدا ہو رہا ہو۔''

ہمیشہ دونوں حویلیوں کی کسی نہ کسی چھت پر یہ مذاق چلتا رہتا، سب ہنستے تھے، بڑے بھی اس مذاق میں حصہ لیتے تھے۔ پھر بابا کا ٹرانسفر دوسرے شہر میں ہو گیا۔ وہ اس حویلی سے دور چلی گئی۔ گھر میں دولت کے انبار تھے، مگر بابا جو شہزادے تھے ان کو نوکری کا شوق سوار ہو گیا۔ وہ بہت پڑھ لکھ گئے تھے۔ بیکار راجا نوابوں کی طرح بیٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ شہر شہر گھومتے رہتے تھے۔ یہ ان کا ایڈونچر تھا۔ وہ ایڈونچر پسند تھے۔ سنیحہ کا اب کبھی کبھی حویلی آنا ہوتا تھا۔ سنیحہ خوابوں کی دنیا میں

رہنے لگی۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ چاند جیسا خوبصورت تھا۔ تب ہی تو اس کو چاند سے عشق تھا۔ پھر چاند کا یہ عشق بڑھتا ہی گیا۔ واقعی میں اس کی کزن ٹھیک کہتی تھیں چاند کا حسن اس کی چمک دمک اس کے چہرے پر اتر آئی تھی جس کو وہ خود بھی محسوس کرتی تھی۔

جب بھی آسمان پر چودھویں کا چاند چمکتا تھا وہ بہت بیتابی کے ساتھ اپنی چھت پر ٹہلتی تھی۔ دور بہت دور ایک مکان کی کھڑکی بھی کھل جاتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی، دو آنکھیں چاند پر جم جاتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی طرح۔ چاند اپنی چمک کا تھوڑا سا حصّہ سنیجہ کو بھی دے دیتا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا جو اچانک اس کے چمکتے ہوئے چہرے کو چاند سے زیادہ دیکھنے لگا۔ وہ گھر اتنی دور تھا کہ چاندنی میں شکلیں صاف نہیں تھیں۔ صرف ایک دوسرے کے چہرے کی چمک ان کو دکھائی دیتی تھی۔ چاند کا عشق اب چاند کا نہیں رہا تھا۔ وہ عشق ایک دوسرے کا بن گیا تھا۔ اندھیری راتیں پر چھائیں رہتی تھیں، مگر چاندنی راتیں چہروں کے چاند کو بھی روشن کر دیتی تھیں۔ جیسے ان دونوں کو ملانا چاہتی ہوں۔ چاند دور سے یہ نظارہ دیکھتا۔ چاند کو چاہنے والی سنیجہ کو زمین کا چاند مل گیا تھا۔ مگر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے چاند کے محتاج تھے۔ سنیجہ چاندنی راتوں میں چاند کو دیکھتی تھی دور بہت دور وہ اس کو دیکھتا رہتا تھا۔ وہ سخت ترین پردہ کرتی تھی۔ کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ گھر میں امی جان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی اس لیے چاندنی راتوں میں وہ اکیلی ہی چھت پر جایا کرتی تھی اور اس کے ساتھ وہ چاند ہوتا تھا جس کو وہ بہت پیار سے دیکھا کرتی تھی۔ چاند بھی اس پر قربان ہو کر اپنا نور نچھاور کرتا رہتا تھا اور دوسری چھت پر وہ چاند کو بھول کر اس چمکتے ہوئے انسانی چاند کو دیکھا کرتا تھا۔

پھر اچانک ایک دن اس کے ہاتھوں میں ایک پرچہ آ گیا۔ کسی بے تاب دل کی فریاد لے کر اس میں لکھا تھا۔ ''یہ چاند بہت خوبصورت لگتا ہے جب ہم تم دیکھا کرتے ہیں۔ چاند کے نور میں لپٹا ہوا ایک حسنِ مجسم ہوتا ہے جس کو ہم بھی دیکھتے ہیں اور چاند بھی دیکھتا ہے۔'' وہ یہ پرچہ پا کر حیران رہ گئی چاند کی اہمیت اس کی نظروں میں اور بڑھ گئی۔ چاندنی راتوں میں چھت پر ٹہلنا اور بھی اچھا لگنے لگا۔ پھر پیاری بھری یہ چٹھیاں آتی رہیں۔ ماحول میں مہکتی رات کی رانی کا ذکر لے کر، بدلی سے شکوہ کرتی فریاد بن کر جو چاند کو چھپا دیتی تھی۔ ساتھ میں زمین کا چاند بھی اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ نورانی راتوں میں چمکتے ہوئے حسن کا تذکرہ بن کر۔ یہ چٹھیاں اس کی زندگی

بن گئیں۔ اندھیری راتوں میں جب چاند کھو جاتا تو یہ چٹھیاں چاند بن کر چمکتی تھیں۔ دن رات وہ ان کو پڑھا کرتی تھیں جو چاند ان کی چھتوں پر اتارا کرتا تھا۔ یہ چٹھیاں اس کو دور بہت دور لے جایا کرتی تھیں۔ پتا نہیں وہ کون تھا؟ جو چاندنی راتوں کا نور بن کر اس کی زندگی میں اتر پڑا تھا۔ ہر روز ایک چٹھی آنے لگی جو چاند کی خوبصورتی اور اس کی خوبصورتی سے بھری ہوتی تھی۔ پورے ماحول کی بہت خوبصورت عکاسی ہوتی تھیں۔ چٹھیاں بھیجنے والے کو کبھی بھی جواب کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ نہ اس نے کبھی جواب دیا۔ جس کا نہ کوئی نام تھا اور نہ نشان۔ سنیجہ کا جواب اس کے شاہی خاندان کی آن پر بٹّہ بن جاتا کسی چھوٹے آدمی سے اس کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ کیوں اپنے نام پر بٹّہ لگواتی۔ وہ تو اپنے بھرپرے خاندان کی چاہت تھی، خوبصورت ارمان تھی، سب کی جان تھی، سب کا پیار تھی۔

صرف ایک آدمی کے لیے وہ اپنے اتنے لوگوں کو کہاں خفا کرسکتی تھی۔ اس کا خاندان بہت زیادہ رسم ورواج میں بندھا ہوا تھا۔ شادی بیاہ ٹکّر والوں سے ہوتا تھا۔ وہ اگر ایک معمولی گھر میں رہ رہی تھی تو یہ اس کے شہزادے بابا کا شوق تھا۔ ان کا ایڈونچر تھا۔ ان کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آن بان تو خاندانی حویلیوں اور محلوں کی شان وشوکت سے جڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ایک معمولی گھر کا باشندہ اس کے شاہی خاندان سے ٹکّر کیسے لے سکتا تھا۔ وہ صرف کاغذ کے چند ٹکڑے بھیج سکتا تھا کیونکہ حویلی کی سختیاں یہاں نہیں تھیں۔ وہ صرف ان کاغذوں پر لکھی عبارت کو پڑھ سکتی تھی اور چھت پر ٹہل کر چاند کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ واقعی میں چاند تھی اور چکور اس کی پہونچ سے دور تھا بہت دور۔

چٹھیوں میں دو چار سطریں ہوتی تھی مگر اس میں جیسے دونوں کا دل دھڑکتا تھا لکھنے والے کا بھی اور پڑھنے والے کا بھی۔ ”تم حسن کی شہزادی میں عشق کا شہزادہ بس اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“ لیکن وہ کیسے مان لیتی کہ وہ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سچ مچ کی شہزادی تھی اور سچ مچ کی شہزادی کو عشق کا شہزادہ نہیں پاسکتا تھا اس کی دنیا میں سچ مچ کا شہزادہ ہی آسکتا تھا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ دوسرے دن ایک اور چٹھی آگئی۔ ”کاش تم سچ مچ کی شہزادی ہوتیں تو میں ہاتھ بڑھا کر لے لیتا۔ اس گھر کو آگ لگا دیتا یا میں بھی اس گھر کا ہوتا جس میں رہتا ہوں تو کتنا اچھا ہوتا۔“ وہ سمجھ نہیں سکی آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے شاید وہ پاگل ہوگیا ہے۔ اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ وہ ایک شہزادی ہے وہ خود اس چھوٹے گھر سے بیزار دکھائی دے رہا تھا جس نے اس کے پیار میں دوری

پیدا کر دی تھی چاند اور چکور کی دوری۔

شاید روز یہ خط اس کی دنیا میں ہلچل مچانے کے لیے آتے تھے۔شاید اس کی یادوں میں بسنے کے لیے آتے تھے مگر اس کی زندگی کا سرمایہ دو لائنوں کے خط بن گئے۔وہ چٹھیاں آتی رہیں اور اس کے دل میں چسپاں ہوتی رہیں۔دونوں طرف ایک دوسرے کو جاننے یا پہچاننے کی نہ آرزو تھی نہ تمنا۔اس کو معلوم تھا زیادہ میل جول بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔بغاوت کا اس نے صرف نام سنا تھا مگر اپنی زندگی یا اپنے خاندان میں دیکھی نہیں تھی۔اس میں بغاوت کا دم ہی کہاں تھا۔اس کو اس چٹھی والے کی اوقات معلوم تھی۔اس کو اپنی ویلیو اپنی وقعت پتا تھی۔وہ اپنے خاندان کی، اپنے بابا کی، اپنی امی جان کی ہر دلعزیز ہستی تھی۔سب اس کو کتنا پیار کرتے تھے،اس پر کتنا فخر کرتے تھے۔اس کا دولہا چاند تھا جو آسمان کی بلندیوں پر حکومت کرتا تھا۔زمین کے جھونپڑے آباد نہیں کرتا تھا۔وہ بہت کمزور تھی اپنے گھر والوں کے خلاف جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔اگر وہ ایسا کرتی تو اتنے بڑے خاندان کے سامنے اس کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا،شکست عظیم اٹھانی پڑتی ذلت و رسوائی ملتی وہ الگ۔ایک غلط عشق کے ہاتھوں وہ تباہ و برباد نہیں ہونا چاہتی تھی۔اپنا وقار اپنی عزت نہیں کھونا چاہتی تھی۔دل لگی کو دل کی لگی نہیں بنانا چاہتی تھی۔دل کی لگی کو دنیا کو نہیں دکھا سکتی تھی۔اپنا حق نہیں منوا سکتی تھی۔اس کا حق کیا تھا؟ یہ گھر والوں کی ذمہ داری تھی اس کی نہیں۔یہ معمولی گھر کا آدمی اس کے خواب دیکھ رہا تھا۔اس کو اپنے جوڑ کا سمجھ رہا تھا یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ معمولی گھر اس کے بابا کا ایڈونچر تھا۔ایک شہزادے کی شہزادگی کی ادا تھی۔جو وہ پڑھ لکھ کر ایک معمولی نوکری کر رہے تھے۔اس جگہ پر جس طبقے کے لوگ رہتے تھے اسی طبقے کی طرح رہ رہے تھے۔

معمولی گھر سے پھر چٹھی آ گئی۔''چاند نے ہم کو نور بھرا تحفہ ضرور دیا مگر پھر بھی میری چاہت یک طرفہ ہی رہی۔کاش میں تم کو پا سکتا۔''

وہ ہنس دی۔ایک غمزدہ سی ہنسی۔وہ معمولی گھر اس سے اور اس کی زندگی سے چپکا جا رہا تھا،قریب آتا جا رہا تھا، چٹھیاں بن کر۔محبت بن کر۔وہ پریشان تھی کیا کرے کیا نہ کرے۔اب شاید زندگی میں ٹریجڈی شروع ہونے والی تھی۔اچانک خطوں کے انداز بدل گئے۔وہ خط چیخ چیخ کر الوداع کہہ رہے تھے اور واقعی میں وہ دن آ گیا جب بابا نے استعفیٰ دے دیا اور اپنی حویلی میں اپنی شاہی شان اور وقار کے ساتھ واپس آ گئے۔چاند کا حسن ماند پڑ گیا۔چاند دل سے اتر گیا۔چاند

جیسے دولہا کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اب بھی اس کو ریشا، نشاجہ، شانجہ، میشا، فیما، ثوبیا سب چاند سے چڑھاتی تھیں۔ وہ اب بھی اس کا دولہا کہلاتا تھا۔ ایک دن چڑھ کر وہ کہہ اٹھی۔ ''مجھے چاند جیسا دولہا نہیں چاہیے۔ وہ میری پہونچ سے بہت دور ہے۔ مجھے زمین کا دولہا چاہیے۔ چاہے وہ کسی محل اور حویلی میں نہ رہتا ہو کسی معمولی گھر میں رہتا ہو۔''

سب ہی کزن خاموش ہوگئیں۔ اس دن پہلی بار سنیجہ برا مان گئی تھی۔ اس کو کیا ہوا تھا۔ اب شاید وہ بڑی اور سمجھدار ہوگئی تھی۔ یہ کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ایک چاند سمجھ سکتا تھا۔ وہ بھی اب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیگانہ بن گیا تھا۔ کاغذ کے چند ٹکڑوں میں لپٹ گیا تھا اور کاغذ کے وہ ٹکڑے اس کے دل میں چھپ گئے تھے۔ کوئی بھی ان کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی ان کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ راز اس کا تھا صرف اس کا۔ یہاں تک چکور بھی اس کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ جانے کون تھا اور کہاں تھا؟

اچانک حویلی میں اس کے چچا کی بیٹی ثوبیا کی شادی ایشان اور شانجہ کی شادی رفال سے طئے ہوگئی۔ حویلی میں دھوم دھام بڑھ گئی۔ ثوبیا تو سنیجہ کی بہت پیاری سہیلی تھی۔ وہ دل میں کسی انجانے محبوب کا درد چھپائے خوشی خوشی ہر رسم میں حصہ لے رہی تھی۔ شادی کے گیتوں میں بھی شامل تھی ٹوٹے ہوئے دل اور اپنے زخمی وجود کے ساتھ۔ سب یہی کہہ رہے تھے وہ اور خوبصورت ہوگئی ہے اور بہت زیادہ میچور اور سمجھ دار بھی ہوگئی ہے۔ اب بھی لوگ اس کو چاند سے چڑھاتے تھے، مگر اس نے خود چاند سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھالی تھی۔ اب بھی حویلی میں چاندنی راتوں میں محفلیں جمتی تھیں۔ شعروشاعری چلتی تھی۔ ایک دوسرے کو ان کے منگیتروں سے چڑھایا جاتا تھا۔

دنیا کی نظروں میں سنیجہ اب بھی چاند کی تھی یا چاند سے دولہا کی۔ سب ہی کزن اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور وہ چاند کو دیکھ کر بھاگ رہی تھی۔ ثوبان نے کہا۔ ''چاند کو دیکھ کر ایسے بھاگ رہی ہے جیسے وہ سچ مچ اس کا دولہا بننے والا ہے۔''

شامق بولا۔ ''ہم لوگوں کی سچ مچ کی منگیتر تو بیٹھی ہیں وہ تو نہیں بھاگ رہی ہیں۔''

ثوبیا بولی۔ ''وہ بے غیرت ہیں۔ ہماری سنیجہ تو حیا دار ہے۔ وہ کیوں چاند کا سامنا کرے۔ چاند آتا بھی تو نہیں ہے اس کو بیاہنے کے لیے۔''

رفاق راسیہ سے بولا۔ ’’چلو تم بھی بھاگو کچھ تو سیکھو چھوٹی سے۔‘‘

وہ واقعی وہاں سے بھاگ گئی۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ شامق بھی پیچھے نہیں رہے۔ وہ روجا سے بولے۔ ’’آپ کو کیا انتظار ہے جو یہاں تشریف رکھے ہیں۔‘‘ روجا نے جھٹ سے جواب دیا۔ ’’صرف لڑکیاں ہی کیوں بھاگیں۔ آپ لوگ کیوں بے غیرتوں کی طرح لڑکیوں کے کمرے میں گھسے ہیں۔‘‘ روجا کی بات سن کر دادی اور نانی نے ایک ساتھ اپنا ماتھا پیٹ لیا اور بولیں۔ ’’ارے بے غیرتوں! کچھ تو حیا کرو۔ چلو لڑکو بھاگو یہاں سے۔ یہ لڑکیوں کا کمرہ ہے۔ یہاں مانجھے کی دلہن بیٹھی ہے۔‘‘

اس طرح ہنسی مذاق کے ساتھ شادیوں کی رسمیں چلتی رہیں۔ گانے وغیرہ ہوتے رہے۔ ساتھ میں خریداری بھی ہوتی رہی۔ صرف مزے ہی مزے تھے۔ دلہنوں کو رخصت ہو کر کہیں دور بھی نہیں جانا تھا۔ بس ایک حویلی سے رخصت ہو کر دوسری حویلی میں آ جانا تھا۔ اس لیے دلوں میں کوئی غم بھی نہیں تھا ایک اطمینان تھا۔ اس لیے مزہ بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ دور دور سے فنکار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے تھے۔ آتش بازی کا پروگرام تو ہفتوں چلتا رہا۔ خوبصورت کپڑوں اور زیوروں میں سجی شہزادیاں تو کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھیں اور شہزادی سنیحہ ان میں سب سے الگ تھی۔ اس کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ پھر ثوبیا رخصت ہو کر دوسری حویلی میں چلی گئی اور شانجہ رخصت ہو کر اس کی حویلی میں آ گئی۔ شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے مگر ان بھری پری حویلیوں میں لگتا تھا جیسے اب بھی شادی کا گھر ہو۔

ایک دن محلوں کے شہزادے کا پیغام سنیحہ کے لیے بھی آ گیا۔ اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چاند سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ نشاب خود چاند کی طرح خوبصورت تھے، مگر اس کے دل کا چاند تو کھو گیا تھا۔ ہر ایک ان کو چاند اور سورج کی جوڑی کہتا تھا مگر خود اس کو چاند اور چکور کی جوڑی پسند تھی۔ چکور اب نہ جانے کہاں تھا؟ پھر گھر والوں کے پیار کے سائے میں ان کے آنسوؤں کو دامن میں سمیٹے وہ ایک اجنبی کے ساتھ چلی گئی۔ ٹھیک کہا تھا راشف نے اِدھر بڑی ہوئیں اُدھر ایک اجنبی آ کر لے گیا۔ کیسا عشق اور کیسی محبت! اس کو چاند اور چاندنی راتوں سے نفرت ہو گئی۔ اس کے شوہر نشاب کو بھی چاند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دونوں چاندنی راتوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر رات کسی وقت چاند ان کے کمرے میں گھسنے کی کوشش کرتا تو دونوں میں سے کوئی ایک

جلدی سے پردہ گرا دیتا تھا۔ دونوں کو اندھیری راتیں پسند تھیں جب چاند پتا نہیں کہاں ہوتا تھا؟

نشاب ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ ''آپ محلوں میں پیدا ہوئی اور محلوں میں آ گئیں۔ مگر ہمارا یہ دل بیچارا بہت غریب ہے۔''

وہ جواب دیتی۔ ''آپ کے ساتھ میری شادی ہونا تو اوپر والے نے لکھ دیا تھا۔ اگر آپ غریب گھر کے ہوتے تو میں بھی اس غریب گھر میں آ جاتی۔''

وہ ہنس کر کہتا۔ ''اگر آپ خود شہزادی نہ ہوتی اور اگر کسی چھوٹے گھر کی معمولی لڑکی ہوتیں تو اپنی خوبصورتی کے باوجود ہماری حویلی میں نہیں آ سکتی تھیں۔ ہماری حویلیوں کا قاعدہ ہے اس میں چھوٹے گھر نہیں سما سکتے ہیں۔ صرف شاہی خاندان، حویلی اور محل ہی اس میں ضم ہو سکتے ہیں۔''

وہ سوچ میں پڑ جاتی، ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ کاش وہ واقعی میں چھوٹے گھر کی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ شہزادہ، یہ محل، یہ حویلی اس کی دنیا سے دور ہوتے۔ وہ معمولی گھر اس کا ہوتا۔ چودھویں کا چمکتا ہوا چاند اس کا ہوتا۔ چاند بیچارے کو کیا معلوم محل اور جھونپڑوں میں بہت فریق ہوتا ہے۔ وہ دونوں جگہ ایک ہی طرح سے چمکتا ہے۔ سب کو خوشی دیتا ہے۔ سب کو پیار دیتا ہے اپنے نور میں ڈوبا ہوا پیار بانٹتا ہے اور کسی کسی کے لیے پیار کا نشان بن جاتا ہے۔

نشاب کتنے ہینڈسم تھے جو بھی لڑکی پاتی فخر کر سکتی تھی۔ سنیحہ خود دو خاندانوں کا فخر تھی۔ میکے اور سسرال دونوں ہی کو وہ عزیز تھی۔ نشاب بھی اس کو بہت چاہتے تھے۔ وہ بھی نشاب کو اپنا سب کچھ سمجھتی تھی مگر وہ کنفیوزڈ تھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ نشاب اس کا پیار بھی تھے یا نہیں۔ کبھی کبھی ان کی باتیں کتنی عجیب ہوتی تھیں جب وہ کہتے تھے۔ ''اگر آپ چھوٹے گھر کی ہوتیں تو ہمارا عشق صرف عشق ہی رہتا ہمارا نصیب نہیں بن پاتا۔ میں بغاوت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں بہت بزدل ہوں۔ پھر بغاوت اپنے گھروں میں، میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ اس لیے آپ کو میں نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ ہمارے بڑے جو کہتے ہیں ہم وہی کرتے ہیں۔''

وہ بھی تو یہی سوچا کرتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ خود چھوٹے گھر کے ہوتے تو کیا آپ محلوں کی شہزادی کو حاصل کر لیتے۔''

''پتا نہیں۔'' نشاب جواب دیتا۔ ''یہ تو شہزادی پر منحصر ہوتا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی چھوٹے گھر میں آنے کی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ چھوٹے گھروں میں تو ایسے رواج نہیں ہوتے کہ

شہزادیاں نہ سما سکیں۔مگر نازک بدن، نازک مزاج شہزادیاں چھوٹے گھروں میں مرجھا جاتیں۔کیا شہزادی صاحبہ آپ میں ہمت ہوتی اُس چھوٹے گھر کو اپنانے کی۔''

سنیجہ نے جواب دیا۔''میں تو اپنے پورے خاندان کا اعتماد ہوں میں کیسے اتنے دلوں کو توڑ کر ایک غریب دل جوڑ سکتی تھی۔لڑکے ہو کر آپ محلوں سے بغاوت نہیں کر سکتے تھے تو بھلا میں لڑکی ہو کر کیسے اتنا بڑا اقدم اٹھا سکتی تھی۔ویسے بھی ہم لوگوں کو معلوم ہے کہ شہزادیاں اتنی سنبھال کر رکھی جاتی ہیں کہ ان پر کسی غریب کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا۔''

وہ ہنس دیتا۔ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے بھٹکتے تو صرف شہزادے ہیں۔شہزادیاں نہیں۔ وہ تو حوروں کی طرح ہیں جس کے نصیب کی ہوئیں اس کو مل گئیں۔مگر سنیجہ ڈر جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں نشاب اکثر ایسی باتیں کرتا رہتا تھا۔وہ سوچتی کہ کہیں وہ اس کا راز تو نہیں پا گیا۔ ہمیشہ اس کو چھوٹے گھر بھیجتا تھا مگر خود کبھی بھی نہیں جاتا تھا۔خود شہزادہ ہی بنا رہنا چاہتا تھا۔شادی سے پہلے سنیجہ کا شغل بن گیا تھا سوکھے ہوئے پھولوں کو جمع کرنا۔اس کے پاس ان کا بہت بڑا کلیکشن ہو گیا تھا۔اس کو وہ اپنے ساتھ سسرال بھی لے آئی تھی۔ان کے ساتھ اس نے کچھ یادیں جوڑ دی تھیں۔ وہ ان کو اکثر دیکھا کرتی تھی۔اس دن بھی وہ ان کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی وہ دن جب وہ کتنی دیوانی ہو گئی تھی اس اَن دیکھے انجانے انسان کی محبت میں۔ ہر وقت اس کے تصور میں ڈوبی رہتی تھی اس کو کھونے کے غم میں چور تھی۔

پھول اس کی کمزوری تھے۔ وہ جب بھی اپنے محل کے پھولوں سے بھرے خوبصورت لان میں ٹہلتی تو بس یہی سوچا کرتی کہ کاش اس کی زندگی میں بھی کبھی ایسا لمحہ آتا جب وہ چٹھیاں لکھنے والے ہاتھ اس کو پھول پیش کرتے، اس کے بالوں میں سجاتے، اس کے پیش کیے ہوئے پھول اس کے گلدانوں کی زینت بنتے۔مگر یہ ارمان ارمان ہی رہا کبھی پورا نہیں ہوا۔ وہ ایک خوبصورت پھول کو برابر دیکھے جا رہی تھی اور سوچے جا رہی تھی۔اچانک وہ پھول خود بخود اس کی گود میں آ گرا۔ وہ ہنس دی۔ جیسے اس کے انجانے محبوب کے اَن دیکھے ہاتھوں نے وہ مراد پوری کر دی۔اس نے پھول کو اٹھا کر اپنے بالوں میں سجا لیا۔پھر بہت احتیاط کے ساتھ کتاب میں رکھ دیا۔ اس طرح وہ پھول ہمیشہ کے لیے اس کا ہو گیا۔پھر تو یہ اس کا شغل ہو گیا جب وہ لان میں ٹہلتی جو بھی پھول اپنے آپ شاخ سے جدا ہو کر اس کے سامنے گرتا وہ اس کو اٹھا لیتی اس طرح بہت سے رنگ

برنگے سوکھے پھول اس کے پاس جمع ہو گئے تھے ایک انمول خزانہ بن کر۔ اچانک نشاب کی آواز سُن کر وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے واپس آ گئی۔ نشاب ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔ ''آپ کو پھولوں کا اتنا شوق ہے ان سوکھے پھولوں کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہر روز ایک تازہ پھول پیش کر دیا کروں گا۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں۔ کیا اب میں اتنا گیا گزرا تھا کہ آپ کی یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مگر پھول پیش کرنا میں تو سمجھتا ہوں معمولی لوگوں کا شغل ہے ہم شہزادوں کا نہیں۔''

وہ بولی۔ ''یہ صرف معمولی لوگوں کا شغل نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو دل سے ہے۔ آپ ٹھہرے شہزادے ہیرے جواہرات، سونے چاندی کا تحفہ آپ دے سکتے ہیں مگر پھول کا نہیں۔ اگر آپ پھول کا تحفہ بھی دیں تو وہ آپ کی ادا کہلائے گی۔ مگر میرے لیے تو یہ دل کا تحفہ ہوگا، پیار کا تحفہ ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں بھی آپ کو ہر روز دو چار پھول پیش کر دیا کروں گا۔''

سنیحہ نے کہا۔ ''دو چار پھولوں سے تو غرور کی بو آتی ہے خلوص کی نہیں۔ غرور ہمیں پسند نہیں ہے۔ ہم تو خلوص کے دیوانے ہیں۔ ایک ہی پھول خلوص و پیار کا اشارہ بن سکتا ہے اگر وہ دل سے دیا جائے۔''

نشاب نے ہنس کر کہا۔ ''پھول تو میں پیش کر سکتا ہوں مگر یہ اندازہ کیسے ہوگا کہ اس میں میرا خلوص ہے کہ نہیں۔''

وہ بولی۔ ''عام سی بات ہے کہ پھول کی جستجو دینے والا خود کرتا ہے۔ خود تلاش کرتا ہے، خود ہی اپنے ہاتھوں سے توڑتا ہے یا گزرتے ہوئے بازاروں سے اچانک اس کی نظر کوئی پھول پانے کی کوشش کرتی ہے۔ نظروں کا انتخاب ہی دل کا انتخاب ہوتا ہے۔ وہی پھول دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہوتا ہے۔ نظروں سے انتخاب کیا ہوا پھول پانے والے کو بھی احساس دلا دیتا ہے کہ وہ کتنا قیمتی ہے، کتنا خوبصورت ہے وہ تلاش کیا گیا ہے کسی اپنے کے لیے اچانک ہاتھوں میں کسی دوسرے کی پسند بن کر نہیں آ گیا کسی دوسرے کے ذریعے خریدوایا نہیں گیا۔ اس کا مقابلہ ہیرے جواہرات بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی قیمت تو کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا۔''

''واہ بھئی آپ تو الفت کا خزانہ اپنے اندر رکھتی ہیں اس کی تو ہم کو خبر ہی نہیں تھی۔''

''خبر تو جب ہوتی جب دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی۔ آپ ٹھہرے شہزادے، آپ کہاں ان معمولی معمولی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دیں گے۔ آپ کی دنیا میں کہاں ان

چیزوں کا گزر ہے۔ یہ چیزیں آپ کی نظروں میں معمولی ہیں۔ حقیر ہیں، چھوٹے لوگوں کا مشغلہ ہیں، آپ چھوٹے ہو نہیں سکتے کیونکہ چھوٹی چیزیں آپ کی دنیا میں نہیں سما سکتی ہیں۔ ہمارے محلوں میں تو صرف قیمتی انمول چیزیں ہی سما سکتی ہیں۔''

نشاب نے جواب دیا۔'' آپ ٹھیک کہتی ہیں اگر آپ اتنی قیمتی نہ ہوتیں تو ہماری دنیا میں نہیں آسکتی تھیں۔ آپ کا شہزادی ہونا ہی آپ کو ہمارے قریب ہماری دنیا میں لایا۔ آپ کے لیے کوئی معمولی چیز میں کیسے سوچ سکتا تھا کیسے لا سکتا تھا۔ میں آپ کی شہزادگی کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا تھا۔ آخر ہم بھی تو ٹھہرے شہزادے، بلکہ آنے والے وقت کے مہاراجا۔''

'' یہ بات آپ نے ٹھیک کہی۔ پھولوں کا تحفہ پیش کرنا آپ کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے پھولوں سے محبت ضروری ہے جس کو دیا جائے اس سے بھی محبت ضروری ہے۔ بغیر محبت کے پھول مردہ، خوشبوں سے خالی ہوتے ہیں۔ پھولوں کی وقعت پیار بڑھاتا ہے۔ دینے والے کا دل ان پھولوں میں دھڑکتا ہے اور دل کی یہ دھڑکن چاہنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ عام لوگ نہیں، عام چاہت نہیں۔''

نشاب نے اس کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔'' تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں ان سوکھے ہوئے پھولوں میں کس کے دل کی دھڑکن شامل ہے جو آپ نے بہت احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے۔''

وہ خود اعتمادی سے بولی۔'' جب پھول پیش کرنے والے ہاتھوں کی طرف سے ابتدا نہیں ہوئی تو پھول خود بخود میرے قدموں میں گرنے لگے۔ جس پھول کو میں نے پیار سے دیکھا وہ میری گود میں آگرا۔ میرے بالوں میں سج گیا، میرے قدموں میں گر گیا۔ میں اس کو اپنے انجانے محبوب کا تحفہ سمجھ کر اٹھاتی گئی۔ سجاتی گئی۔ جمع کرتی گئی۔ صرف یہ سوچ کر کہ زندگی میں کبھی تو ایسا دن آئے گا جب یہ کسی کے ہاتھوں سے ملا کریں گے۔ میرے بالوں میں سجیں گے۔ میرے گلدانوں کی زینت بنیں گے۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تو مجبوراً مجھے انہیں سوکھے پھولوں سے پیار جتانا پڑا۔''

'' واہ! ایک شہزادی کی کیا ادا ہے وہ پھولوں کے لیے ترس گئی۔ تازہ کھلے ہوئے پھولوں کے لیے۔ جب کہ میلوں تک پھیلا ہوا لان پھولوں سے بھرا ہے، دنیا کے خوبصورت ترین پھولوں سے۔ آپ نے کبھی فرق دیکھا ہے ایک شہزادی اور ایک معمولی عورت میں۔ اگر اس کو پھولوں کا تحفہ ملتا ہوگا تو وہ بیچاری سوچتی ہوگی کہ کاش اس کا غریب شوہر کبھی اس کو ہیرے جواہرات، سونے

چاندی کے تحفے بھی دے سکتا۔ کتنی حسرت کتنی مایوسی اس کی زندگی میں ہوتی ہوگی، اور آپ کو جب ہمیشہ یہ قیمتی تحفے ملتے رہے تو آپ کی یہ بدنصیب زندگی میں پھولوں کی کمی رہ گئی۔''

وہ پتا نہیں کس غریب اور بدنصیب عورت کا ماتم کر رہا تھا۔ سنیجہ سمجھ نہیں پائی۔ وہ صرف اس کی ذہنیت کے بارے میں سوچتی ہوئی بولی، ''ہوسکتا ہے کہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو ان دونوں چیزوں کو لے کر چلتے ہوں۔ اپنی شان، اپنی امیری دکھانے کے لیے ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے تحفے دیتے ہوں۔ اپنا پیار، اپنی چاہت کو دکھانے کے لیے پھولوں کے تحفے دیتے ہوں۔ اب یہ پانے والی نصیب اور یا بدنصیب عورت پر منحصر ہے کہ وہ کس کو دل سے لگاتی ہے اور کس کو اپنی خوبصورت تجوری میں بند کر دیتی ہے۔ مگر آپ جیسا کہ جانتے ہیں ہم شہزادیوں کے لیے ہیرے جواہرات، سونا چاندی، بچپن سے کھیلے گئے کھلونوں کی طرح ہیں ہم لوگ ان کے لیے ترستے نہیں ہیں۔ مگر پھول شوہر یا کوئی چاہنے والا ہی پیش کر سکتا ہے جس کا ہم انتظار کرتے رہے۔ ہمارے لیے پھول قیمتی ہو گئے کیونکہ میرے محبوب نے کبھی بھی ان کو دینے کی تکلیف نہیں کی۔ نہ کسی خاص موقعہ پر، نہ کسی خاص دن، نہ کسی خاص صبح، وہ پھول انتظار بن گئے اور انتظار ہی رہے ہمیشہ۔''

نشاب چپ ہو گیا۔ سنیجہ نے اس کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا جیسے وہ پھولوں کا تحفہ دینے کی سوچا کرتا تھا۔ ہمیشہ صرف کسی ایک کو دینے کا مگر جب اس کو نہیں دیا تو کسی کو نہیں دے سکا۔ پتا نہیں یہ سچ تھا یا سنیجہ کا وہم اس نے جیسے اس کا دماغ پڑھ لیا۔ نشاب بہت دیر خاموش رہنے کے بعد نہایت رُکھائی سے بولا۔ ''آپ نے تو ایک معمولی عورت کی طرح سوچنا شروع کر دیا۔ آپ شہزادی ہیں۔ شہزادیوں کی طرح سوچیے۔ شہزادیوں کی اڑان بہت اونچی ہوتی ہے۔ یہ ہی اونچی اڑان ان کی شہزادی ہونے کی پہچان ہے۔ پھولوں جیسی معمولی چیز کا ڈھیر لگانے کے لیے ہم نے مالی اور مالنوں کو رکھ چھوڑا ہے۔ کیوں ان غریبوں کی روزی ختم کرنے کی سوچ رہی ہیں۔ آج ہی میں اپنی اسٹیٹ کے سب ہی مالیوں اور مالنوں سے کہہ دوں گا کہ آپ کے قدموں میں ساری دنیا کے پھولوں کا انبار لگا دیں۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا مگر سنیجہ کا دل جلا گیا۔ کتنی صفائی سے اس نے خود پھول پیش کرنے والی بات کو ٹال دیا تھا یا ٹالنے کی کوشش کی تھی، مگر کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اپنے ہاتھوں سے دینے والے ایک پھول کو وہ کتنا قیمتی بنائے دے رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ لگتے ہی وہ

سونے میں بدل جائے گا۔ واقعی میں وہ اس شہزادے کی طرح تھا جو جس چیز کو ہاتھ لگاتا تھا وہ سونے کی بن جاتی تھی۔ بات ٹل ہی نہیں گئی تھی بلکہ ختم ہوگئی تھی۔ سنیجہ ان حالات میں پھر اپنے انجانے محبوب کو یاد کرنے لگی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی اگر وہ ان چٹھیوں کے ساتھ کبھی کبھی پھول بھی لپیٹ دیتا تو وہ پھول بھی اس کے دل سے لپٹ جاتے۔ تب ہی تو وہ پھول جمع کیا کرتی تھی اپنی اس ادھوری تمنا کی تشنگی دور کرنے کے لیے۔ وہ بیچارہ معمولی گھر کا آدمی تھا صرف پھول ہی تو دے سکتا تھا۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات اس کے بس کی بات نہیں تھے وہ صرف سوچ سکتا تھا اپنی محبوبہ کو دینے کے لیے۔ وہ تو خود دولت سے کھیلتی ہوئی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں کبھی بھی ہیرے جواہرات کی کمی نہیں تھی۔ کمی تھی تو کسی اپنے کے ہاتھوں کے دیے ہوئے پھولوں کی۔ اگر وہ اس کو پھول بھیجتا تو واقعی میں وہ ان کو دل سے لگا کر رکھتی۔ وہ پھول اس کے لیے کتنے قیمتی ہوتے وہ شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی دنیا ہوتے، اس کا خزانہ ہوتے۔ دوسری طرف اس کا شوہر نشاب تھا۔ پتا نہیں اس کی زندگی میں کیا ٹریجڈی تھی۔ وہ معمولی اور چھوٹی چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ایسی چیزیں دینا تو بہت دور کی بات تھی وہ ان کے لیے سوچنا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا۔

وہ سوچتی تھی کیا معمولی اور چھوٹی چیزوں سے اس کا کوئی گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ تعلق اب اس کی زندگی کی نفرت اور حقارت بن گیا۔ طنز میں بدل گیا، مگر اس کی زندگی میں کوئی معمولی اور حقیر چیز آ کیسے سکتی تھی۔ معمولی اور چھوٹی چیزیں شاید اس کی دنیا سے بہت دور تھیں تب ہی تو اس کے دل و دماغ میں اور زبان پر حقارت بن کر بیٹھی تھیں۔ اس نے کبھی چھوٹی اور معمولی چیزوں کی طرف دیکھا بھی نہیں ہوگا، اگر کوئی ہستی، کوئی چیز ہوگی تو بہت اعلیٰ اور برتر ہوگی، بہت اونچی۔ تب ہی تو وہ اعلیٰ اور اونچی باتیں کرتا تھا۔ اس نے سنیجہ کے خیالات پر بھی اپنی برتری کا پہرا بٹھا دیا کہ ہمیشہ اونچی ہی باتیں سوچے، اونچی باتیں کرے اور اونچے خیالات پیش کرے۔ مگر سنیجہ کی زندگی کا تعلق معمولی چیزوں سے بھی تو رہا ہے۔ اگرچہ وہ اس کے بابا کا ایڈونچر تھا، ایک شہزادے کی ادا تھی مگر ایک طرح سے اس کی پرورش تو معمولی طور سے ہوئی تھی۔ اس نے بھی تو اپنے بابا کے ساتھ اپنی زندگی کے کتنے سال گزارے تھے۔ ایک معمولی لڑکی بن کر۔

اب یہ معمولی پن اس کی زندگی میں اتنا رچ بس گیا تھا کہ وہ اپنے کو اونچا ماننے کو تیار

نہیں تھی۔ زندگی کی یہ انوکھی تبدیلی اس کو بھی بہت پسند تھی۔ اس کی زندگی جب معمولی طریقے سے شروع ہوئی تو ایک معمولی آدمی آناً فاناً اس کا بن گیا۔ وہ یہ بھول گئی کہ وہ شہزادی ہے۔ اس کا شہزادہ شوہر ہمیشہ اس پر شہزادگی لادنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہمیشہ اس کے معمولی خیالات، معمولی خواہشات سے پریشان ہو جاتا تھا۔ اپنی زندگی کا یہ پہلو وہ اس کو بتا نہیں سکتی تھی۔ گھر والوں نے منع کیا تھا۔ واقعی میں اس غرور بھرے آدمی کو بتا کر زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو جانا تھا۔ اس کے اوپر اپنی شان، اپنی امارت، اپنی بڑائی اور اپنا شہزادہ پن اتنا سوار تھا کہ وہ معمولی بات معمولی نہ رہ کر اہم بن سکتی تھی۔ بابا کا ایڈونچر ان کی ادا نہ رہ کر اس کی زندگی کی حقیقت بن سکتا تھا۔ وہ چڑھ سکتا تھا۔ طعنہ دے سکتا تھا۔ بغیر جانے ہوئے بھی وہ اکثر طعنہ دیا کرتا تھا۔ اس کے خیالات سے معمولی پن نکال لاتا تھا۔ اس کو شہزادیوں کے طور طریقے سکھاتا تھا جیسے واقعی میں وہ اس کو کسی معمولی گھر سے اٹھا کر لایا ہو۔

اس کو اب زندگی نشاب کے ساتھ کاٹنی تھی۔ اس کے خیالات میں جینا تھا۔ ایک شہزادی کی شان اور وقار لے کر۔ اپنی زندگی کو خوشگوار اور مثالی بنانے کے لیے سنیجہ نے پھر ان سوکھے ہوئے پھولوں کو نہیں دیکھا۔ نہ اپنے پاس رکھا۔ ان کو پھینک دیا، اپنے دل سے بھی پھینک دیا، پھولوں کی محبت بھی دل سے نکال دی۔ پھولوں کا کلیکشن اور پھولوں سے پیار نشاب کو پسند نہیں آیا تھا۔ اس کو ماضی کو بھلا دینا تھا۔ اس کو دفن کر دینا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس نے ایسا ہی کیا ویسے بھی وہ پھول نہ تو اس کا ماضی تھے اور نہ ہی کسی کی یاد۔ بس صرف ایک خیال تھا۔ خیالی محبوب کا پیش کیا ہوا خیالی تحفہ اس کی نوعمری کا تصور تھے۔

زندگی گزرتی رہی اور چالیس سال گزر گئے اس کی خوش و خرم زندگی کے۔ ان کی فیملی ایک مثالی فیملی تھی۔ زندگی میں نہ کبھی غم آئے اور نہ مایوسی۔ نہ اسٹریس نہ ڈپریشن۔ سات بہت ہونہار اچھی تربیت پائے ہوئے بچے۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔ سب فرمانبردار اپنے اپنے اعلیٰ مقام پر۔ ایسے خوش نصیب خاندان دنیا میں بہت کم ہوں گے۔ جوانی کی دیوانگی بھلا کر دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ ایک دوسرے کی دنیا بن گئے۔ ایک دوسرے میں مگن ہو گئے۔ اچانک نشاب بیمار پڑ گئے۔ دن بہ دن ان کی بیماری بڑھتی ہی گئی۔ ان کی آنکھوں میں حسرت تھی، ایک دکھ تھا جو سنیجہ کا دل چیر دیتا تھا۔ کیا دکھ تھا پتا نہیں چلتا تھا۔ کاش یہ اس کے بس میں ہوتا وہ معلوم کر سکتی اور اس کی وہ ادھوری خواہش پوری کر سکتی۔ وہ اکثر اس سے پوچھتی۔ ”آپ کو کیا غم ہے نشاب،

مجھے بتا دیجیے۔'' وہ صرف اتنا کہتا۔ ''غم، بس یہ ہے سنیحہ کہ آپ کو اکیلا چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ میں آپ کا ساتھ اور نہیں دے سکتا۔'' سنیحہ غم میں ڈوب جاتی اور کہتی۔ ''آپ نے مجھے کیا نہیں دیا۔ شہزادی سے رانی بنا دیا، اپنے گھر اپنی زندگی کی رانی۔ ہمارے پاس سات پیارے پیارے بچے ہیں۔ ان کو اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا دیا۔ یوں بھی وہ شہزادے شہزادیاں تھے وہی رہے۔ گو اب ہماری حکومت ہماری جاگیریں نہیں رہیں۔ مگر اپنے محل کے اب بھی ہم ہی حکمران ہیں۔ بچوں کے بچے بھی اب بڑے ہو گئے ہیں۔ شادی کے قابل ہو گئے ہیں۔ آپ اپنے ہاتھوں سے ان کی شادیاں بھی کر دیں۔ پھر ہم لوگوں کے پر لگ جائیں گے ہم دونوں ساتھ ساتھ پرواز کریں گے۔''

نشاب ہنس پڑتا اور کہتا۔ ''میں وعدہ نہیں کرتا سنیحہ کہ آپ کے ساتھ پرواز کروں گا، میں تو بغیر پروں کے ہی اُڑ جاؤں گا آپ اکیلے ہی اس منزل پر روانہ ہوں گی۔ اپنے کو کبھی بھی تنہا محسوس نہ کریے گا۔ یہ بھرا پرا محل آپ کے دم سے آباد رہے گا۔ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح آباد کر دیجیے گا۔ ان کی خوشیوں میں خوش رہیے گا۔ ان کی مسکانوں میں اپنی دنیا آباد کر لیجیے گا۔'' وہ اپنے آنسو چھپاتی۔ نشاب کے سامنے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اٹھ کر وہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کے بیٹے بیٹیاں اور ان کے بچے فرمانبردار ضرور تھے مگر ان کی اپنی زندگی تھی، ان کی اپنی دنیا تھی۔ سنیحہ کی دنیا تو نشاب سے آباد تھی اس کا سب کچھ وہی تو تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال تو کہہ لیتے تھے۔

لیکن اس آخری وقت میں پتا نہیں کیا بات تھی جو وہ چھپاتا تھا جو اس کی آنکھوں سے حسرت بن کر چھلکتی تھی۔ جو اس کو بے چین رکھتی تھی۔ کوئی تمنا یا خواہش تھی جو ادھوری رہ گئی تھی۔ جو پوری ہونے کے لیے بیتاب تھی، مگر پتا ہی نہیں چلتا تھا وہ کیا بات تھی؟ یہی چیز اس کو بھی بے چین رکھتی تھی۔ سنیحہ کی زندگی میں بھی تو گزرے وقت کا ایک خیال تھا جو اس کے دل کا درد تھا، جو اس کو بے چین رکھتا تھا، ایک چکور بن کر اس کا پیچھا کرتا تھا۔ پھر ایک دن نشاب اس کو بھرے پرے گھر کے حوالے کر کے اس دنیا سے چلا گیا۔ وہ خود اپنے بچوں اور ان کے بچوں میں گم ہو گئی۔ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بڑے ہو گئے آپس میں شادیاں بھی طے ہو گئیں۔ سوچتے سوچتے رات گزر گئی۔ صبح کا نور اس کو ماضی سے واپس لے آیا۔ وہ زندگی کا کتنا بڑا راستہ طے کر کے واپس آئی تھی، تھکی تھکی افسردہ افسردہ۔ اچانک ہال سے آتی ہوئی گانے کی خوبصورت آواز نے اس کو اپنی

طرف کھینچ لیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ہال کی طرف تیز تیز چل دی۔

یہ راشف کی آواز تھی وہ ٹی وی پر گا رہا تھا اپنی ہی غزل جو اس کی آواز کی طرح خوبصورت تھی۔ سب ہی لوگ ہال میں ٹی وی کے سامنے جمع تھے۔ سنیجہ جھوم جھوم اٹھی۔ جتنی خوبصورت آواز تھی اتنی ہی خوبصورت شاعری بھی تھی۔ دل میں اتر کر آنکھ سے آنسو بن کر بہنے والی۔ راشف اچانک ہی بہت بڑے شاعر، بہت بڑے سنگر بن گئے تھے۔ ان کے گیت، نظمیں اور غزلیں انہیں کی آواز میں ریڈیو اور ٹی وی پر سنائی دینے لگیں۔ وہ خوبصورت آواز کے مالک تو تھے ہی خوبصورت شاعری نے اور دھوم مچادی۔ سنیجہ جب سنتی بہت متاثر ہوتی۔ شاعری کا درد اس کو بے چین کر دیتا۔ اس کی سوگوار آواز سے اس کے آنسو نکل پڑتے۔ وہ سوچتی، کیا راشف کسی اور کو چاہتا ہے۔ کہیں اس کی زندگی بھی درد نہ بن جائے آہ و فغاں میں نہ ڈھل جائے۔ راشف کی شاعری سن کر اس کو وہ انجانی چٹھیاں یاد آ جاتی تھیں جیسے ان خطوں کی عبارت کو راشف نے شاعری میں بدل دیا ہو۔ مگر راشف ان کے دل، ان کی زندگی کے پوشیدہ راز کو کیا جانیں؟ وہی چاند کے حسن کا ذکر، چاند کو دیکھتے ہوئے، چاند سے چمکتے ہوئے چہرے والی دوشیزہ کا تذکرہ، چاندنی راتوں میں مہکتی رات کی رانی کا بیان۔ بدلی میں چھپے ہوئے چاند سے شکایت، نور کے جلووں میں لپٹے ہوئے ایک حسن مجسم کا قصّہ، وغیرہ وغیرہ۔

سنیجہ سوچتی، کون ہے وہ دوشیزہ جو راشف کی شاعری کی ہیروئن ہے، جو اس کی شہزادی ہے، جو ایک درد ہے، ایک گونج ہے، ایک فریاد ہے۔ یہ شاعری اس کی منگیتر سیمارا کے لیے نہیں ہو سکتی۔ سیمارا تو نظر کے سامنے ہے اس کی شاعری میں کسی چھپی ہوئی دوشیزہ کا ذکر ہے جو پردہ نشین ہے جس کو شاعر نے کبھی بھی ٹھیک سے دیکھا نہیں تھا۔ صرف پیار کیا تھا۔ وہ چمکتا ہوا خوبصورت چہرہ تھا جو صرف چاندنی راتوں میں اپنا جلوہ دکھاتا تھا۔ سیمارا تو خوشی خوشی اس کی شاعری کو سنتی تھی اور سر دھنتی تھی۔ ذرا بھی جلن نہیں محسوس کرتی تھی۔ وہ خوش تھی۔ اس کا محبوب، اس کا منگیتر، بہت بڑا شاعر، بہت بڑا اسنگر اور بہت بڑا فنکار تھا۔ اس کی شہرت آسمان کی رفعتوں کو چھو رہی تھی۔ وہ فخر محسوس کرتی تھی۔ راشف سنیجہ اور نشاب کے چہیتے بیٹے کا بیٹا تھا۔ ان کا چہیتا پوتا تھا۔ نشاب اب اس دنیا میں نہیں تھے مگر ان کے ہم شکل راشف کو سنیجہ بہت پیار کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کیا راشف بھی اپنی محبوبہ کو نہیں پا سکے گا۔ عمر بھر اسی کی یاد میں تڑپتا رہے گا درد بھرے نغمے گاتا رہے گا، لکھتا

رہے گا۔ان دونوں کے بیچ میں کیا محلوں کی دیوار کھڑی ہے؟ مگر اب تو وقت گزر گیا۔اب تو وہ صرف نام کا شہزادہ ہے۔اب سنیحہ کا زمانہ ہے۔اب معمولی گھروں اور محلوں میں اتنے فاصلے نہیں تھے۔اب ان میں معمولی گھر بھی ضم ہو سکتے تھے۔اب سنیحہ میں ہمت تھی کہ وہ معمولی گھروں سے دل کی مرادیں اٹھا لے۔محبوب اور محبوبہ کے فراق کو ہمیشہ کے لیے وصال میں بدل دے۔اب اس کے دادا نانا جیسے کٹر راجا نواب نہیں تھے جو معمولی گھروں اور محلوں کے ملن میں دیوار بن جائیں۔ ایک آہنی دیوار۔اب یہ دیوار بہت کچی اور بوسیدہ تھی۔اب سنیحہ کے مضبوط ارادے اس کو توڑ سکتے تھے۔ پہلے دل ٹوٹتے تھے ان کی آواز بھی گھٹ جاتی تھی۔باہر نہیں آتی تھی۔اب گھٹن کے پاس طاقت تھی۔وہ طاقت راشف کو نامراد نہیں رہنے دے گی اس کی زندگی کو اس کے پیار سے سجا دے گی۔اس کے درد، اس کے آنسوؤں کو اپنے ارادے کے مضبوط آنچل میں بٹور لے گی۔پھر ایک دن اس نے راشف سے پوچھ لیا۔''راشف تمہاری شاعری میں اتنا درد کیوں ہے؟ وہ کون ہے جس کے لیے تم اتنی خوبصورت درد سے بھری شاعری کرتے ہو؟''

راشف ہنس کر بولا۔''دادی جان! یہ میری شاعری کب ہے؟ یہ دادا جان کی شاعری ہے جو اچانک میرے ہاتھ لگ گئی اور میری آواز کی جان بن گئی۔''

اس نے حیرت سے پوچھا۔''دادا جان کی شاعری؟ کیا تمہارے دادا جان شاعر تھے؟''

وہ بھی حیرت سے بولا۔''یہ بات آپ کو بھی نہیں معلوم۔تعجب ہے۔یہ بات کوئی نہیں جانتا ہے، انہوں نے یہ بات سب سے پوشیدہ رکھی۔ان کے انتقال کے بعد ان کی شاعری اور ڈائری دونوں میرے ہاتھ لگ گئیں۔شادی سے پہلے وہ شاعری کیا کرتے تھے۔اچانک انہوں نے اپنی شاعری بند کر دی۔وہ کسی لڑکی کو بہت پیار کرتے تھے۔شاید وہ بہت غریب اور معمولی گھر کی تھی ان کو نہیں مل سکتی تھی۔دونوں چاند کے عاشق تھے۔وہ جب چاندنی راتوں میں اس کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھتے تھے تو چاند کے حسن کو بھول جاتے تھے۔دادا جان اس دنیا سے چلے گئے مگر اتنی خوبصورت شاعری کی موت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔میری آواز کو اس کی ضرورت تھی میں چاہتا تھا پوری دنیا اس کو سنے اور سر دھنے۔یہ شاعری میری آواز، میرے کیسٹ میرے سی ڈی اور میرے ریکارڈ کی جان بن گئی۔کاش مجھے یہ دادا جان کی زندگی میں مل جاتی تو وہ اپنی شہرت کو دیکھتے۔وہ انجان لڑکی اگر زندہ ہو گی تو اپنے آپ کو ضرور پہچان لے گی۔ان دونوں کے بیچ وہ

معمولی مکان آ گیا جس میں دادا جان اپنے ایڈونچر کی وجہ سے رہتے تھے۔ وہ زندگی میں تبدیلی پسند کرتے تھے۔ ایک جیسی زندگی سے اکتا جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ محل اور اس کے سخت قاعدے قانون سے گھبرا جاتے تھے۔ فرار چاہتے تھے انہوں نے محلوں کو ٹھکرایا تو نہیں مگر ہمیشہ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دیکھے اور اسی ایڈونچر پسندی میں عشق سے ٹکرا گئے۔ محبوب کی دنیا میں پہونچ گئے۔ کچھ پانے کی امید نہ ہوتے ہوئے اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے۔ اپنی زندگی کا قرار کھو بیٹھے۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی جس کو وہ بھول نہیں سکے۔ اس کو ایک بار دیکھنے کی حسرت میں عمر بھر تڑپتے رہے مگر میں سوچتا ہوں دادی جان آپ سے خوبصورت وہ لڑکی نہیں ہوسکتی تھی۔ اپنی خوبصورتی کا جواب آپ خود ہیں کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ہے۔ آج بھی آپ کی خوبصورتی لاجواب ہے جو ہم میں سے کسی کو نہیں مل سکی۔ مجھے تو یہ شاعری آپ پر کہی ہوئی لگتی ہے۔ کاش میرا خیال صحیح ہوتا۔‘‘

راشف بولے جا رہا تھا اور وہ دور بہت دور چلی جا رہی تھی۔ یہی سب کچھ تو اس کے ساتھ بھی گزرا تھا۔ تو کیا وہ آدمی نشاب تھا؟ راشف ٹھیک کہہ رہا تھا، سنیحہ کا ثانی خود سنیحہ ہوسکتی تھی کوئی اور نہیں۔ واقعی میں وہ معمولی مکان ان کے درمیان آ گیا تھا اور محلوں نے ان کو ملا دیا تھا۔ مگر یہ بات وہ دونوں نہیں سمجھ سکے کہ معمولی مکان والے محل اور حویلیاں بھی رکھ سکتے ہیں۔ دونوں میں کوئی بات کامن بھی ہوسکتی ہے۔ زندگی میں نئی نئی تبدیلیاں نشاب کی طرح اس کے بابا اور سنیحہ کو بھی پسند تھیں۔ دونوں نے پوری عمر ایک ساتھ گزار دی مگر ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکے، پہچانتے بھی کیسے انہوں نے چاند کو سزا جو دے دی تھی۔ اس کو نہ دیکھنے کی قسم جو کھا بیٹھے تھے۔ دونوں کو چاند سے نفرت جو ہوگئی تھی۔ حالانکہ دونوں نے اپنے پیار کا آغاز چاند کی محبت اور چاند کی چاہت سے کیا تھا مگر اپنی زندگی کی شروعات چاند سے نفرت سے کی تھی۔ اگر ایک بار بھی وہ لوگ ایک ساتھ چاندنی میں بیٹھتے اور چاند کو دیکھتے تو ہوسکتا ہے کہ دونوں کے چہرے کی چمک ایک دوسرے کو بتا دیتی۔ ایک دوسرے کا راز کھول دیتی مگر دونوں نے اپنے دل کا راز پوشیدہ رکھتے ہوئے زندگی کاٹ دی۔ چاند پہلے کی طرح ایک بار پھر ان کے دل ملانے کی کوشش ضرور کرتا کچھ کھونے کی کسک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ انہوں نے کچھ کھویا ہی کب تھا جس کا سوگ وہ عمر بھر مناتے رہے اپنے پہلے پیار کو کھونے کے غم میں ڈوبے رہے۔ انہوں نے اپنے آپ پر برتری اتنی سوار کر لی تھی کہ اپنی

زندگی کا ایڈونچر ایک دوسرے کو بتا نہیں سکے۔ یہ کامن چیز ہی ان کی اپنی پہچان بن کر سامنے آتی۔ اس تبدیلی یا ایڈونچر کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کا پیار پایا تھا۔ شاعر اور اس کی شاعری سنیحہ کی تھی جو شاعر کے ہاتھوں نصیب نہیں ہو سکی۔ نشاب نے اپنا شاعر ہونا نہ صرف اس سے پوشیدہ رکھا بلکہ سب سے پوشیدہ رکھا۔ وہ شاعر تھے، ایک انجانے اور ان دیکھے محبوب کے عاشق تھے۔ وہ ہمیشہ چھوٹی اور معمولی چیزوں سے نفرت ظاہر کرتے جو دراصل ان کی چھپی ہوئی محبت تھی۔ وہ اپنے سے انتقام لے رہے تھے، یہی ان کی زندگی کی ٹریجڈی تھی، یہی دکھ تھا۔ معمولی اور چھوٹے گھروں نے ان کا محبوب چھین لیا تھا حالانکہ نفرت ان کو محلوں سے ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ محبوب تو محلوں کا راجا ہونے کی وجہ سے چھوٹا تھا۔ لیکن وہ محلوں سے نفرت نہیں ظاہر کر سکے، وہ محلوں کا ہونے پر فخر کرتے رہے اور محلوں کی شان میں قصیدے پڑھتے رہے۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی کے وفادار تھے ان کی ناکامی میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ اپنی نوجوانی اور نوعمری کی دردناک داستان سے اس کو بدظن نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اپنی گھریلو زندگی کو خوشگوار اور مثالی بنانے کے لیے انہوں نے شاعری ترک کر دی اور اپنی شاعری کو پوشیدہ رکھا کہ کہیں کوئی ان کے عشق کی داستان سے واقف نہ ہو جائے۔ مگر ان کو کیا معلوم تھا کہ یہی انکشاف اس کے کھوئے ہوئے محبوب سے ملا سکتا تھا۔ سنیحہ ان چٹھیوں کے ایک ایک لفظ کو سنبھال کر اپنے دل میں رکھے ہوئے تھی۔ ایک ایک لفظ اپنے دل میں پیوست کیے ہوئے تھی اور دہراتی رہتی تھی۔ وہ سب خط تو بہت دور چلے گئے تھے مگر ان کے الفاظ آج بھی اس کے دل و دماغ میں زندہ تھے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ تب ہی تو راشف کی شاعری اس کو چونکا گئی اس کو رُلا گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی بن کر ایک دوسرے کو چاہتے رہے اور اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش رہے۔ ایک مثالی زندگی گزار دی اور دوسروں کے لیے مثال بن گئے۔ وہ ایک دوسرے کو پا چکے تھے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے مگر قسمت کا مذاق تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکے اور دل میں کھوئے ہوئے محبوب کا درد اور کسک لے کر زندگی کاٹ دی۔ ان کا عشق شاید اتنی بلندی پر پہونچ چکا تھا کہ محبوب ملا بھی تو انجانا رہا۔ اگر وہ ایک دوسرے کو عاشق اور معشوق کی طرح پہچان جاتے تو چاندنی راتوں کا درد، درد نہیں رہتا ایک خوشی ہوتا۔ دونوں مل کر چاند کو دیکھا کرتے اس کو واقعی چاند والا دولہا مل گیا تھا۔ سب کے مذاق نے حقیقت کا روپ لے لیا تھا۔ مگر یہ ان دونوں کی بدنصیبی تھی کہ چالیس سال ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے شریکِ حیات رہے، عاشق معشوق نہ بن سکے۔ ورنہ دونوں کی زندگی میں چودھویں کا چاند چمکتا رہتا۔ رات کی رانی کی

خوشبو ان کی زندگی سے جدا نہیں ہوتی، سدا مہکتی رہتی، چاندنی راتیں سسکتی نہ رہتیں۔ وہ زندگی بھر سوگواری کا لبادہ لپیٹے رہے اور اپنے محبوب کی جدائی کا درد لیے رہے۔

سنیجہ غم میں ڈوب گئی۔ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ روٹھی ہوئی بہاریں روٹھی ہی رہتی ہیں۔ کاش وہ راشف کو بتا سکتی کہ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ خود نشاب کی زندگی کی ہی نہیں اس کی شاعری کی بھی ہیروئن ہے، وہی اس کی محبوبہ تھی۔ مگر اب کسی کو بتانے سے کیا فائدہ؟ جب اس کا محبوب، اس کا ہیرو ایک لمبی عمر اس کے ساتھ گزار کر چلا گیا اور اس کو پتا نہیں چلا تو اب دوسرے کیوں جانیں؟ وہ جان کر کریں گے بھی کیا۔ افسوس بھی تو نہیں کر سکیں گے۔ اس کے آنسوؤں میں ساتھ بھی تو نہیں دے سکیں گے، نہ ہی اس کا غم بانٹ سکیں گے۔ اس کی سسکی کسی کے بھی آنکھ کا آنسو نہیں بن سکے گی۔ وہ شاعری راشف کی ہے اور راشف کی ہی رہے گی اور ساری دنیا اس کی خوبصورت آواز میں سن کر سر دھنتی رہے گی۔

آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ اچانک سنیجہ نے نشاب کی قبر پر جانے کا اعلان کر دیا۔ سب ہی گھبرا گئے۔ رات کے وقت قبرستان جانے کے نام سے سب ہی خوف زدہ تھے۔ مُردوں سے زیادہ زندہ انسانوں کا ڈر تھا۔ راشف راضی ہو گیا۔ اس سے سنیجہ کی بے چینی اور بے قراری نہیں دیکھی گئی۔ وہ اس کو اسی وقت قبرستان لے گیا۔ وہ قبر کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ چاند بھی محو حیرت تھا کہ اتنے برسوں بعد وہ کیسی انوکھی بات دیکھ رہا تھا اور وہ نشاب سے دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ''کاش آپ نے اپنی شاعری مجھ سے نہ چھپائی ہوتی تو ہماری دنیا کچھ اور ہوتی۔ آج بہت دن بعد یہ چودھویں کا چاند ہمارے درمیان چمکا ہے۔ آپ اور ہم ساتھ ہوتے ہوئے بھی پہلے سے بھی دردناک فاصلے رکھتے ہیں۔ آپ زمین کے اندر ہیں مگر آپ کی روح ضرور میرے چہرے کو دیکھ رہی ہوگی اور چاندنی میں پہچان رہی ہوگی۔ وہ انکشاف جو آپ کی زندگی میں نہیں ہو سکا۔ آپ عمر بھر افسردہ رہے کسی انجانے محبوب کے لیے اور اس کو پا کر بھی نہ پہچان سکے۔ اگر ہمیں ایک بار بھی چاند اور چاندنی نصیب ہو جاتی تو ہم ضرور ایک دوسرے کو پہچان جاتے۔ عمر بھر ایک دوسرے کو کھونے کے غم کے احساس سے تڑپتے تو نہ رہتے۔ یہ کیسی محبت تھی نشاب جو پا کر بھی تڑپتی رہی، کچھ بھی نہ کھو کر افسردہ رہی، یہ کیسی سزا ہم لوگوں نے کاٹی جو سزا نہیں ہماری محبت، ہماری چاہت، ہماری فتح کا انعام تھی۔ مرتے وقت آپ کی آنکھوں میں کیسی حسرت تھی جو صرف مجھے دکھائی دیتی تھی جو صرف میرے لیے تھی اس لیے

میرے دل کی آنکھیں دیکھتی تھیں۔ کسی کھوئی ہوئی شئے کی جستجو نظر آتی تھی۔ وہ شئے میرے بھیس میں نظر کے سامنے تھی صرف عقل پر پردہ پڑا تھا۔ ہمارے بیچ میں وہ معمولی مکان آ گئے تھے جو آپ دو شہزادوں کا ایڈونچر تھے۔ ضرورت نہیں۔

کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی آپ ہی کی طرح محلوں سے اکتاہٹ ہوتی تھی اور عام لوگوں کی زندگی میں سکون ملتا تھا۔ اپنی یہ کامن چیز ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے چھپائی۔ ہمارے محل اور حویلیاں معمولی مکانوں کا پیوند نہیں لگا سکتی تھیں۔ ان کو اپنے میں نہیں شامل کر سکتی تھیں۔ ویسے بھی ہم لوگوں نے کہا ہی کس سے تھا اور کسی سے ایک دوسرے کو مانگا ہی کب تھا۔ ہم کو اپنی ناکامی کا خوف تھا۔ مگر اتفاق تھا کہ ہم لوگ سچ مچ کے شہزادے اور شہزادی تھے تب ہی تو ایک دوسرے کو پا گئے مگر ہماری شہزادگی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکی۔ ہم دونوں نے شہزادگی اور اس کے سخت قانون کو اپنا لیا۔ معمولی پن کی دلچسپی کو حقارت میں چھپا لیا۔

کاش آپ نے اپنی شاعری مجھ سے پوشیدہ نہ رکھی ہوتی تو ہم لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے جیسے اب پہچان گئے ہیں۔ آج ایک زمانے کے بعد چودھویں کا چاند ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ پھر ہمارے قریب آ گیا ہے۔ وہ پھر اپنا بن گیا مگر آپ ہم سے جدا ہیں۔ اب آپ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ اب تو میں صرف اپنے مرنے کی دعا مانگ سکتی ہوں۔ مرنے کے بعد ہمارا ملاپ ہوگا۔ آپ کے پہلو میں جگہ ملے گی۔ دو قبریں ایک دوسرے کے قریب چاندنی رات میں چمکا کریں گی۔ اور پہلے کی طرح چاند کا نور اپنے اندر سمیٹ لیں گی۔''

سنیحہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک اس کے منہ سے سسکی کی آواز نکل گئی۔ ایک دردناک سسکی۔

یہ سسکی راشف کو چونکا گئی۔ وہ خاموش فریاد، آنسوؤں کے درد کی آواز اس کے کانوں تک پہونچ رہی تھیں۔ اس نے اچانک سوچا، کیا دادا جان کی شاعری کی ہیروئن دادی جان تھیں؟ واقعی میں صرف وہ ہی ہو سکتی تھی کوئی اور نہیں۔ مگر یہ انکشاف کتنی دیر کے بعد ہوا، کتنا لیٹ تھا اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی پُرنم آنکھوں سے چاند کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا ہمیشہ کی طرح اور جیسے اس کے خیال کی تصدیق بھی کر رہا ہو۔

◆ ÷ ◆

خوبصورت وادی پھولوں کی وادی

اس کا تعلق ایک بہت خوبصوت جزیرے سے رہا ہے۔اس جزیرے کے نام کے معنی خوبصورت وادی ہے۔اس کی اس خوبصورت وادی کے حسن کو سجانے والے دنیا کے حسین ترین پھول بھی ہیں۔ایسے پھول اوران کا اتنا زیادہ استعمال اس نے اور کہیں نہیں دیکھا۔اپنے ملکوں کے صوبوں اورشہروں میں ہر جگہ پھولوں کا حسن بکھرا ہے۔ ہر جگہ خواتین کا حسن ہی پھول ہیں۔ لیکن اس جزیرے میں پھول اپنے ملکوں سے بھی زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔سڑکوں پرراہوں میں پھول بچھے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے درخت پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کبھی خزاں نہیں آتی ہے۔ ہر موقعہ پر ہار پھول پہنائے جاتے ہیں۔ بیلے کا ہار جو پیکا کے کہلاتا ہے سب کا پسندیدہ ہے اوراس کا ہار سب سے مہنگا ہوتا ہے۔خواتین ہر وقت بالوں میں پھول لگائے ہوئے ملیں گی۔ وہ یونیورسٹی جاتی تھی۔ایک بار اپنی دو دوستوں کے ساتھ باہر نکلی تو وہ دونوں بالوں میں ایک ایک پھول لگائے ہوئے تھیں۔اس نے تعریف کردی اور کہا کہ اسے بھی پھول بہت پسند ہیں۔اس کی دوستوں نے فوراً ایک پھول اس کے بالوں میں بھی لگا دیا۔وہ تینوں مال گھومنے نکل گئیں۔ مال میں اور راستے بھراتنے اجنبی لوگوں نے اسے ہائے ہیلو کہا کہ وہ حیران رہ گئی۔کافی دنوں سے وہ اس جزیرے میں تھی کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔حیرت تو جب ہوئی کہ ایک آدمی نے پوچھا۔’’کیا تم اٹیلین ہو؟‘‘

اس نے کہا۔’’نہیں۔‘‘

اس آدمی نے بہت فخر سے کہا۔’’میں اٹیلین ہوں۔‘‘

اس نے سوچا کہ اگر وہ اٹیلین ہے تو وہ کیا کرے۔ پھر تو سلسلہ جاری رہا۔کوئی اسپینش، کوئی میکسکن،کوئی ایرانی،کوئی مڈل ایسٹ،کا بنائے دے رہا تھا۔زیادہ تر مقامی ہی سمجھ رہے تھے۔ جو مقامی عورتیں اس کی دوستیں اس کے ساتھ چل رہی تھیں ان سے کوئی بھی مخاطب نہیں تھا۔اسے

بہت غصّہ آ رہا تھا کہ لوگ کیوں اس سے اتنی زیادہ بات کر رہے ہیں اور بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کو گلوب سمجھ کر پوری دنیا کا نقشہ اس کے ناک نقشے میں کیوں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو مقامی کیوں سمجھ رہے ہیں۔ اس کو یاد آیا کہ جب وہ مقامی لائبریری میں لائبریرین کا کام کر رہی تھی اس کی ایک پیٹرن نیویارک کی تھی۔ ایک دن اس نے کہا۔ ''میں نیویارک بہت مس کر رہی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''ہاں نیویارک یہاں سے بہت دور ہے۔''

اس لیڈی نے کہا۔ ''تم لکی ہو کہ اپنے نیٹو لینڈ میں ہو۔''

نیٹو لینڈ پر وہ ہنس پڑی تھی۔ اس کی اسسٹنٹ بھی وہاں پر موجود تھی جو اسی کی ہم عمر تھی۔ اس نے کہا۔ ''انڈین کو لوگ مقامی سمجھتے ہیں اور ہم مقامی لوگوں کو انڈین۔'' اس نے بتایا کہ ایک بار وہ نیویارک میں سڑک کراس کر رہی تھی۔ ایک انڈین ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور ہندی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے اس سے کہا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمھاری زبان نہیں سمجھتی ہوں۔''

وہ حیرت سے بولا۔ ''تم انڈین لگتی ہو مگر انڈین نہیں ہو پھر کہاں کی رہنے والی ہو؟''

اس نے اپنی اسٹیٹ کا نام بتایا تو اس کو بہت حیرت ہوئی۔ اسے ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک بار وہ کسی کانفرنس میں گئی تھی۔ اسپیکر ایک مقامی عورت تھی۔ خوبصورت نہیں تھی، سانولی موٹی بھدی تھی۔ وہ آگے بیٹھی تھی۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور پوچھا۔ ''تم انڈین ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں۔''

اس کے بعد اس نے اپنی تقریر میں ایک واقعہ سنایا کہ اس نے ایک ہندوستانی سے شادی کی ہے اور اس کو ہندی سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اس نے ہندی سیکھی اور مزید سیکھنے کے لیے ممبئی گئی۔ ایک دن وہ بس میں تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ بس میں اس کو ہندی بولنے کا زیادہ موقع ملے گا۔ اس نے بس ڈرائیور سے ہندی میں بتایا کہ اس کو کس جگہ اترنا ہے۔ وہ موٹی بھدی کالی تھی اور شلوار سوٹ میں تھی۔ اس کو بس ڈرائیور انڈین لور کلاس کی آیا یا نوکرانی سمجھا اور بولا۔ ''اے عورت اتر تیری جگہ آ گئی۔''

اس نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں پوچھا۔ ''کیا یہاں اترنا ہے؟''

وہ مذاق اڑاتا ہوا بولا۔ ''کیسی ہندی بول رہی ہے۔ کس صوبے کی رہنے والی ہے؟''

اس نے کہا۔''امریکا کی۔''

پوری بس اور ڈرائیور کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ وہ لوگ سمجھے کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ ان کے نزدیک امریکن صرف گورے ہی ہو سکتے تھے اس جیسے سانولے نہیں۔ جب وہ بس سے اتر کر ڈرائیور سے امریکن انگلش میں بات کرنے لگی تو قابلیت دکھاتا ڈرائیور اس کا منہ تاک رہا تھا اور اس کو یقین تھا کہ دوسرے ہنسنے والے لوگ بھی اس کی بات نہیں سمجھ پائے ہوں گے۔

اسے ایک اور لیڈی یاد آئی جو روس سے ہندی سیکھنے آئی تھی۔ اس کو انگلش نہیں آتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ جب وہ کسی سے ہندی میں بات کرتی تھی تو سب غیر ملکی گوری سمجھ کر اس سے انگلش میں بات کرنے لگتے تھے۔ ابھی تو بات خوبصورت وادی اور اس کے حسین ترین پھولوں کی چل رہی ہے۔ وہ بچاری اس دن بہت پریشان تھی۔ اس نے اپنی دوستوں سے پوچھا۔''آج اجنبی لوگ اس سے اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ اس کو گلوب سمجھ کر اس میں پوری دنیا کا نقشہ کیوں ڈھونڈھ رہے ہیں؟''

اس کی دوستوں نے کہا۔''تم بالوں میں پھول جو لگائے ہوئے ہو۔''

اس نے حیرت سے جواب دیا۔''پھول تو تم بھی لگائے ہو۔''

دونوں زور سے ہنس پڑیں اور کہا۔''ہم نے پھول بائیں طرف لگایا ہے جس کا مطلب ہے کہ ہم شادی شدہ ہیں۔ تم نے پھول دائیں طرف لگایا ہے جس کا مطلب ہے کہ تم سنگل ہو اور تمھیں کسی کی تلاش ہے اسی لیے لوگ تمھیں گلوب سمجھ رہے ہیں۔ تمھارے بارے میں انفارمیشن لینا چاہ رہے ہیں اور دوستی کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے جلدی سے پھول نکال کر پھینکا اور کہا۔''میرے بالوں میں یہ پھول تم نے ہی تو لگایا تھا۔''

انہوں نے جواب دیا۔''ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم شادی شدہ ہو۔''

اس نے کہا۔''اور نہ مجھے ہی اس جزیرے کے دائیں بائیں پھول لگانے کے رواج کا پتا تھا۔ تم پھول لگائے تھیں میں نے بھی لگوا لیا تھا۔''

اس جگہ کا رواج ہے کہ بائیں طرف پھول لگانے کا مطلب ہوتا ہے کہ لیڈی شادی شدہ ہے یا اس کے پاس بوائے فرینڈ ہے۔ داہنی طرف پھول لگانے کا مطلب ہوتا ہے کہ پھول

لگانے والی خاتون سنگل ہے۔ پھولوں سے بھری اس خوبصورت وادی میں سائڈ واک پر اگر پیدل چلیں تو ہر طرف پھولوں کی دکانیں ہی دکانیں دکھائی دیں گی۔ گریجویشن ہو یا برتھ ڈے ہو ہر موقعے پر ہار گلے میں پڑ جائیں گے یا پھول پیش کیے جائیں گے۔ گریجویشن کے موقعے پر تو اتنے پھولوں کے ہار گلے میں پڑ جاتے ہیں کہ اسٹوڈنٹ کا منہ چھپ جاتا ہے۔ اتنے پھول ملتے ہیں کہ پکڑنے کے لیے دوسرے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ قبرستان میں قبریں ہمیشہ پھولوں سے سجی رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر جب جاتے ہیں تو ہمیشہ پھول لے کر جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جب اس کے ملک کی مووی میں پھول پہنے یا ہار پہناتے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمھارے ملک میں بھی ہار پھولوں کا رواج ہے تو وہ بتاتی تھی کہ ہمارے ملک میں تو ہار پھولوں کا رواج ہزاروں سالوں سے ہے، تو سب لوگ بہت حیرت کرتے ہیں۔ اس جزیرے کی سب سے دلچسپ اور خوبصورت چیز وہاں کے پھول ہی ہیں۔ اس نے اپنی انگلش نظم ’’پیراڈائز‘‘ میں اپنے پسندیدہ دو پھولوں کے نام لکھ دیے تھے۔ وہ تھے ’’برڈ آف پیراڈائز‘‘ (جنت کی چڑیا) اور ’’سلور سورڈ‘‘ (چاندی کی تلوار)۔ جب وہ نظم شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ پھولوں کا یہ صوبہ اس کو ہمیشہ اپنے وطن کی یاد دلاتا تھا۔ پھول، آم اور لیچی کے درخت اسے ہمیشہ اپنے وطن اپنے صوبے میں پہونچا دیتے تھے۔ یہ پھول ہی ہیں جو سب کو اپنی دلکشی اور حسن میں باندھ لیتے ہیں۔ وہاں کے عورتیں اور آدمی دونوں ہی پھولوں کے شوقین ہیں۔ صحیح معنوں میں وہ جنت ہے تب ہی تو وہ جزیرہ پیراڈائز کہلاتا ہے۔

◆÷◆

تصویر بتاں

جب سے شمسہ اس گھر میں شادی ہو کر آئی تھی اس کے لِونگ روم کی سجاوٹ وہ دونوں پینٹنگز تھیں جن سے اس کو سخت نفرت تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس کو اٹھا کر پھینک دیتی یا پھر ان دونوں تصویروں کی جگہ وہ اسٹور ہوتا جہاں بابا آدم کے وقت کا سامان بھرا پڑا تھا۔ ان تصویروں کو کبھی بھی اس کی ساس پھینکنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ شمسہ سوچتی تھی کہ اگر کوئی کباڑی ان تصویروں اور اسٹور کے بے کار سامان کو لے جاتا تو اس کی دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا اور گھر بھی صاف ہو جاتا۔ مگر اس کی ساس کو جیسے ضد تھی کوڑا کرکٹ گھر میں سنبھال کر رکھنے کا۔ ان پینٹنگز سے تو ان کو ایسے محبت تھی کہ جیسے کسی اعلیٰ مصور کی ہوں اور اس سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ ہوں۔ مگر ان تصویروں سے یادوں کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ تو پرانا سامان بیچنے والی کسی دکان سے ایک ایک ڈالر میں خریدی گئی تھیں جس کو بار بار بتانے میں اس کی ساس فخر محسوس کرتی تھیں۔ ہر ملنے والے کو بتاتے وقت بھی وہ اتنا ہی فخر کرتی تھیں۔ جب وہ دوسروں سے یہ ذکر کرتی تھیں تو اس کو بہت شرم آتی تھی اور اپنی ساس پر غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس نے کسی اور کے گھر میں اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ ان کی چیزیں تو بہت مہنگی ہوتی تھیں اور دوسرے دوسرے ملکوں سے خریدی ہوئی ہوتی تھیں۔ کوئی بھی پرانی چیزوں کی دکان سے کچھ بھی نہیں خریدتا تھا۔ اگر خریدتا بھی تھا تو بتاتا نہیں تھا۔ ایک اس کی ساس تھیں جو پرانی چیزیں بیچنے والی دکان سے خریدی اپنی چیزوں پر دوسروں کے سامنے فخر کرتی تھیں۔ اس کو بہت عجیب بات لگتی تھی۔

دنیا کے ہر شہر میں ایسی پرانی چیزیں بیچنے والی بہت سی دکانیں ہوتی ہیں جہاں لوگ اپنے گھر کا غیر ضروری سامان ڈونیٹ کر دیتے ہیں اور کم آمدنی والے یا غریب لوگ بہت کم قیمت پر خرید کر اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اس سے ان کی غریبی کا عیب ڈھک جاتا ہے اور ان کے گھر میں اچھا سامان بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جسم پر اچھے کپڑے نظر آتے ہیں۔ اس طرح امیر

غریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔اسی لیے اس نئی دنیا میں کوئی ننگا بھوکا نہیں دکھائی دیتا ہے۔سب خوشحال دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سب ملک بھی امیر اور خوشحال دکھائی دیتے ہیں جہاں جہاں یہ اسٹورز ہوتے ہیں۔اب وہی اسٹورز خوبصورت شوروم میں بدلتے جارہے ہیں، بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔لگتا ہے ایک ایسا بھی زمانہ آئے گا کہ وہاں سے بھی امیر ہی خرید وفروخت کرسکیں گے۔ غریب بیچاروں کی پہونچ وہاں تک بھی نہیں ہو پائے گی۔ان اسٹورز کی بدولت کبھی کبھی غریب امیر بھی بن جاتے ہیں۔ڈونیشن میں لوگ سونا چاندی، ہیرے جواہرات ،قیمتی سامان اور بیش قیمت اینٹیک چیزیں بھی غلطی سے یا جان بوجھ کر پھینک دیتے ہیں۔شاید کسی ضرورت مند غریب بیچارے کے کام آجائیں۔ ہرایک تو ان کی ویلیو نہیں پہچان پاتا ہے۔بس جس کی قسمت چمکنی ہوتی ہے وہی اس کی ویلیو یا وقعت سمجھ جاتا ہے اور مالا مال ہو جاتا ہے، یا پھران اسٹورز کو چلانے کے لیے یہ ایک افواہ بھی ہوسکتی ہے۔

اپنا گھر ہونے کے فخر سے شمسہ کی ساس اس کو بہت پریشان کرتی تھیں۔شمسہ کے میاں اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔اس لیے الگ گھر کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔وہ بھی کوئی مثالی لڑکی نہیں تھی۔ایک عام سی لڑکی تھی جس کے کچھ خواب تھے۔ایک ایسے گھر کا خواب جو اس کا ہو، وہ جیسا چاہے اس کو رکھے، جیسا چاہے اس کو سجائے ،مگر اس گھر پر تو اس کی ساس حاوی تھیں۔ وہ اس کا کیسے ہوسکتا تھا؟ اس گھر کو سجانے والی بھی ساس ہی تھیں۔ وہ تو بس اس کو دور سے دیکھ سکتی تھی۔اپنے وقت کی ،اپنی ضرورت کی یا اپنی پسند کی کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی تھی۔ اگر ایسا کرتی یا کرنے کی کوشش کرتی تو گھر کا ماحول خراب ہو جاتا تھا۔دونوں ساس بہو میں جھڑپیں چلتی رہتی تھیں۔اس نے بھی روایتی بہوؤں کی طرح کئی باران سے الگ اپنا گھر لے کر رہنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے میاں نے ساتھ نہیں دیا۔ایک نیک شریف اور ایماندار بیٹے کی طرح صاف جواب دے دیا۔''مجھے اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے۔میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' سسر شریف آدمی تھے انہوں نے فیصلہ کر دیا۔''اسی گھر میں اپنے لیے الگ حصہ بنوالو اور جیسا چاہو اپنا گھر رکھو۔''

اس نے ایسا ہی کیا۔ پرانی چیزوں سے اس کو سخت نفرت تھی اور وہ کبھی پرانی چیزیں خریدنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ سستی مہنگی نئی نئی چیزیں خرید کر اس نے اپنا پورشن سجانا شروع کر دیا۔

اس کو اپنی ساس کے ڈرائنگ روم اور اس کی سجاوٹ سے اب بھی بہت چڑ ھ اور نفرت تھی۔ خاص کر ان پینٹنگز سے جو اس کی ساس کی پسندیدہ تھیں۔ اس کی ساس کے ملنے والے آتے بلا وجہ کے لیے ان کے لِونگ روم اور خاص کر ان پینٹنگز کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کے اعلیٰ ذوق کی داد دیتے تھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ تصویریں اتار کر ان کے حوالے کر دیتی اور کہتی۔ ''یہ اعلیٰ ذوق آپ اپنے ساتھ لے جائیے۔''

اس کے ساس اور سسر اپنی پچاسویں شادی کی سالگرہ منا چکے تھے اور ایک ایک ڈالر کی خریدی پچاس سال سے ان کے گھر میں ٹنگی وہ پرانی پینٹنگز اب بھی سب کی تعریف وصول کر رہی تھیں۔ اس کی شادی کو بھی بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ایک دن اس کی ساس اس دنیا سے چلی گئیں۔ پورا گھر اس کا ہو گیا۔ اس نے لِونگ روم میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں جو کہ اس کا پچیس سال پرانا خواب تھا۔ ان پینٹنگز کو اس نے گھر سے باہر تو نہیں پھینکا لیکن وہاں سے نکال کر اسٹور میں ڈال دیا یہ سوچ کر کہ موقع ملتے ہی گھر سے باہر کر دے گی۔ اس کی بہو بھی آ چکی تھی۔ اس کی بہو نے بھی ٹھیک شمسہ کی طرح گھر میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں تھیں جیسا کہ اپنے وقت میں وہ کرتی تھی۔ وہ اپنی بہو کی حرکتوں کو برداشت کر رہی تھی کیونکہ ان تبدیلیوں میں اس کا بیٹا بھی اپنی بیوی کا ساتھ دیتا تھا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی تھی۔ اپنی ساس کی طرح منع نہیں کرتی تھی اور نہ ان کی طرح ڈانٹتی اور لڑتی تھی۔ کیونکہ اس کا بیٹا اپنے باپ کی طرح آئیڈیل نہیں تھا۔ اگر وہ کوئی بھی مخالفت کرتی تو وہ اپنی بیوی کے کہنے سے فوراً الگ ہو جاتا۔ وہ ان کو الگ نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے ساتھ بھی وہی پرانا مسئلہ تھا۔ اس کے اور اپنے میاں کے اکیلے رہنے کا مسئلہ۔ اسی لیے وہ خاموش رہنا بہتر سمجھتی تھی۔ ان دونوں کو بھی اس کی ساس کی طرح گھر میں پرانی اور اینٹیک چیزیں رکھنے اور سجانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اور اس کے بہو بیٹے نے سوچا کہ پرانے سامان سے بھرے اسٹور کی صفائی کر دی جائے، اس صفائی کا خواب تو وہ برسوں سے دیکھ رہی تھی۔ فوراً تیار ہو گئی۔ ان تینوں نے بہت سا سامان ڈونیٹ کرنے کے لیے الگ رکھ دیا۔ ان ہی سامان میں اس کی ساس کی ایک ایک ڈالر میں خریدی وہ دونوں پینٹنگز بھی تھیں۔ ایک دم سے اس کی بہو کی نظر ان پر پڑ گئی۔ اس نے ان کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ تو بہت پرانی پینٹنگز تھیں۔ پچاس پچپن سال سے تو ان کے گھر میں ہی موجود تھیں۔ اس حساب سے ان کی عمر سو سال

سے اوپر تھی۔ ان کا خالق بہت بڑا اور مشہور آرٹسٹ تھا جس کی پینٹنگز اب بھی لاکھوں میں بک رہی تھیں۔ وہ پینٹنگز بھی اوریجنل تھیں جن پر اس کو بنانے والے مصور کے دستخط بھی تھے۔ اس نے جلدی سے ان پینٹنگز کو الگ رکھ دیا۔ شمسہ کچھ سمجھ نہیں پائی اور ڈر گئی کہ کہیں پھر وہ تصویریں اس کے لِوِینگ روم کی زینت تو نہیں بننے والی ہیں۔ اس کو یہ ہی آثار نظر آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنی بہو سے کہا۔ ''ان تصویروں کو الگ کہاں رکھ رہی ہو؟ پھینکنے کے سامان میں رکھ دو۔'' اس کی بہو نے حیرت سے اس کی بات سنی مگر کچھ بولی نہیں۔

یہ انٹرنیٹ کا زمانہ تھا۔ اس نے ان تصویروں کی تحقیقات شروع کردی۔ ان پر خوب ریسرچ کی۔ بڑے بڑے اسپیشلسٹ کو دکھایا۔ سب نے اس کی ویلیو لاکھوں ڈالرز کی بتائی۔ اس نے ان کی ویلیو کا سرٹیفکیٹ لے لیا اور انٹرنیٹ پر ان کا نیلام شروع کردیا۔ پچاس ہزار ڈالرز سے نیلام کی شروعات ہوئی۔ لاکھوں ڈالرز میں وہ دونوں پینٹنگز بک گئیں۔ ان تصویروں کی بدولت پوری فیملی کی بہت شہرت ہوئی۔ وہ لوگ اخباروں اور ٹی وی کی خاص خبر بن گئے۔ ہر زبان پر یہ ہی خبر تھی۔ ''ایک ایک ڈالر میں ایک پرانی چیزوں کے اسٹور سے خریدی گئی پینٹنگز لاکھوں ڈالرز میں فروخت ہوئیں۔'' پورا خاندان خوشیاں منا رہا تھا۔ اس کے سسر اپنی مری ہوئی بیوی پر فخر کررہے تھے۔ اتنی خوشی کے موقعہ پر شمسہ کو بھی اپنی ساس بہت یاد آئیں اور اس کا دل ان کی عظمت اور عقیدت سے بھر گیا کیونکہ بعد مرنے کے ان کے گھر سے ایسی تصویریتاں نکلیں جو ان کے اہل خانہ کو عزت، شہرت اور دولت سے مالا مال کر گئیں۔

◆ ÷ ◆

ہرسنگھار سے نکلی یادیں

اس نے جیسے ہی لان میں قدم رکھا ہر طرف سناٹا ہوتے ہوئے بھی پتا نہیں کتنی یادیں دوڑتی ہوئی آئیں اور اس کے قدموں سے چمٹ گئیں، اس کے قدم اپنی جگہ پر رک گئے جیسے اس خالی گھر میں اب صرف یادیں ہی رہ رہی تھیں اپنوں کا انتظار کرتی اپنوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے۔ ہرسنگھار کے درختوں نے ہوا میں ہل ہل کر اس کا استقبال کیا۔ وہ وہیں پر بیٹھ گئی وہ ان درختوں کے استقبال کو کیسے فراموش کرسکتی تھی۔ اس کی اچھی بری یادوں کا تعلق ان سے بھی تو تھا جہاں صبح صبح ممی پاپا بیٹھ کر ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔ شاید تب سے جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اس کے بعد وہ بھی ان میں شامل ہوگئی تھی۔ اس وقت سے جب وہ صرف ایک ننھی منی بچی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو شام کی چائے کا اہتمام وہیں ہونے لگا۔ کبھی کبھی پاپا جب آفس سے آتے تو وہ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ ممی اس وقت بہت مشغول ہوتی تھیں مگر وہ بھی آجاتی تھیں۔ ممی کو ہرسنگھار بہت پسند تھا تب ہی اس کے لان میں ہرسنگھار کے یہ خوبصورت درخت دکھائی دیتے تھے۔ بچپن میں وہ شام کو وہیں پر بیٹھ کر کھیلا کرتی تھی۔ اس کا ناشتہ وغیرہ بھی وہیں پر آجاتا تھا۔

ایک دن عجیب بات ہوئی۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھی تھی اچانک ایک لڑکا آکر اس کے سامنے کی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اس کو حیرت سے دیکھا۔ وہ اس کو نہیں جانتی تھی۔ اس لڑکے نے کہا کہ وہ بہت دنوں سے اس کو دیکھ رہا تھا کہ وہ اکیلی کھیل رہی ہے۔ وہ بھی اکیلا کھیلتا تھا تو اس نے سوچا وہ دونوں مل کر کیوں نہ کھیلیں۔ وہ سامنے والے گھر سے آیا تھا اور اپنے دادا دادی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے ممی پاپا کو اس پر بہت رحم آیا۔ انہوں نے اس کے سر پر اپنا محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور اس دن سے وہ ان کا ہوگیا۔ وہ اسکول سے آنے کے بعد شام کو اس کے گھر آجاتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ ہوم ورک کرتے اور بہت دیر تک کھیلتے تھے۔ پھر ایک ساتھ کھیلتے کھیلتے بہت دن گزر گئے۔ اب وہ لوگ شام کی چائے بھی ایک

ساتھ پینے لگے۔اس کو اب اس کا انتظار رہنے لگا۔وہ شام کو بلا ناغہ بھاگتا ہوا اس کے پاس پہونچ جاتا تھا۔دونوں ایک ساتھ اپنا وقت گزارتے اور ایک دوسرے سے خوب باتیں کرتے۔کبھی کبھی اتنا زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے کہ چائے کی پوری کیتلی بھی کم پڑ جاتی۔

بچپن کے دن جوانی میں بدل گئے اور دوستی پیار بن گئی۔مگر ان کے ملنے کی جگہ نہیں بدلی وہ وہی رہی۔ ہر سنگھار کے سائے میں خوبصورت پھولوں کا حسن سمیٹے، بہاروں کی دلکشی چراتے ہوئے ان کا پیار بڑھتا رہا اور انجانے خواب سجاتا رہا۔وہ دونوں پیار کی اس معصوم دنیا میں آنے والے خوبصورت وقت کے خواب دیکھتے رہے۔دونوں کے گھر والوں نے ایک حسین شام کو ان کی منگنی کر دی۔ ہر سنگھار کے درختوں پر کھلے ہوئے پھول بھی جیسے ان کی خوشی میں شامل ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔سارے درخت ہوا سے ہل ہل کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ پھولوں کو ان پر سے نچھاور کر رہے تھے۔آخر وہ بھی تو ہمیشہ سے ان کے ساتھ تھے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی تھے۔اب ان کی تنہائی کو ایک رشتہ ایک نام ملنے والا تھا۔ ایک انگوٹھی نے ان کو ایک دوسرے کا کر دیا تھا۔ان کے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں تھیں۔ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکیں گے۔ اس لیے جلد از جلد ایک دوسرے کے ہو جانا چاہتے تھے۔مگر زندگی ان کے لیے جدائی کا پیغام لے کر نمودار ہو گئی۔خوشحال پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا اور امیلا کو انتظار دے گیا۔ایک طویل انتظار۔ کئی سال گزر گئے مگر وہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔اس کو صرف جھوٹی تسلیاں ہی دے دے کر بہلا رہا تھا۔وہ اس کے فراق میں دنیا کی ہر خوشی سے منہ موڑ بیٹھی تھی۔ دن رات اس کی یادوں میں کھوئی رہتی۔

وہ دن اس کے اوپر قیامت بن کر ٹوٹا جب خوشحال نے کہا کہ وہ منگنی توڑ رہا ہے۔تنہا رہتے رہتے وہ گھبرا گیا تھا۔آخر اس کی تنہا زندگی کو ایک اور لڑکی مل گئی اور وہ اس سے شادی کر رہا ہے۔امیلا اسی کرسی پر بیٹھی غم مناتی رہی۔دوسری خالی خالی کرسی اس شخص کی بے وفائی پر شرمندگی کا اظہار کرتی رہی۔وہ رنج وغم میں ڈوب گئی۔آنسو اس کی زندگی بن گئے۔سوگواری نے اس کی خالی خالی زندگی کو کفن بن کر لپیٹ لیا۔اس کو اپنا وجود ختم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔اس کے گھر والے اس کی اتنی خراب حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اس کی زندگی کو

مسرتوں کے دلنواز پھولوں سے سجا دیں۔ مگر وہ کچھ بھی سننے اور ماننے کو تیار نہیں تھی۔

خوشحال تو ایک جملہ بہت آسانی سے کہہ کر فرصت پا گیا اور اپنی زندگی کو خوشگوار اور خوشحال بنانے کے لیے، مگر امیلا اپنے کو مٹانے پر تل گئی ایک بے وفا کے لیے جس کی بے وفائی کے بدنما ہاتھوں نے اس کی پلکوں پر سجے خوابوں کو بیدردی سے نوچ لیا تھا۔ اس کے ارمانوں اور تمناؤں کے محل کو مسمار کر دیا تھا۔ اس کے ممی پاپا یہ کیسے برداشت کرتے کہ ان کی لاڈلی بیٹی ایک فضول سے آدمی کے لیے برباد ہو اور وہ تماشا دیکھتے رہیں۔ انہوں نے اس کے لیے ایک اور لڑکا ڈھونڈھ لیا جو اس کی زندگی میں شہنائی کی خوبصورت تان لے کر نمودار ہو گیا جو ایک نئی زندگی کا آغاز بن گیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گئی۔

آج برسوں کے بعد وہ اکیلی اس جگہ پر آئی تو ہرسنگھار کے درختوں کے نارنجی ڈنٹھل والے سفید پھولوں نے اس کو بچپن سے جوانی کی اس بھولی بسری کہانی کو یاد دلا دیا جس کو عرصہ ہوا وہ بھول چکی تھی۔ اس کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس خالی کرسی پر پہلے کی طرح ابھی ابھی وہ آ کر بیٹھ جائے گا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے اپنے تصور کی دنیا میں گم تھی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گئی سامنے کی کرسی پر واقعی میں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ’’تم کب آئے؟‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’میں اپنے گھر سے نکلا تو تمہیں بیٹھا دیکھا۔ شاید تم گزرا ہوا وقت یاد کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا میں بھی اس میں شامل ہو جاؤں۔ اس ماحول اس جگہ سے وابستہ میری بھی تو کچھ یادیں ہیں۔ پہلے کی طرح تم بھی تنہا دکھائی دے رہی ہو میں بھی تنہا ہوں۔ چلو ہم دونوں مل کر ایک بار پھر اپنے ماضی سے یادوں کے کچھ انمول موتی چن لیں۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’کون سی یادوں کی تم بات کر رہے ہو، مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں ہے، یاد ہے تو بس اتنا میرا بچپن اس جگہ گزرا تھا۔ میرے ممی پاپا میرے ساتھ تھے اور وہ میری ہر ادا پر فدا مجھے دیکھتے تھے۔ میری شادی پر یہ جگہ کتنی خوبصورت سجی تھی۔ میں اور میرے شوہر یہاں پر بیٹھا کرتے تھے۔ پھر ہمارے بچے یہاں پر کھیلنے لگے۔ ویسے ہی جیسے میں کھیلا کرتی تھی اور میں اپنے ممی پاپا کی طرح ان کو دیکھا کرتی تھی۔ میری یادوں میں تم تو کہیں بھی نہیں ہو۔ تم اب اکیلے ہو اور مجھے بھی اکیلا سمجھ کر سوچ رہے ہو کہ اس گزرے وقت کی طرح اس عمر میں پھر تمھاری تنہائی کو میرا ساتھ مل جائے گا۔ تاکہ تمہارے پاس یادیں ہی یادیں ہوں جب چاہو ان یادوں میں چلے جاؤ اور مجھے بھی

بلاوجہ کے لیے اپنے ساتھ ساتھ پاؤ۔ مجھے اب یادیں بنوانے کا شوق نہیں رہا۔اس لیے تم یہاں سے جاسکتے ہواب کبھی ادھر مت آنا۔''

وہ فوراًوہاں سے چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد وہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی میں اس کی یادوں میں وہ نہیں تھا مگر جب سے وہ اس جگہ پر واپس آئی تھی وہ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ہرسنگھار کے درختوں سے صرف اس سے وابستہ یادیں ہی نکل رہی تھیں جو اس کو بے چین کرر ہی تھیں،اس کو درد ہی درد دے رہی تھیں اور دل کو رنج وغم سے بھر رہی تھیں۔بچپن سے جوانی تک کا گزرا ہوا ہر لمحہ اس کے سامنے یادیں بن کر کھڑا ہوا تھا جس میں کوئی اور نہیں تھا صرف وہ ہی وہ تھا۔

◆÷◆

آخری خط کا درد اور طاقت

وہ ایک خط تھا درد میں ڈوبا فریاد کرتا ہوا جو تعلقات کے خاتمے کا اعلان تھا، مگر اس میں ایک ایسا درد ایک ایسی فریاد چھپی تھی کہ سنیب کا دل رو رہا تھا، یا پھر سنیب کا اپنا دل اس لیے رو رہا تھا کہ وہ ایک پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ تب ہی وہ سادہ سا خط بھی اس کو درد کا احساس دلا رہا تھا۔ اس لڑکی کے لیے تڑپ رہا تھا جس کا آخری خط اس کے سامنے کھلا ہوا تھا، جس میں لکھا تھا۔ ''آپ کو شادی کے لیے میرا اپنا نام پیش کرنا پسند نہیں آیا، ٹھیک ہے۔ یہ ایک شادی کا رشتہ تھا، خط و کتابت میں نے اپنی بہن کے نام سے شروع کی تھی۔ ہم لوگوں میں زیادہ مناسبت نظر آئی۔ اس لیے میں نے اپنا ہی نام پیش کر دیا۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ پتہ آپ کے پاس ہے۔ آپ شادی کا پیغام لا سکتے ہیں۔ اگر میری بہن اور میری امی کو منظور ہوا تو یہ شادی ہو سکتی ہے، میرے گھر میں کسی کو اس خط و کتابت کے بارے میں علم نہیں ہے اور میرا نام بھی اصلی نہیں ہے۔ میرا آپ سے اس خط و کتابت کا سلسلہ اب ختم ہوتا ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے، اب جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی شادی کا اشتہار نکلوایا تھا جس میں اس کی امی بھی شریک تھیں۔ اس کے پاس بہت سے خط آئے تھے۔ یہ خط اس کو سب سے زیادہ پسند آیا تھا جس میں ایک لڑکی اپنی بہن کے بارے میں خط و کتابت کر رہی تھی۔ خط بہت دلچسپ تھے اور لڑکی کا سراپا اور خوبیاں ویسی ہی تھی جیسی اس کی تلاش تھی۔ وہ ایک اصولی آدمی تھا۔ اس کو لڑکی کا اپنا نام پیش کرنا پسند نہیں آیا۔ اگر وہ خود اس میں دلچسپی لے رہی تھی تو خط و کتابت بھی اپنے نام سے ہی کر سکتی تھی۔ مگر کتنے دنوں تک وہ اپنی بہن کے لیے خط لکھتی رہی۔ جب وہ راضی ہو گیا تو اس نے اپنے کو پیش کر دیا۔ اسے بہت برا لگا اور اس نے انکار کر دیا۔ وہ بھی اسی کی جیسی فطرت کی تھی فوراً آخری خط لکھ کر اس سے قطع تعلق کر لیا اور ایک راستہ بھی دکھا دیا کہ وہ اس کا پتہ جانتا ہے۔ اس کی بہن کے لیے اس کی فیملی سے رابطہ کر سکتا ہے۔ یعنی اس کے پاس بھی ایک مارل، ایک

اصول تھا جو اس کو اس سے کہیں زیادہ اونچا ثابت کر رہا تھا۔ مگر اس کے دل نے اس لڑکی کو ہی اپنا مان لیا تھا اور خط و کتابت کے ذریعے اپنا ایک ہمدم، ایک ہمراز پا لیا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے اب زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ بات اب ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی شادی کا معاملہ اب اپنی امی پر چھوڑ دیا۔

روتے دل کی اس پکار کو اس کی امی جمیلہ نواز نے جیسے سن لیا۔ وہ خط جو سنیب بہت دیر سے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اس کے درد کی عکاسی کر رہا تھا اور خط کے آخری الفاظ جیسے لکھنے والے کی دل کی دھڑکن بن گئے تھے۔ ایک انوکھی کیفیت کا اعلان کر رہے تھے۔ درد دل کی خاموش صدا تھے۔ جب سنیب اپنے کمرے سے چلا گیا تو وہ اس کے کمرے میں آئیں تو ان کو نادرہ کا کھلا خط اس کی میز پر رکھا ہوا ملا۔ وہ اس خط و کتابت سے واقف تھیں۔ وہ بھی اس کے لکھے ہوئے خط پڑھتی تھیں، ایک طرح سے انہوں نے ہی اس فیملی کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ سنیب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں مگر اس کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اخبار کا سہارا لیا اور خط و کتابت سنیب سے ہی کروائی۔ تاکہ اگر وہ کوئی لڑکی پسند کر لے تو وہ بات آگے بڑھائیں۔ کتنی عجیب بات تھی ان خطوں میں سنیب نے بھی اپنے اصلی نام سے خط و کتابت نہیں کی تھی۔ نادرہ کے نام کی طرح۔ بہت سے خط آئے۔ کچھ خط لڑکیوں نے خود لکھے، کچھ کے والدین نے یا دوسرے رشتے داروں یا دوستوں نے لکھا تھا۔ یہ واحد خط تھا جو کسی لڑکی نے اپنی بہن کے لیے لکھا تھا۔ ان کو اور سنیب دونوں کو پسند آیا تھا۔ فیملی انہیں کی فیملی کی طرح تھی۔ لڑکی میں وہ سب خوبیاں تھیں جن کی انہیں تلاش تھی۔ آخری خط پڑھ کر وہ مایوس نہیں ہوئیں۔ لڑکی کی تجویز انہیں پسند آئی۔ بلکہ وہ لڑکی بھی انہیں پسند آئی۔ بہن کا نام لے کر خط لکھ رہی تھی تو کیا ہوا آخر وہ ان کی آئیڈیل تھی۔ ان کے لڑکے کی ناراضگی بھی ٹھیک تھی، اس لیے انہوں نے سنیب کو بتائے بغیر ایک فیصلہ کیا کہ وہ اس فیملی سے ضرور ملیں گی۔ ان خطوں کا حوالہ نہیں دیں گی، اور بگڑی ہوئی بات سلجھانے کی کوشش کریں گی۔

طلعت ہاشم کے شوہر کے انتقال کے بعد آمدنی کا واحد ذریعہ ان کی کوٹھی کے وہ حصے تھے جو انہوں نے کچھ تبدیلی کروا کر کرائے پر اٹھا رکھے تھے اور ایک کماؤ بیٹے کی طرح ان کے گھر کو چلانے کا سہارا تھے۔ ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا صرف چار بیٹیاں تھیں۔ ان کی پرورش، دیکھ بھال،

تعلیم ،شادی بیاہ سب اکیلی ان کی ہی ذمہ داری تھی جسے وہ بہت خوش اسلوبی سے نباہ رہی تھیں۔ بڑی بیٹی ایم بی اے کر کے بہت اچھی نوکری پر لگ گئی تھی۔ وہ اب اس کی کمائی کھانے کے بجائے اس کی شادی کرنے کی سوچ رہی تھیں۔ دوسری بیٹیاں نمرہ، شیرین اور شہلا ابھی پڑھ رہی تھیں۔ اچانک ان کے بہت پرانے کرایہ دار نے اپنا گھر بنوالیا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ وہ پریشان ہوگئیں۔ گھر کی ایک آمدنی جوختم ہوگئی تھی۔ وہ بہت اچھے کرایہ دار تھے۔ اب ان کو فکر ہوگئی تھی کہ لڑکیوں کا ساتھ ہے، پتا نہیں دوسرا کرایہ دار کیسا ملے۔ اچانک ان کی دوست کی رشتہ دار ایک اکیلی خاتون مل گئیں جن کے بیٹے بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور وہ خود بزنس کے سلسلے میں وقتی طور سے اس شہر میں آئی ہوئی تھیں۔

یہ کتنے اتفاق کی بات تھی کہ جمیلہ نواز کو اس لڑکی کی کوٹھی میں ہی کرایہ پر رہنے کی جگہ مل گئی۔ ان کی کزن نے انہیں بتایا کہ اتفاق سے اس فیملی کے ایک کرایہ دار نے اپنا مکان بنوالیا ہے۔ ان کی کوٹھی کا وہ حصّہ خالی ہوگیا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو ان کو وہ پورشن کرائے پر دلوا سکتی ہے۔ انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔ اس سے اچھا اس فیملی سے جان پہچان پیدا کرنے کا دوسرا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ وہ وہاں رہنے چلی گئیں۔ سامان وغیرہ کی بھی زیادہ ضرورت نہیں تھی وہ فرنشڈ گھر تھا۔ وہ طلعت ہاشم کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں، دونوں کی کہانی قریب قریب ایک جیسی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ طلعت ہاشم کے پاس چار لڑکیوں کی ذمہ داریاں تھیں اور ان کے پاس صرف ایک بیٹے کی جو وہ پوری بھی کر چکی تھیں۔ طلعت ہاشم کو اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی شادیوں کی بھی فکر تھی۔ جمیلہ نواز کو وہ بہت نیک خاتون لگیں کیونکہ وہ خود بھی ایک نیک خاتون تھیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ بھی ان کی مدد کریں گی تا کہ ان کی لڑکیاں نیک اور شریف خاندانوں میں شادی ہو کر چلی جائیں۔ لڑکیوں سے ابھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بڑی بیٹی ثمرہ ایم بی اے کر کے نوکری کر رہی تھی۔ دوسری لڑکیاں ابھی پڑھ رہی تھیں۔ ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ ان کی بیٹیاں نمرہ اور شیرین آ گئیں۔ نمرہ اور شیرین نہایت فیشن ایبل، بہت خوبصورت اور اسٹائلش تھیں۔ دونوں کافی مغرور سی لگ رہی تھیں۔ دونوں نے آتے ہی ان کو سلام کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں۔ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ طلعت ہاشم نے انہیں بتایا کہ ’’یہ ان کی نئی کرائے دار جمیلہ نواز ہیں۔‘‘ وہ دونوں خاموش ہوگئیں۔ پھر فوراً وہاں سے اٹھ گئیں جیسے انہیں ان کا کرائے دار ہونا پسند نہیں آیا۔ شاید ان کی

نظروں میں ان کے گھر کے ایک پورشن کی کرائے دار کوئی معمولی انسان تھیں جوان کی ٹکّر کی نہیں تھیں۔ ماں نے کہا۔ ''جاؤ میرے اور آنٹی کے لیے چائے بنا لاؤ۔'' انہوں نے سنا ہی نہیں بس خاموشی سے وہاں سے چلی گئیں۔ پھر واپس نہیں آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑی بیٹی ثمرہ اور چھوٹی بیٹی شہلا بھی آ گئیں۔ دونوں بہت ہی خوبصورت تھیں۔ بڑی کے چہرے پر تو ایک عجیب سا نور تھا جو دیکھنے والوں کے دلوں کو روشن کر رہا تھا۔ ایسا حسن، ایسی خوبصورتی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ سادگی سے بھرے اس حسن پر جیسے دنیا کی ہر سادگی ہر حسن خود قربان ہو رہا تھا۔ وہ اس کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ دونوں نے نہایت ادب سے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے بیٹھنے کے لیے کہا، مگر ثمرہ نے فوراً کہا، ''آنٹی میں ابھی آ کر بیٹھوں گی۔ آپ لوگوں کے لیے چائے بنا لاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور شہلا بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے اور ناشتہ لگ گیا۔ چائے اور ناشتہ لگتے ہی نمرہ اور شیرین بھی آ گئیں۔ گھر کے بنے ہوئے سموسے، نمک پارے اور پکوڑے بہت لذیذ تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اتنی جلدی بن گئے تھے۔ انہوں نے شرمندگی سے کہا۔ ''تم نے اتنی جلدی اتنی چیزیں بنا لیں۔ اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے لیے تو بس ایک کپ چائے کافی تھی۔ تم ابھی ابھی اتنی تھکی ہوئی آئی تھیں۔''

اس نے بہت نرمی سے کہا۔ ''آنٹی مجھے کوئی تھکن نہیں ہے۔ آپ کھانا بھی یہیں کھائیں گی۔ بلکہ آپ کو کھانا وغیرہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناشتہ کھانا ہم لوگ ساتھ ہی کھایا کریں گے۔''

انہوں نے فوراً کہا۔ ''نہیں اتنی تکلیف تو میں ہرگز نہیں دوں گی۔ پھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی؟''

ثمرہ نہایت شائستگی سے بولی۔ ''آپ اور امی ایک دوسرے سے باتیں کیجیے گا۔ کبھی کبھی آپ لوگوں کا دل چاہے تو آپ بھی کچن میں آ کر کچھ پکا سکتی ہیں۔''

دونوں کو ہنسی آ گئی۔ یہ بات نمرہ اور شیرین کو بہت بری لگی۔ جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو وہ فوراً وہاں آ گئیں اور کہا۔ ''بلاوجہ کے لیے ان کی پوری ذمہ داری لینے کی کیا ضرورت تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تم کو کیوں برا لگ رہا ہے۔ تمہیں تو کچھ کرنا نہیں ہے۔''

ثمرہ سمجھ گئی کہ ان دونوں کو وہ بیچاری کوئی غریب حقیر ہستی نظر آ رہی ہیں۔ یہ دونوں اپنے آپ کو کوئی بہت اونچی چیز سمجھتی ہیں۔ باقی سب لوگ ان کی نظروں میں حقیر ہیں۔ غریبوں کو تو ایسا

حقیر سمجھتی ہیں جیسے خود کہیں کی رانی ہوں۔ ان کو بہت غرور ہے کہ بہت خوبصورت اور فیشن ایبل ہیں اور دوسرے ان کے سامنے کچھ نہیں ہیں۔ حقیر ہیں۔ یہ ہی دو خوبیاں جیسے ان کو بہت بلندی عطا کرتی ہیں۔ سادگی سے رہنے والی اپنی دو بہنیں بھی ان کو اپنے سے بہت کمتر دکھائی دیتی تھیں۔ وہ دونوں ہمیشہ اپنے لیے کوئی شاندار امیر آدمی کا انتظار کرتی تھیں۔ اگر کوئی رشتہ آتا اور وہ معمولی لوگ ہوتے تو وہ دونوں ناک بھوں چڑھاتی۔ الگ ہو جاتیں۔ ثمرہ کی خواہش ہوتے ہوئے بھی وہ سامنے نہیں جاتی تھیں اور اگر مہمان کسی بڑی گاڑی سے اترتے تھے اور وہ رشتہ خاص ثمرہ کے نام سے لایا جاتا تھا تو نمرہ خود سج دھج کر چلی جاتی تھی، اس کو وہاں آنے سے روک دیتی تھی۔ مگر اتنی امیر جگہ پر بات کبھی بنی نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اتنے امیر لوگ اپنے برابر کے لوگ ڈھونڈ ھتے ہیں۔ ان کے معمولی رہن سہن والے گھر میں بات کہاں بن سکتی تھی۔ طلعت ہاشم چاہتی تھیں کہ پہلے ثمرہ کی شادی ہو۔ مگر ثمرہ ایک لڑکے کی طرح گھر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھی اور وہ چاہتی تھی کہ پہلے نمرہ اور شیرین کی شادی مناسب جگہ ہو جائے ورنہ ان دونوں کی احساس برتری ان کو غلط راستے پر بھی ڈال سکتی ہے، ابھی تک وہ بھٹکی نہیں تھیں اگر اپنی تلاش کے سلسلے میں آدمیوں کے پیچھے لگ گئیں تو بھٹک سکتی ہیں، اور ان کی زندگی بھی برباد ہو سکتی ہے۔ جمیلہ نواز نے ان دونوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھیں کہ کیا ان خطوں کو لکھنے والی نمرہ تھی؟ اس کو کسی امیر خاندان کی تلاش ہو سکتی تھی۔ وہ ان کو اپنا ایک معمولی کرایہ دار سمجھ رہی ہے۔ اپنے رویے سے وہ ان کو حقیر اور اپنے کو کوئی غیر معمولی ہستی بنا کر پیش کر رہی ہے۔ وہ اس کا نفسیاتی پہلو سمجھ گئی تھیں پھر بھی وہ ان دونوں سے دوستی کی خواہش مند تھیں۔ لڑکیاں مغرور تھیں مگر بگڑی ہوئی نہیں تھیں ان کو اس فیملی سے ہمدردی اور اپنا پن پیدا ہو گیا تھا۔ طلعت ہاشم سے انہیں محبت سی ہو گئی تھی۔ وہ ان کی طرح ہی ایک شریف ،اصولوں کی پابند خاتون تھیں۔ کتنی اچھی تربیت کے ساتھ وہ اپنی لڑکیوں کی نگہداشت کر رہی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ لڑکیاں ابھی بگڑی نہیں تھیں، صرف اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن تھیں۔ ان کو سنبھالنے کے لیے ایک اچھے رہبر کی ضرورت تھی۔ ایک دن جب ثمرہ اور شہلا گھر نہیں آئی تھیں۔ وہ اور طلعت ہاشم گھر پر تھیں۔ نمرہ اور شیرین گھر پر آ چکی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان دونوں سے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ جمیلہ نواز نے اپنی اصلی کہانی چھیڑ دی انہوں نے کہا۔

''بہن، میرے صرف ایک ہی بیٹا ہے، بہت ہی ہونہار اور تعلیم یافتہ اس نے اپنے باپ دادا کے

بزنس کو بہت ہی عروج پر پہنچا دیا ہے۔اب مجھے بھی ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو اس کے بزنس میں بھی ساتھ دے۔لڑکی مجھے ہی ڈھونڈھنی ہے۔دولت کے لیے تو بہت سی لڑکیاں چپکی رہتی ہیں مگر نیک اور شریف لڑکی کا ملنا بہت مشکل ہے۔ابھی تک مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی ہے۔میں اس شہر میں اپنے بزنس کے سلسلے میں وقتی طور پر آئی ہوئی ہوں۔اب سوچ رہی ہوں کہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور بلوالوں۔بیکار میں تین تین گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں، جب کہ میرا لڑکا بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ بزنس کے سلسلے میں بیرون ملک گیا ہوا ہے۔''

ان کی باتیں دور بیٹھی ہوئی نمرہ اور شیرین کے کانوں میں پڑیں تو وہ دونوں چونک پڑیں۔وہ خاتون جن کو وہ دونوں حقیر سمجھتی تھیں وہ تو ان کے خیالوں سے بھی اونچی نکلیں۔وہ شہزادہ جس کی انہیں اپنے لیے تلاش تھی وہ تو ان کے پاس ہے۔وہ دونوں جلدی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔اسی وقت ثمرہ اور شہلا بھی آگئیں۔سلام کر کے وہ بھی بیٹھ گئیں۔ایک دم سے جمیلہ نواز نے کہا۔''میرے سر میں شدید درد ہے اب میں چلتی ہوں۔'' ثمرہ جلدی سے بولی۔''آنٹی ابھی کہاں جائیں گی۔آپ کے سر میں درد ہے میں آپ کے سر میں تیل لگا کر آپ کا سر دبا دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ تیل کی شیشی لینے چلی گئی۔تھوڑی دیر میں وہ تیل کی شیشی لے کر آگئی۔ایک دم سے نمرہ نے اس کے ہاتھ سے شیشی لے لی اور کہا۔''لاؤ مجھے یہ شیشی دے دو۔میں آنٹی کے سر میں تیل لگا کر ان کا سر دبا دوں گی۔'' ثمرہ کو بہت حیرت ہوئی مگر شیشی اس نے دے دی۔تھوڑی دیر کے بعد بولی۔''تم آنٹی کا سر دبا رہی ہو میں آنٹی کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔سر کے درد میں فائدہ کرے گی۔'' ایک دم سے شیرین بولی۔''آپ کہاں تکلیف کریں گی۔چائے میں ہی بنا کر لے آتی ہوں۔'' اس بار ثمرہ کے ساتھ شہلا بھی حیرت سے اچھل پڑی۔ان دونوں کو ہی ان دونوں کے برتاؤ سے بہت ہی حیرت ہوئی۔تھوڑی دیر کے بعد ثمرہ نے کہا۔''ٹھیک ہے آج تم لوگ آنٹی کے لیے کھانا بھی بنا لینا۔میں اور شہلا شاپنگ کے لیے جا رہی ہیں۔''

''بیٹی، میں بھی شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہوں۔اگر کل چلو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' جمیلہ نواز نے کہا۔

نمرہ جلدی سے بولی۔''آنٹی، کل آپ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلیے گا، ان لوگوں کو اچھی شاپنگ کہاں آتی ہے۔''

طلعت ہاشم ہنس کر بولیں۔ ''نمرہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جایئے گا بھی نہیں۔ یہ آپ کا بجٹ فیل کروادے گی۔''

نمرہ نے اپنی امی کو گھور کر دیکھا۔ وہ چپ ہوگئیں۔ اب نمرہ اور شیرین کی کوشش رہتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ جمیلہ نواز کے قریب رہیں، ان کے لیے کھانا بنائیں، ان کا ہر طرح سے خیال رکھیں۔ ثمرہ اور شہلا بہت زیادہ حیرت میں تھیں کہ کہاں تو وہ ایک غریب اور حقیر کرایہ دار تھیں اور کہاں وہ ان دونوں کی اتنی ہر دل عزیز ہوگئیں کہ وہ ان کی خدمت میں دن رات لگی رہتی تھیں۔ ان کا ہر کام خود کرتی تھیں کسی اور کو نہیں کرنے دیتی تھیں۔ وہ دونوں بھی خوش تھیں کہ اب ان کو بھی تھوڑا وقت مل رہا ہے۔ مگر اس کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی وجہ ان دونوں کی سمجھ میں آگئی۔ جب ان کا ڈرائیور ایک بہت مہنگی بڑی سی کار لے کر نمودار ہوا۔ اور ان لوگوں کو ان کے ہونہار تعلیم یافتہ امیر بیٹے کی بابت معلوم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آنٹی اس کے لیے لڑکی ڈھونڈھ رہی ہیں۔ ثمرہ کو خوشی ہوئی کہ کاش نمرہ کا نصیب کھل جائے اور آنٹی اس کی خدمت سے خوش ہوجائیں۔ آنٹی کبھی کبھی ان دونوں کی خدمت کی تعریف بھی کرتی تھیں، کبھی نصیحت بھی کردیتی تھیں۔ وہ دونوں خوشی خوشی سنتی تھیں پر ابھی نہیں مانتی تھیں۔ ثمرہ سوچتی تھی کہ ان کے پاس لڑکا تو ایک ہے خدمت دو دو لڑکیاں کر رہی ہیں۔ مگر اس کو اطمینان تھا کہ آنٹی کے بہت سے امیر امیر رشتہ دار ہیں وہ اگر خوش ہوگئیں تو دوسری کو بھی کہیں نہ کہیں کھپا دیں گی۔ اس کو خوشی تھی کہ ان دونوں کا غرور اور احساس برتری کم ہو رہا تھا۔ وہ لوگ نارمل بن رہی تھیں، ورنہ اس کو خدشہ ہوگیا تھا کہ وہ دونوں کوئی اور بھیانک کھیل نہ شروع کردیں۔ ابھی تک ماں کے کہنے میں تھیں مگر تھوڑی تھوڑی بغاوت شروع کردی تھی۔

اب اس دن نمرہ اور شیرین نے بہت بہترین کھانا بنایا۔ آنٹی بہت خوش ہوئیں اور کہا۔ ''تم دونوں اتنا اچھا کھانا بنالیتی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی ورنہ فیشن ایبل لڑکیوں کو تو کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ تو اپنے فیشن میں لگی رہتی ہیں۔ اگر خوبصورت بھی ہیں تو اپنے غرور میں رہتی ہیں۔ تمہاری ماں نے بہت اچھی تربیت دی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ جس گھر جاؤ گی اس کو جنت بنا دوگی، اپنے اس برتاؤ سے، اپنی خدمت سے، اپنی تربیت سے۔ تمہارے سسرال والے تم سے بہت خوش رہیں گے۔'' دونوں نے فخر سے گردن اکڑائی۔ ثمرہ کو ایسا لگا کہ جیسے کہہ رہی ہوں، ایک بار شادی

ہوجانے دو پھر دیکھو کیسی خدمت کرتی ہوں۔ دن میں تارے نہ دکھلا دوں تو کہنا۔

ایک دم سے جمیلہ نواز بول اٹھیں۔ ''نہ نہ تم دونوں بہت اچھی ہو میں تم دونوں کو ہمیشہ ایسا ہی اچھا دیکھنا چاہتی ہوں یعنی جیسی باہر سے ہو ہمیشہ ویسی ہی دل کی بھی رہنا۔ تب ہی تمھاری زندگی کامیاب ہوگی، بناوٹ ظاہر ہوجاتی ہے چھپی نہیں رہتی۔ وہ زندگی کی ناکامی بن جاتی ہے۔ جب تم نیک اور شریف ہو تو اندر باہر دونوں سے ویسی ہی نظر آؤ۔ مجھے فخر ہے کہ تم دونوں اندر باہر سے ایک جیسی ہو۔''

ثمرہ ان کی باتوں سے حیران رہ گئی جیسے اس کی طرح انہوں نے بھی ان دونوں کا دل ودماغ پڑھ لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ آنٹی کی باتیں کتنی اچھی ہیں کاش ان باتوں کا اثر ان دونوں پر بھی ہوجائے اور ان کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہوجائے۔ آنٹی کی صحبت اور باتوں میں رہ کر واقعی میں وہ دونوں بدلنے لگیں۔ ان کی تعریفوں اور دعاؤں سے ان دونوں کی احساس کمتری جو احساس برتری میں بدل گئی تھی کم ہورہی تھی۔ ان کا پاگل دل ودماغ اب نارمل ہورہا تھا۔ ان دونوں کو ہی نہیں گھر میں اب سب کو انتظار تھا کہ وہ کب اپنے بیٹے کا رشتہ دیتیں ہیں اور کس کے لیے دیتیں ہیں۔

پھر حیرتوں کا پہاڑ گراتا وہ دن آ گیا۔ آنٹی جمیلہ نواز نے اچانک اعلان کیا کہ ان کی بہن کو ایک خوبصورت فیشن ایبل لڑکی کی تلاش ہے۔ انہوں نے نمرہ کا نام دے دیا ہے۔ طلعت ہاشم نے کہا بھی۔ ''آپ نے نمرہ کا نام کیوں دے دیا۔ ثمرہ کا نام دیتیں۔ وہ بڑی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''فرق کیا پڑتا ہے۔ ثمرہ ہو یا نمرہ۔ شادی تو دونوں کی ہی کرنی ہے۔ اب اس فیملی کے خیالات اور لڑکی کی تلاش نمرہ پر پوری اترتی ہے تو ثمرہ کا نام دے کر بات خالی کیوں کی جائے۔ نمرہ سے ہوسکتا ہے بات بن جائے۔ وہ فیملی بہت ماڈرن اور فیشن ایبل ہے۔ ان کو ایسی ہی لڑکی کی تلاش ہے۔ اپنی نمرہ بھی خوبصورت ہونے کے ساتھ ماڈرن اور فیشن ایبل بھی ہے۔ بہت نیک اور شریف ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ کھانا پکانے اور گھر داری میں بھی ماہر ہے۔ حالانکہ وہ لوگ بہت امیر ہیں ان کے یہاں نوکر چاکر ہیں۔ ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جو ایک لڑکی یا نمرہ جیسی لڑکی کا خواب ہوتے ہیں۔''

تھوڑی دیر کے لیے طلعت ہاشم، نمرہ، ثمرہ اور شیرین دنگ رہ گئیں۔ جمیلہ نواز کی بات

بھی ٹھیک تھی۔ سب ہی کو اس کے اعلیٰ خوابوں اور بہت اونچے اسٹینڈرڈ کا علم تھا۔ ثمرہ نے شیرین کے چہرے پر ایک اطمینان اور خوشی دیکھی۔ وہ سمجھی کہ آنٹی نے اپنے بیٹے کے لیے اس کو پسند کیا ہے۔ آنٹی اور ان کے بیٹے سے بڑھ کر آئیڈیل تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ثمرہ کی جو خوبیاں انہوں نے گنوائیں تھیں وہ سب آنٹی کی دی ہوئی تھیں ورنہ اس کو تو سوائے فیشن کے کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ اور شیرین غصّہ اور بدزبانی میں تو استاد تھیں۔ ثمرہ سوچ رہی تھی کہ اس نے بہت اپنے آپ کو تبدیل کیا، بہت اداکاری کی مگر اس میں کچھ کمی رہ گئی اور شیرین اس سے آگے نکل گئی۔ اس کے خوابوں کی حسین تعبیر تو ان کا بیٹا تھا جس سے وہ کبھی نہیں ملی تھی اور نہ اس کو اس نے دیکھا تھا۔ جمیلہ نواز اس طرح اپنے بیٹے کے بارے میں بات کرتی تھیں کہ ان کا بیان ان دونوں کے خوابوں کے شہزادے سے مل جاتا تھا۔ ثمرہ کو بھی کوئی اپنا انجانا اَن دیکھا یاد آ جاتا تھا جو اکیلا اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا، جس کو اچانک ہی اس نے پانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کو انکار کی صورت میں دستیاب ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ خواب تھا کہ حقیقت مگر وہ اس کے دل کے بہت قریب تھا۔ پھر اپنی بہنوں کی بدلتی سیرت اور فطرت دیکھ کر وہ ڈر گئی اور اس نے اپنے خوابوں پر پردہ ڈال دینا ہی بہتر سمجھا۔ وہ اتنی خودغرض نہیں تھی کہ صرف اپنے اور اپنے خوابوں کے لیے سوچتی۔ اس کی ماں پر بہت ذمہ داریاں تھیں۔ وہ ذہنی طور پر پریشان دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ان کی پریشانیاں دور کرنا چاہتی تھی اور ان کی ذمہ داریوں میں ان کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ صرف اپنے خواب سجانا، اپنی زندگی بنانا نہیں چاہتی تھی۔ خواب اگر ٹوٹ بھی جائیں تو آواز نہیں ہوتی لیکن اگر ماں کا دل ٹوٹ جائے تو زندگی ٹوٹ سکتی ہے۔ سب کچھ ختم ہو سکتا ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے دو لڑکیوں کو بگڑتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ان کے لیے اس کی امی کتنی مجبور دکھائی دے رہی تھیں، ان کا ثمرہ کے علاوہ ساتھ دینے والا دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں یہ آنٹی ایک فرشتۂ رحمت بن کر نمودار ہوئی تھیں، اس کی اور اس کی امی کی ساری فکروں کا حل لے کر۔ دوسرے دن وہ لوگ آنے والے تھے وہ اور اس کی امی ڈر رہی تھیں کہ کہیں ثمرہ انکار نہ کر دے یا وہ لوگ ان کی حیثیت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ کیونکہ دونوں کو امید تھی کہ آنٹی بہت امیر اور اچھی فیملی کی ہیں تو ان کی بہن بھی ضرور ان کے ٹکّر کی اور ان کے جیسی ہوں گی۔ آنٹی کی بہن اور ان کی فیملی ایک بہت مہنگی اور خوبصورت کار پر نمودار ہوئیں۔ بہت ہی فیشن ایبل اور ماڈرن لوگ تھے جیسے ثمرہ کے خوابوں نے حقیقت کا جامہ پہن لیا ہو۔ وہ لوگ بھی بہت خوش ہوئے۔ ان کو ویسی

ہی فیملی اور لڑکی چاہیے تھی۔ اسی وقت شادی طئے ہوگئی۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک آنٹی اپنی ایک دوست کی فیملی لے کر آ گئیں۔ وہ بھی پہلے والی فیملی کے جیسی تھی، اس بار شیرین کا نصیب جاگا تھا۔ طلعت ہاشم نے اعتراض بھی کیا کہ ''بڑی کے ہوتے ہوئے چھوٹوں کی شادیاں طئے ہو رہی ہیں۔ وہ بھی تو آخر ان کی ذمہ داری ہے۔''

ثمرہ نے ان کو سمجھایا۔ ''جیسا ہو رہا ہے ویسا ہی ہونے دیجیے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور اچھی نوکری رکھتی ہے۔ ان دونوں کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا ہے۔ بی اے کر بھی لیا تو کیا کر لیں گی۔ ان کے لیے شادی ہی ٹھیک ہے اور اتفاق سے جیسا وہ دونوں سوچتی تھیں ویسے ہی موڈرن اور امیر گھر بھی مل گئے ہیں، اور آنٹی نے ان کو بدل بھی دیا ہے۔ اگر شادی نہ ہوئی تو پھر سے بگڑ سکتی ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتی ہیں۔ والد صاحب کے نہ ہونے سے وہ اپنے کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔''

طلعت ہاشم کو اس کی بات ماننی پڑی۔ ایک مہینے کے بعد ہی دونوں کی ایک ساتھ ایک ہی دن شادی بھی ہوگئی۔ طلعت ہاشم اور ثمرہ کو جمیلہ نواز اور بھی پیاری ہو گئیں اور بھی اپنی سی لگنے لگیں۔ ایک دن جمیلہ نواز نے کہا کہ ان کا بیٹا آ رہا ہے۔ اور وہ سیدھا یہیں آئے گا۔ طلعت ہاشم بہت خوش ہوئیں۔ اس دن جمیلہ نواز صرف اپنے بیٹے کی ہی باتیں کر رہی تھیں اور طلعت ہاشم بہت دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ ان کے بیٹے میں اتنی خوبیاں تھیں کہ وہ کسی کا بھی آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ طلعت ہاشم سوچ رہی تھیں کہ کاش ان کے پاس بھی ایسا ہی ایک بیٹا ہوتا۔ پھر انہوں نے شکر ادا کیا کہ ان کی بیٹیاں بھی بیٹوں سے کم نہیں ہیں خاص کر ثمرہ کسی طرح بھی کسی بیٹے سے کم نہیں ہے۔ ثمرہ کو افسوس تھا کہ وہ جن کا آئیڈیل تھا ان دونوں کی تو جمیلہ آنٹی نے دوسری جگہ شادی کروا دی ہے۔ وہ دونوں خوش بھی بہت ہیں۔ پھر اچانک اس کی خوبیاں سن سن کر اس کو بھی ہمیشہ کی طرح کوئی یاد آنے لگا۔ جو اپنے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتا تھا جس کو ایک غیر معمولی لڑکی کی تلاش تھی۔ ثمرہ کو لگتا تھا کہ جیسے وہ خود وہ لڑکی ہے اور اس لڑکے کی مثالی لڑکی کی ساری خوبیاں اس میں ہی موجود ہیں اور اس نے اس لڑکے کو بتا بھی دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ دیتے تھے۔ خطوں میں لکھ دیتے تھے حالانکہ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن تب بھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہوں۔ مگر بات نہیں بنی تھی

بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی، اور یہاں تو اس کے لیے کوئی بات بھی نہیں تھی اور نہ اس کو ان کے بیٹے کی خواہش تھی۔ جن کو خواہش تھی ان کو جمیلہ نواز نے دوسرے گھروں میں بسا دیا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اگر وہ اپنانا چاہتیں تو اپنا سکتی تھیں مگر انہوں نے خود ان کے لیے دوسرے بہت اچھے گھر ڈھونڈھ دیے تھے۔ پتا نہیں کیوں اس دن پھر جمیلہ نواز کی باتوں کو سن کر اس کو ایسا لگا ان کو اپنے لڑکے کے لیے ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہے جس کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو اس نے کبھی کسی کو لکھ کر بھیجی تھیں کیونکہ اس کو بھی ایسی ہی خوبیوں کی لڑکی کی تلاش تھی۔ ابھی وہ دونوں خواتین باتیں کر رہی تھیں کہ کال بیل بج اٹھی۔ وہ دروازہ کھولنے چلی گئی کہ شاید شہلا آ گئی ہو یا پھر ثمرہ اور شیرین آئیں ہوں۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک ہینڈسم آدمی کھڑا تھا جو جمیلہ نواز کو پوچھ رہا تھا۔ وہ جمیلہ نواز کو بلانے چلی گئی۔ اس نے ان کو بتایا تو وہ فوراً دروازے پر چلی گئیں اور اس کو اپنے ساتھ لے کر گھر کے اندر آ گئیں۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا سب سے تعارف کروایا۔ ثمرہ جلدی سے چائے بنانے چلی گئی۔ چائے اور ناشتہ لگا کر اس نے سب کو بلایا۔ سب ناشتہ کرنے لگے تو وہ کھانا بنانے میں لگ گئی اور زیادہ بات نہیں کی۔ اس نے بہت محنت سے کھانا بنایا حالانکہ دونوں خواتین نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی مگر اس نے منع کر دیا اور کہا کہ آپ لوگ باتیں کیجیے۔ کھانا وہ خود بنا لے گی۔ اتنے میں اچانک ثمرہ اور شیرین بھی آ گئیں۔ آنٹی کے بیٹے کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ واقعی میں ان کے خوابوں سے بھی اونچا تھا مگر وہ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئیں کیونکہ ان کے شوہر خود بہت اچھے تھے اب ان کو دوسرے آدمیوں کو دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ان کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو وہ ضرور اس میں دلچسپی دکھاتیں بلکہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتیں۔ وہ لوگ سنیب سے باتیں کرتی رہیں۔ دو تین دن کے بعد اچانک جمیلہ نواز شہلا کے لیے بہت اچھا رشتہ لے آئیں۔ لڑکا اسی شہر میں پڑھ رہا تھا اس کے ماں باپ دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ لڑکے کے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد شادی ہو جائے تا کہ شہلا اور اس کا میاں ارمان طلعت ہاشم کے ساتھ رہنے لگیں۔ اگر بعد میں ثمرہ کی شادی ہو جائے تو طلعت ہاشم اکیلی نہ رہیں۔ ان کی بات سن کر طلعت ہاشم خوش نہیں ہوئیں بلکہ اداس ہو گئیں کیونکہ دور دور تک ثمرہ کی شادی کا پتا نہیں تھا۔ مگر شہلا کے لیے وہ انکار بھی نہیں کر سکیں۔ شہلا کی شادی طئے ہو گئی، اور جلد ہی شادی بھی ہو گئی۔

اب اس دن نمرہ اور شیرین آئی ہوئی تھیں۔ ثمرہ ان کی خاطر و مدارت میں لگی ہوئی تھی۔ اچانک جمیلہ نواز اور سنیب آ گئے۔ اور آتے ہی جمیلہ نواز نے ثمرہ کے لیے سنیب کا رشتہ دے دیا۔ نمرہ، شیرین اور طلعت ہاشم حیران رہ گئیں۔ جمیلہ نواز اسی لیے جلدی جلدی سب کی شادیاں کروا رہی تھیں کہ ثمرہ اور طلعت ہاشم کی ذمہ داریاں ختم ہو جائیں کیونکہ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے ثمرہ کو پسند کر رکھا تھا۔ ان کو اپنے بیٹے اور اس کی مرضی کا انتظار تھا۔ ان کے خلوص پر طلعت ہاشم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ثمرہ اور سنیب کی شادی ہو گئی۔ وہ سنیب اور جمیلہ ہاشم کے شہر چلی گئی۔ جمیلہ ہاشم اکیلی نہیں تھیں ان کے ساتھ شہلا اور اس کے شوہر ارمان رہ رہے تھے۔ کچھ دن کے بعد ثمرہ اور جمیلہ نواز واپس آ گئیں۔ آتے ہی جمیلہ نواز نے طلعت ہاشم سے کہا۔ ''مجھ کو اور ثمرہ کو آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔ آپ اپنی یہ کوٹھی بیچ دیجیے۔ میں نے اپنے ہی شہر میں اپنے گھر کے پاس آپ کے لیے ایک کوٹھی دیکھ رکھی ہے، آپ اس کو خرید لیجیے۔ آدھا حصہ کرائے پر اٹھا دیجیے گا اور آدھے میں آپ خود رہیے گا تا کہ لڑکیاں آپ سے ملنے آتی رہیں۔ میں اور ثمرہ آپ کے قریب ہی رہیں گے۔ ہم دونوں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے اور آپ ہمارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ لڑکیوں کی اب اپنی زندگی ہے۔ آپ نے ان کے لیے بہت کیا۔ اب آپ کو اور مجھ کو اپنی زندگی جینا چاہیے۔ سنیب اور ثمرہ ہماری دیکھ بھال کریں گے۔ آپ کی کوٹھی شہلا کے ساس سسر خرید لیں گے میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ وہ اپنی زمین جائیداد بیچ کر اسی شہر میں رہنا چاہتے ہیں۔'' طلعت ہاشم اور ثمرہ حیران رہ گئیں۔ ایک بار پھر انہوں نے ان دونوں کو زبردست حیرت میں ڈال دیا۔ دور دور تک جب کوئی نہیں تھا تو وہ رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں اور طلعت ہاشم کی زندگی کی ہر مشکل حل کر دی تھی۔ لڑکیوں کی شادیاں بہترین جگہوں پر آناً فاناً کروا دیا جو سہیلہ ہاشم کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''بہن آپ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ تھیں جو میری زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے آئی تھیں اور اس خوبی سے سلجھائیں کہ عقل حیران ہے۔ آپ ایک اکیلی عورت نے ہم پانچ عورتوں کی دنیا ہی بدل دی۔ واقعی میں اگر ایسے ہی عورتیں عورتوں کے مسائل سلجھائیں خاص کر لڑکیوں کی شادی اور ان کی تربیت کے مسائل تو لڑکیاں کسی بھی ماں باپ کو بوجھ نہ لگیں۔ ان کی پیدائش رنج و غم کا باعث نہ بنے۔''

جمیلہ نواز کی اپنی کوٹھی سے بہت قریب صرف دو کوٹھیاں چھوڑ کر ایک کوٹھی بک رہی تھی وہ

جمیلہ نواز کے کہنے پر طلعت ہاشم نے خرید لیا اور وہاں آ کر رہنے لگیں۔ ثمرہ اور جمیلہ نواز ان کے قریب تھیں۔ ثمرہ نے ہی ہمیشہ ان کی دیکھ بھال کی تھی اب بھی وہ ہی ان کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ جمیلہ نواز بھی طلعت ہاشم کے دل کے قریب تھیں اب ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی کے قریب آ گئیں تھیں۔ اب طلعت ہاشم کو پہلے کی طرح کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ کہیں ان کے گھر کو چھوڑ کر ان سے بہت دور نہ چلی جائیں۔ دوسری لڑکیاں بھی ان سے ملنے آتی تھیں اور ان کے پاس ٹھہرتی تھیں۔ جمیلہ نواز اور طلعت ہاشم ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھیں۔ ان کی زندگی میں اب کسی فکر و پریشانی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کی سوشل لائف بہت عروج پر تھی۔ وہ دوسری اپنی جیسی پریشان، فکر و تردد میں ڈوبی عورتوں کی ہر طرح کی مدد کرنے لگیں۔ ان کی زندگی کی پریشانیوں کو دور کرنے کا حل ڈھونڈھنے لگیں اور دور کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ثمرہ سنیب کے ساتھ خوش اور اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ وہ بزنس میں بھی سنیب کی مدد کر رہی تھی۔ یہ اس کی نیکی، اور ماں کی خدمت گزاری کا بہت بڑا انعام تھا۔ اس نے ان کی اتنی بڑی بڑی ذمہ داریوں میں ان کا بھرپور ساتھ دیا، صبر کا دامن تھام کر اپنے ہاتھوں سے دوسروں کی زندگی بنانے میں لگ گئی تو بہاریں اس کی زندگی کو سجانے لگیں۔ آسمان کے چاند تارے اس کی زندگی میں اپنا نور بھرنے لگے۔ گل اپنی رعنائی اور خوشبو اس پر لٹانے لگے، خوشیاں اس کی زیست کو سنوارنے میں لگ گئیں، ماں کی دعائیں اس کی شاندار زندگی کا پیراہن بن گئیں۔ یہ سب تو اس کو ملنا ہی تھا اس کا حق تھا۔ ایک دن وہ سنیب کی الماری صاف کر رہی تھی۔ اچانک بہت سے خطوط اس کے ہاتھ لگ گئے۔ سب سے اوپر آخری خط تھا۔ وہ دنگ رہ گئی یہ تو اس کے لکھے ہوئے خط تھے۔ تو کیا سنیب وہ آدمی تھا جو عقیل کے نام سے خط و کتابت کر رہا تھا؟ وہ پریشان ہو گئی۔ سنیب تو اس سے شادی سے انکار کر چکا تھا اب اگر اس کو معلوم ہو گیا کہ وہ وہی لڑکی ہے تو کیا ہوگا؟ اس کی اتنی خوبصورت زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کا پیار ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گا۔ سب لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ اس کی امی تو جیتے جی مر جائیں گی۔ کتنی مشکل سے کتنے دن بعد ان کی زندگی میں خوشیاں آئی تھیں، زندگی میں ایک اطمینان آیا تھا۔ زندگی کی اس غلطی کا اس کو بار بار احساس ہو رہا تھا۔ وہ بہت پریشان ہو گئی حالانکہ خطوں کے اس آدمی کو وہ بھولی نہیں تھی۔ وہ اس کا آئیڈیل تھا، اس کے جواب نے اس کو ہرٹ کیا تھا۔ بہت تکلیف پہنچائی تھی مگر پھر بھی وہ چاہت بن کر اس کے دل میں بیٹھ گیا

تھا۔ وہ خطوں کو پکڑے سکتے جیسی کیفیت میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ اتنے میں سنیب آ گیا اس کے ہاتھوں میں خطوط دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا اور اس کی حالت دیکھ کر پریشان بھی ہوا اور جلدی سے بولا۔ ''یہ خطوط تم کو کہاں سے مل گئے؟ اور تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ کیا تم انہیں محبت نامے سمجھ رہی ہو؟ مگر یہ ویسے خطوط نہیں ہیں۔'' پھر وہ اس کو ان خطوں کے بارے میں بتانے لگا۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بات میں تم سے نہیں چھپاؤں گا۔ مجھے یہ لڑکی بہت پسند تھی اس کو کھونے کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ میرے زرا سے اصول نے مجھے اس سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔'' اس کی بات سن کر اس کو اطمینان ہوا اور اس نے انکشاف کیا۔ ''میرے دل کی حالت بھی آپ کے جیسی تھی مگر معاملہ میرے ہاتھوں میں نہیں تھا۔ میں تو بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ میں نے بہت بے عزتی محسوس کی تھی۔ اس آخری خط کو لکھنے کے بعد میرے دل کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم دونوں ایک جیسی کیفیت سے گزر رہے تھے پھر بھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر بیٹھے۔''

سنیب نے ایک دم سے چونک کر سوال کیا۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ کیا تم ہی وہ لڑکی ہو؟''

''ہاں میں نے ہی یہ خط لکھے تھے۔ مگر پتا نہیں آنٹی کو کیسے علم ہوا جو انہوں نے ہم کو ڈھونڈھ کر ملا دیا۔'' ثمرہ نے حیرت سے کہا۔ اچانک جمیلہ نوازان کے کمرے میں آ گئیں اور کہا۔ ''میں نے تم لوگوں کو اس لیے ملا دیا کیونکہ یہ خط و کتابت مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ میرے ہی کہنے پر ہو رہی تھی۔ آخری خط میں مجھے ایک درد سا دکھائی دیا اور میں نے اس درد کو محسوس کر لیا۔ نہ صرف اس درد کو بلکہ مجھے سنیب کے درد کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ ایک دن یہ آخری خط ایک فریاد بن کر میرے ہاتھوں میں آ گیا۔ لڑکی کی تجویز مجھے پسند آئی اور میں اس آخری خط کو انتہا نہیں بلکہ ابتدا سمجھ کر نکل پڑی۔ چاروں لڑکیوں میں اس لڑکی کو تلاش بھی کرنا تھا۔ وہاں پہونچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ تلاش، یہ شادی، اتنی آسان نہیں ہے جیسا کہ میں سمجھ رہی تھی۔ جب میں نے اس لڑکی کو پہچانا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ لڑکی کتنی الگ، کتنی عظیم تھی۔ اس کو اپنی ماں اور بہنوں کی فکر تھی۔ ان کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی ذمہ داریوں کو اپنا رکھا تھا اور ان کو پورا کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے اس کو اس کی ذمہ داریوں سے آزاد

کرنا ضروری تھا۔تب ہی وہ شادی کے لیے راضی ہوسکتی تھی۔ ورنہ ہمیشہ کی طرح وہ یہ رشتہ بھی اپنی بہنوں کی طرف بڑھا دیتی۔مگر میری اور میرے بیٹے کی پسند تو وہی تھی کوئی دوسری لڑکی اس کی جگہ کیسے لے سکتی تھی۔'' دونوں خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔جمیلہ نواز مسکرا مسکرا کران کی ہی داستان ان لوگوں کو سناتی رہیں جس کی ابتدا ان دونوں نے کی تھی، ایک انوکھی محبت کی دلکش داستان کی ابتدا جس کو جمیلہ نواز نے ان دونوں کو بتائے بغیر بہت خوبی کے ساتھ بہت ہی خوشگوار اختتام تک پہنچا دیا تھا۔ثمرہ اور سنیب نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آخری خط کے درد اور اس کی طاقت کے قائل ہو گئے۔

◆÷◆

سمندر کے کنارے

ہمارے خوبصورت جزیرے کی خوبصورت وادی کا حسن اور سمندر کے کنارے اپنی تمام دلفریبی کو لے کو نمودار ہوتے ہیں۔ایسے بیچیز دنیا میں کہیں نہیں ہیں۔زیادہ تر سمندر میں ٹھنڈا پانی رہتا ہے یا جہاں کا جیسا موسم ہو اس کے مطابق رہتا ہے۔لیکن یہاں ہمیشہ گنگنا پانی یا وارم واٹر رہتا ہے۔ایسا مناسب پانی شاید اور کہیں نہیں ہے۔ جب کہ سمندر کے کنارے (بیچ) پوری دنیا میں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارا جزیرہ پوری دنیا کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے اور یہ سمندر کے کنارے دنیا کی ہر خوبصورتی سے سجے ہوئے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ انسانی آنکھ جو خوبصورتی دیکھنا چاہے وہ یہاں موجود ہے۔دنیاوی بھی،قدرتی بھی اور انسانی بھی۔ہم سب کو معلوم ہے کہ ’بیچ‘ کا ایک مخصوص لباس یا ڈریس کوڈ ہوتا ہے اور یہ نظارہ بھی بہت خوب ہوتا ہے۔مگر مشرقی لوگوں کے لیے اس دنیا کو دیکھنا بھی گناہ ہوتا ہے اور اس لباس کا تصور تک گناہ عظیم ہے۔تب ہی تو ایک مولانا صاحب یہاں تشریف لائے تو وہ گھبرا گئے۔انہوں نے فوراً مسجد میں دل کو دہلانے والی زبردست تقریر کی اور اس طرف دھیان دلوایا،ڈرایا،دھمکایا،اور ان بیچیز کی طرف جانے کو گناہ عظیم بتایا اور کہا کہ یہاں کے رہنے والوں کے لیے ہم جیسے لوگوں کو آتے رہنے کی اور تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ سب لوگوں کا دین و ایمان محفوظ رہے۔جب کہ برسوں سے رہنے والے ہم بیچارے لوگ اپنی تبلیغ خود ہی کر چکے تھے اور ہم مقامی لوگ بن چکے تھے۔ہم کو معلوم تھا کہ ہر بیچ پر مخصوص لباس والے لوگ نہیں ہیں۔ڈریس کوڈ یا مخصوص لباس کے لیے کچھ مخصوص بیچیز ہیں۔ باقی سمندر کے کنارے قدرتی حسن کے نظارے لیے ہوئے ہیں۔یہاں سردی ہے نہ گرمی ہے۔ایک جیسا موسم ہے۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ۔ ہریالی، پھول، پہاڑ ،سمندر،قوس قزح، رنگ برنگی پھول،رنگ برنگا آسمان سب ہی کچھ اپنی دلکشی کے ساتھ موجود ہے۔مولانا صاحب کی تقریر سے سب بہت متأثر ہوئے،گھر گھر ان کی اور ان کی جماعت کی دعوت ہوئی۔ایک جگہ دعوت میں کچھ

آدمی ان کو ہوٹل سے اپنے ساتھ لے جانے کے لے گئے۔ وہ ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرے تھے جو مخصوص لباس والوں کی بیچ کے کنارے تھا۔ مولانا صاحب ہوٹل میں نہیں تھے۔ ان ہی کے کسی ساتھی نے بتایا کہ مولانا صاحب بیچ پر ہیں۔ سب آدمی ان کو لینے کے لیے گئے تو دیکھا وہ صاحب بیچ پر بیٹھے تھے۔ سب کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے اور کہا۔ ''میں یہاں پر قدرتی حسن کا نظارہ کرنے آیا تھا۔'' واقعی میں وہاں پر حسن ہی حسن تھا، قدرتی حسن، دنیاوی حسن اور انسانی حسن۔ ہم تو اپنے جزیرے کی خوبصورت وادی نام کے شہر کے مشرق کی تہذیب اور مغرب کی تہذیب کے درشن کروا رہے تھے۔

مغرب کا درشن تو یہ ہی ہے کہ وہ اپنے بیچ کے ڈریس کوڈ یا مخصوص لباسوں میں نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ہم دیسی لوگ ہیں جن کی ہر تقریب بیچ پر بنے ہوئے خوبصورت پارکوں میں ہوتی ہے۔ شادی کر کے آئے ہوئے لوگوں کے ریسپشنس سے لے کر سالگرہ، پکنک، اپنی نجی دعوتیں، نئے دولھا دلہنوں کی دعوتیں وغیرہ وغیرہ یہیں پر ہوتی ہیں۔ اکثر سیاح لوگوں کا مقام ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں یورپ، جاپان چین وغیرہ سے لوگ شادی کرنے یہاں آتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک ڈھکی سفید گاؤن پہنے دلہنیں بھی فوٹو کھنچواتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شادیوں کی دعوتیں بھی یہیں پر ہوتی ہیں۔ یہاں تک اپنی دعوتوں میں جماعت کی نمازیں، کبھی کبھی عید کی نمازیں یا عید کی مسجد کی طرف سے دی جانے والی دعوتیں، پکنک بھی سمندر کے کنارے ہوتیں ہیں۔ سب آدمی عورتیں اپنے اپنے ملکوں کے فیشن اور فینسی کپڑوں میں ہوتے ہیں۔ عورتیں شلوار سوٹ، ساری، لہنگا، شرارے، غرارے سب ہی ڈریس میں دکھائی دیتی ہیں۔ خوب بھاری بھاری کام بنے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ اس پر سے اصلی نقلی بھاری زیوروں کی سجاوٹ اپنے اپنے وطن میں پہنچا دیتی ہے۔ حجاب اور برقعہ بھی ہوتا ہے۔

یہ سب نظارے ہماری خوبصورت وادی کے بیچ یا سمندر کے کنارے کے ہیں جو کہ سارے جہاں کے کلچر کا دلچسپ نظارہ کروا دیتے ہیں ساتھ میں مشرق اور مغرب کے فرق کا مخصوص نظارہ بھی ملتا ہے۔ ایک صاحبہ نئی نئی اس جزیرے میں آئیں تھیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''یہاں اپنے دیسی زیور کپڑے نہیں پہنے جاتے ہیں۔''

میں نے جواب دیا تھا۔ ''یہاں پکنک اور بیچ پر بھی دیسی زیور کپڑے پہنے جاتے ہیں۔''

وہ صاحبہ بہت زور سے ہنسی تھیں۔شاید انہیں بیچ کے لباس اور اپنے فینسی کپڑے اور زیور دونوں ایک ساتھ یاد آ گئے تھے۔دونوں کا فرق واقعی میں ہنسی کا دلچسپ موضوع تھا۔اب ہم صرف اتنا ہی کہیں گے ہمارے خوبصورت جزیرے کی اس خوبصورت وادی کی ہر چیز دلچسپ اور اس جزیرے کی خوبصورتی کی طرح خوبصورت اور دلفریب ہے۔

◆ ÷ ◆

دو سہیلیاں

زلیخا اور سشما دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ ان دونوں میں بہت پیار تھا۔ ہمیشہ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ایک ہی جیسے مضمون لینے سے ان کی دوستی اور بھی مضبوط ہوتی رہی۔ دونوں کا رکشا بھی ایک ہی تھا جس سے وہ روزانہ اسکول آتی جاتی تھیں۔ بہت زیادہ دوستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں اپنے اپنے گھروں کی اکیلی لڑکیاں تھیں۔ دونوں کے پاس تین تین بھائی تھے۔ عید بقرعید، ہولی دیوالی، چاروں تیوہاروں کے موقعوں پر وہ دونوں ہی نئے نئے کپڑے بنواتی تھیں اور ایک دوسرے کے گھر تیوہار منانے جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہر تیوہار انہیں دونوں کے لیے بنے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی پڑوسی بھی تھیں۔ وہ دونوں خاندانوں ہی کی نہیں دونوں محلوں کی بھی لاڈلی بیٹیاں تھیں۔ محلے کی ایک گلی کا نام ہنومان گلی تھا اور محلے کی دوسری گلی کا نام سید پورہ تھا۔ بڑی عجیب بات تھی سید پورہ میں سشما کا اکیلا عالیشان مکان تھا۔ ہنومان گلی میں زلیخا کا حویلی نما شاندار گھر تھا۔ اس محلے میں چاروں طرف ہندو رہتے تھے جو زلیخا کے والد سید صاحب کو اپنا بزرگ مانتے تھے اور برسوں سے رشتے داروں کی طرح رہتے چلے آرہے تھے۔ کسی کے گھر میں کوئی تقریب ہوتی تھی تو سید صاحب کا گھرانا آگے آگے رکھا جاتا تھا۔ دادا، نانا، چچا، ماموں، اور بھائی کے خوبصورت رشتوں میں بندھی ہوئی وہ خوبصورت حویلی تھی۔ زلیخا کے بڑے بھائی کی شادی کے فوراً بعد ہولی پڑی تھی۔ سید صاحب کی حویلی میں پورا محلّہ جمع ہوا تھا۔ ایسی ہولی کھیلی گئی تھی جو اَب تک یادگار تھی۔ شام کو زلیخا کے بھائیوں کے سب ہی دوست بھابی کے لیے بڑے بڑے مٹھائی کے ڈبے لے کر آئے تھے جو کہ اس شہر اور اس گلی کا دستور تھا کہ اگر دیور بھابی کے ساتھ ہولی کھیلتے تھے تو ہولی کی شام کو مٹھائی کے ڈبے تحفے میں لاتے تھے۔ کسی گھر میں اگر لڑکا یا لڑکی کے رشتے کے لیے لوگ آتے تھے تو سید صاحب بزرگوں میں شامل ہوتے اور ان کے مشورے سے ہی رشتے طئے ہوتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے سید صاحب کے

گھر سے ہی اعلیٰ سامان، ڈنر سیٹ، اور ٹی سیٹ وغیرہ جاتے تھے۔ بھائی چارے اور ہندو مسلم دوستی کی یہ بہت بڑی مثال تھی۔

یہی حال سشما کے محلّہ کا بھی تھا۔ مسلم محلے میں اس کا اکیلا ہندو گھر تھا جو مسلمانوں کے ہر دکھ اور سکھ کا ساتھی تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے لیے پسینے کی جگہ خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جب کبھی شہر کی فضا خراب ہوتی اور ہندو مسلم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دیتے تو دونوں کو بہت حیرت ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے سے مذاق کیا کرتی تھیں۔ زلیخا کہتی۔
''اگر کبھی یہاں ہندو مسلم فساد ہوا اور تمھاری گلی میں اگر ہندوؤں نے حملہ کیا تو صرف تمہارا گھر بچے گا۔ اور اگر ہمارے محلے میں مسلمانوں نے حملہ کیا تو صرف میرا گھر بچے گا۔''

سشما جواب دیتی۔ ''سنا گیا ہے کہ فساد کے وقت زیادہ تر آگ ہی لگائی جاتی ہے۔ اب آگ یہ تو نہیں دیکھے گی کہ مسلمان کا گھر چھوڑ کر ہندو کے گھر چلی جائے یا ہندو کا گھر چھوڑ کر مسلمانوں کے گھر چھلانگ لگا دے۔''

زلیخا بہت افسوس کے ساتھ کہتی۔ ''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی چین نہیں ہے، انسان محفوظ نہیں ہے۔ ابھی تک مذہب اور اعتقاد کی لڑائیاں ہی چل رہی ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اکیسویں صدی اپنے ساتھ انسانوں کے ریلیکس کا زمانہ لائے گی۔ بہت سی ایجادیں ہوئی ہیں جو کہ ایک آرام دہ زندگی کی طرف اشارہ ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہے۔ مگر یہ جنگیں، یہ نفرت ہم کو وہیں پر پہنچا رہی ہیں جہاں سے ہم ہزاروں سال سے چل رہے ہیں، نفرتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، خاص کر مذہبی نفرت کا بوجھ۔ اب مذہب عجوبہ نہیں رہ گئے ہیں۔ سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ بھٹکی ہوئی انسانیت اور انسانوں کو سیدھے راستے پر چلانے کے لیے مذہب آئے، انسانوں میں ڈسپلن اور مارل پیدا ہو، تاکہ ایک اچھے نظام کا انتظام ہو، ہر انسان کو جینے اور جیتے رہنے کا حق مل جائے۔ مذہب اور سیاست کے نام پر معصوم انسان کیوں موت کا نشانہ بنیں؟ اب سب کو اپنے اور دوسرے کے مذہب کی معلومات ہیں، مذہب کی اہمیت ہے۔ اب نہ کوئی مذہب کے نام پر مرنا پسند کرتا ہے اور نہ مارنا۔ مذہب کو اس کی دلکشی کے ساتھ اپنائے رکھنا چاہتا ہے، اس کی خوبیوں پر چلنا چاہتا ہے۔ جنت کی خواہش کے ساتھ اس دنیا کو جنت بنا کر رہنا چاہتا ہے۔''

سشما بھی چپ نہیں رہتی اور کہتی۔ ''تم سچ کہتی ہو واقعی میں کیسی کیسی ایجادیں ہوگئی ہیں۔ انسان چین سے جیتا اور دوسروں کو جینے دیتا۔لڑائی ہوتی بھی تو معشیت کی لڑائی ہوتی، مہنگائی سےلڑائی ہوتی، بم پھٹتے تو غریبی کے خاتمے کے،راکٹ چلتے تو انسانی خوشحالی کے۔مگر یہ فساد، یہ جنگیں اب زیادہ بڑھ گئی ہیں کیونکہ اب انسان درندہ بن گیا ہے۔ جب انسان درندہ بن جاتا ہےتو اس کی آنکھ پر پٹی بندھ جاتی ہے۔اس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے کہ وہ کیا کررہا ہےاس پر خون،تعصب کا بھوت سوار ہوجاتا ہے۔ مذہب کے نام پرانسان اپنے جنون کومطمئن کرتا ہے۔ وہ انسان کو مارتا ہے۔ کسی مذہب کونہیں، مذہب زندہ رہتا ہے ختم نہیں ہوتا۔اس دیوانگی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔سب کو جینے کا حق ملنا چاہیے بغیرکسی خوف و ہراس کے جینے کا حق۔کب تک ہم نمرود کی خدائی اورفرعون کی فرعونیت دیکھتے رہیں گے۔ جب کہ وہ دونوں بھی نہیں رہے۔ختم ہوگئے۔ایک دن یہ لعنت بھی ختم ہوگی۔تب دیکھنا یہ زندگی ہماری ہوگی، ہرایجاد ہماری ہوگی، یہ ایجادیں جو سہولتیں اورآرام لائیں ہیں وہ ہماری ہوں گی۔ان سے ملنے والی خوشی ہماری ہوگی۔آخر زندگی کتنی بڑی ہوتی ہےاس کوتو ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔اگرسات جنم بھی لیے جائیں تب بھی زندہ رہنے کے لیےصرف چندپل ہی ملتے ہیں۔اتنی چھوٹی سی زندگی دوسروں کے ہاتھوں مارے جانے کےخوف سے بھری کیوں گزرے؟''

جب کبھی ان کے شہر کی فضا خراب ہوتی تو دونوں ڈر جاتیں اوراس طرح کی باتیں کرتیں۔ ہرطرف ان کوخوف زدہ چہرے دکھائی دیتے ہرایک ڈر سے کانپتا نظرآتا۔کہیں ظالموں کا گروہ ان کے گھر پرحملہ کرکےان کی جان نہ لے لے یاان کا مال نہ لوٹ لے۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔شہر پرسکون تھا۔ ہرطرف رونق ہی رونق تھی۔اس دن سشما زلیخا کے گھر آگئی۔ دونوں بہت دیرتک باتیں کرتی رہیں۔ایک دم سے سشما کو یادآ گیااور وہ بولی۔''بہت اچھی نئ فلم لگی ہے۔چلودیکھ آئیں۔''

زلیخانے کہا۔''بہت اچھا خیال ہے، چلو۔'' یہ کہہ کرزلیخا نے اپنا برقعہ سنبھالا اوردونوں مووی دیکھنے چلی گئیں۔مووی ختم ہونے کے بعد جب وہ دونوں تھیٹر سے باہرآئیں تو دنگ رہ گئیں۔شہر کی فضا بہت خراب تھی۔ ہندومسلم فساد ہوگیا تھا۔ ہرطرف ٹینشن تھی۔خطرہ اس علاقہ میں بھی تھا جہاں وہ دونوں رہتی تھیں۔ دونوں بہت پریشان تھیں۔ دونوں نے طئے کیا کہ ایک

دوسرے کے گھر چلی جائیں لیکن ڈیڈی کے ڈر سے یہ خیال بدل دیا۔ مگر سچائی تو یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے گھر میں اپنے کو محفوظ نہیں سمجھ رہی تھیں۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ مذاق میں کہتی تھیں وہی خیال ان کے دل میں تھا۔ سشما کے گھر جانا زلیخا کے لیے مسلمانوں کے ہاتھوں موت کی گھاٹ اترنا تھا اور سشما کا زلیخا کے گھر جانا ہندوؤں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بننا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ فرقہ وارانہ فساد کے وقت جب انسان پاگل ہو جاتا ہے تو ہندوؤں کا گروہ مسلمانوں کے محلوں پر حملہ کرتا ہے اور مسلمانوں کا گروہ ہندوں کے محلّے پر حملہ کرتا ہے۔ دونوں بہت پریشان تھیں کہ کیا کریں؟ بہت دیر بعد دونوں نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ دونوں جانتی تھیں کہ وہ اپنے اپنے محلّے میں محفوظ ہیں۔ سارا خطرہ گھر سے باہر سڑک پر تھا۔ حملہ آور اپنے فرقہ کی لڑکی کو تھوڑی ماریں گے اور اپنے محلّے والے جو بھی مذہب مانتے ہوں وہ اپنے ہیں اور وہ دونوں اپنے اپنے محلّے کی بیٹیاں ہیں۔ برسوں کا ساتھ اور پیار ان کی رگوں میں رشتہ داری کے خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ اسی لیے سشما نے ترکیب رکھی کہ وہ زلیخا کا برقعہ اور اس کا اللہ والا لاکٹ پہن لے اور زلیخا سشما کا اوم والا لاکٹ پہن لے اور خوب بڑی بندی اور مانگ میں سیندور بھر لے۔ اتفاق سے ان کے پاس لال پین تھا۔ اس سے سشما نے زلیخا کے لال بندی لگا دی اور اس کی مانگ بھی لال کر دی۔ بڑی مشکل سے انہیں ایک رکشہ ملا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئیں۔ آگے چل کر نعرے لگاتی ایک بھیڑ نمودار ہوئی رکشے والا رکشہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگیں۔ وہ موت سے بھاگ رہی تھیں اور موت ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ خوشحالی اور امن کے راکٹ نہیں چل رہے تھے، غریبی کے خاتمے کے بم نہیں پھٹ رہے تھے، نمرود کی خدائی زندہ ہو گئی تھی، فرعون کی فرعونیت طاقت پا گئی تھی۔ زندگی بھاگ رہی تھی پناہ کی تلاش میں، رحم کی تلاش میں۔ ان کا گھر ان کا محلّہ زیادہ دور نہیں تھا۔ جیسے ہی ان کو اپنی گلی دکھائی دی دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ کر اپنی اپنی گلی میں داخل ہو گئیں جیسے اس کی پناہ میں آ گئی ہوں، وہ گلیاں جہاں ہندو اور مسلمان میل و محبت سے صدیوں سے رہ رہے تھے جن کی رگوں میں رشتہ داری کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ دونوں نہ ہندو تھیں نہ مسلمان تھیں دو معصوم لڑکیاں تھیں اپنی معصوم دنیا میں مگن، اپنے اونچے خیالات میں کھوئی۔ جن کا دل انسانیت کے درد سے دھڑکتا تھا، مذہب کے غلط استعمال کے لیے روتا تھا، انسانوں کے سچے حقوق کے لیے تڑپتا تھا۔ کروڑوں انسانوں کے کرب اور حق کے لیے ان

کے پاس ایک آواز تھی۔ نفرت کے خلاف، سچائی کے لیے، ایمان کے لیے اٹھائی ہوئی ایک آواز بھی کافی ہوتی ہے اور اس آواز کے ساتھ بہت سی آوازیں خود بخود شامل ہو جاتی ہیں۔ ناانصافی، ظلم وزیادتی، نفرت، انتقام سب کمزور ہو جاتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں آواز کی اس عظمت کو جو تمام ہتھیاروں سے مضبوط اور طاقتور ہے۔ وہ دونوں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ تو رہی تھیں ان کو نہیں معلوم تھا کہ وہ مذہبی بربریت کا شکار ہونے جارہی ہیں، نفرت کا نشانہ بننے جارہی ہیں۔ ان کا تخیل زخمی ہو چکا ہے ان کی زندگی کے لمحے ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ ان کے بھاگنے سے ان کے گلے میں پڑے ہوئے اللہ اور اوم کے لاکٹ زور زور سے ہل رہے تھے جیسے خوف ودہشت کے ان لمحوں سے وہ بھی لرز رہے ہوں اور ان شیطانی کارناموں سے ہراساں اور پریشان ہوں۔

دوسرے دن کے اخبارات میں نکلا کہ پولیس کے چوکنا ہو جانے اور کرفیو لگنے کی وجہ سے حالات پر قابو پا لیا گیا اور فساد آگے نہیں بڑھ سکا۔ صرف ایک ہندو محلّہ ہنومان گلی میں ایک ہندو لڑکی کا قتل ہوا جو بندی سیندور لگائے تھی اور اوم والا لاکٹ پہنے تھی اور مسلم محلّہ سید پورہ میں ایک مسلم لڑکی کا قتل ہوا جو برقعہ اور اللہ والا لاکٹ پہنے تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہندو حملہ آوروں نے ایک ہندو لڑکی کو مسلم سمجھ کر مار دیا اور مسلم حملہ آوروں نے ایک مسلم لڑکی کو ہندو سمجھ کر مار دیا۔ یہ دونوں سہیلیاں زلیخا اور سشما تھیں۔ دونوں کے محلے والے بہت غصّے میں تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بہ شانہ اپنے اپنے محلے کی بیٹیوں کا غم منا رہے تھے اور مارنے والوں کے خلاف آوازیں اٹھا رہے تھے اور یہی نعرہ لگا رہے تھے۔ ''سشما اور زلیخا کا بدلہ لیا جائے گا۔''

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کس سے کون بدلہ لے گا؟ جواب کسی کے پاس نہیں ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس اکیسویں صدی میں بھی زلیخا اور سشما محفوظ نہیں ہیں اپنے ہی فرقوں کے لوگوں کے ہاتھوں وہ دونوں فرقہ وارانہ فساد پر قربان ہو گئیں۔

◆ ÷ ◆

تین گلاب

شہرین اسپتال کے بڑے سے ہال سے گزر رہی تھی۔اچانک پاس کے بستر پر پڑے مریض کواس نے چونکتے ہوئے دیکھا۔پہلے تو وہ اس کواپنا وہم سمجھی مگر جب اس مریض پرنظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ایک ڈھانچا تھا جس کی جھپکتی پلکیں ہی صرف نظر آرہی تھیں۔کون تھا وہ؟ کیا وہ اس کو جانتا ہے؟ کئی سوال اٹھے اور جواب کے بغیر ہی واپس آگئے۔وہ آگے بڑھ گئی۔وہ اپنے کسی رشتہ دار کو دیکھنے آئی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں اس کے ذہن سے وہ ڈھانچا غائب ہوگیا۔دوسرے دن پھر جب وہ ادھر سے گزری تو وہ پھر اس کو دیکھ کر چونکا۔ اس بار اس نے بھی اس کو دھیان سے دیکھا۔ایک باریک سی آواز آئی۔''سنیے۔''

وہ رک گئی۔وہ اس سے ہی مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا۔''آپ شہرین ہیں نا؟''

اپنا نام سن کر وہ حیران رہ گئی۔پھر خود بخود ایک سوال اٹھا۔''یہ مجھے کیسے جانتا ہے؟'' اس نے کہا۔''ہاں میں شہرین ہوں۔آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر جان پہچان کا کوئی نشان نہیں تھا۔

اس نے جواب دیا۔''میں عباد ہوں۔''

''عباد؟'' اس کی چیخ نکل گئی۔اتنا خوبصورت ہینڈسم آدمی اس حالت میں اس کو یقین نہیں آرہا تھا۔''یہ تم کو کیا ہوگیا؟ میں تو پہچان ہی نہیں سکی۔'' یہ کہہ کر وہ رودی۔

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا ورنہ مجھے دیکھ کر اتنی بے مروتی سے آگے نہ بڑھ جاتیں۔'' وہ بہت درد بھرے لہجے میں بولا۔

عباد اس کے کالج کے وقت کا دوست تھا۔صرف دوست ہی نہیں تھا اور کچھ بھی تھا۔ دونوں آرکیٹکچر پڑھ رہے تھے۔اس نے پوچھا۔''عباد تمھاری ایسی حالت کیسے ہوئی؟''

اس نے بتایا۔''میرا کینسر کا آخری اسٹیج ہے۔کسی وقت بھی اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔''

''تمھاری فیملی کہاں ہے؟''

''فیملی؟ ایک لمبی کہانی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ میرے ابا نے اپنے دوست کی بیٹی سے میری شادی کردی تھی۔ وہ بہت آوارہ عورت تھی۔ شادی کے بعد بھی نہیں سنبھلی اور کچھ مہینے کا بچہ چھوڑ کر اپنے پرانے عاشق کے پاس چلی گئی۔ پھر آ کر مجھے بلیک میل کرنے لگی اور بچے کو لے جانے کی دھمکی دینے لگی۔ ایک دن وہ بچے کو اٹھا کر زبردستی بھاگنے لگی۔ بس میں نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کو مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ اس کی زندہ لاش کو اس کے گھر پر پھنکوا دیا تب جا کے یہ ڈرامہ ختم ہوا۔ اس دن کے بعد سے اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ میرے گھر آتی اور بچے پر اپنا حق جماتی۔ تم بتاؤ تمہارے شوہر کیسے ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟''

''شوہر تو ٹھیک ہیں۔ ہماری اپنی آرکیٹکٹ کمپنی چل رہی ہے۔ بچہ کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ ہماری شادی کو کئی سال ہو چکے ہیں۔''

''بچہ کوئی نہیں ہے۔'' اس کو اس کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک دکھائی دی۔ اس نے کہا۔ ''شہرین تم میرے بیٹے سناب کو گود لے لو۔ میں اس کی وجہ سے مر نہیں پا رہا ہوں۔ صرف یہ سوچ کر کہ میرے بعد اس کی ماں اس کو لے جائے گی اور خراب کر دے گی، اس کا شوہر بھی میری ناپسندیدہ شخصیت ہے۔ وہ دونوں میرے بچے کو اچھی تعلیم اور تربیت سے محروم رکھیں گے۔ تم اس کو ایک اعلیٰ انسان بنا سکتی ہو۔ وہ بہت ذہین بچہ ہے۔ اس کو تم جیسی ماں کی ضرورت ہے۔ تمھاری دی ہوئی اعلیٰ تربیت اور اعلیٰ تعلیم اس کی زندگی سنوار دے گی۔ بتاؤ میرا بچہ گود لو گی؟''

''میں تمہارا بچہ گود لے لوں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میں زبیر سے پوچھوں گی۔''

اس نے بہت عاجزی سے کہا۔ ''جلدی کرنا مگر خدا کے لیے انکار مت کرنا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا بچہ لاوارث نہ رہ جائے یا غلط وارثوں کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔ اس کا سوتیلا باپ اس سے نفرت کرتا ہے۔ میں بہت مضبوط کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ بعد میں کوئی تمھیں پریشان نہ کرے یا بچہ چھیننے کی کوشش نہ کرے۔''

شہرین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ بچے کی اس کو بھی ضرورت تھی۔ پتا نہیں زبیر راضی ہوگا بھی کہ نہیں۔ وہ کچھ جواب نہیں دے سکی۔ خاموشی سے گھر واپس آ گئی۔ اس کے دل و دماغ پر عباد کا قبضہ ہو گیا۔ کتنے عرصے کے بعد عباد اس کو ملا تھا مگر کس حالت میں؟ اس کا وہ

تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔غم سے اس کا دل بھرا ہوا تھا سامنے ہی اس کے کمرے میں لگی وہ پینٹنگ نظر آ رہی تھی تین گلابوں کی خوبصورت پینٹنگ جو کسی مصور کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ تین انوکھے رنگ کے گلاب بہت ہی گہرا زرد، خوب گہرا نارنجی اور بہت گہرا اودا۔ دنیا اس کو شہزین کی آرٹ کا کمال سمجھتی تھی۔شہزین آرٹسٹ ضرور تھی مگر اس آرٹسٹ کے مقابل کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پینٹنگ کا مصور عباد تھا۔اس کا دوست۔ وہ گلاب اس کو دور بہت بہت دور لے گئے ماضی کی طرف اور وہ پہونچ گئی اس دن جب اس نے آرکیٹیکچر کالج میں داخلہ لیا تھا۔

اس کو بچپن سے ہی آرکیٹکٹ بننے کا شوق تھا۔اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ یہ چیز اس کی خاندانی تھی۔ اس کا پورا خاندان آرٹسٹ تھا۔اس کے ابو اور بڑے ابا بھی آرکیٹکٹ تھے اور ایک بڑی کمپنی چلا رہے تھے۔اس کا کزن زبیر تو بچپن سے ہی ایک پرفیکٹ آرکیٹکٹ تھا۔اس کے پاس صرف ڈگری کی کمی تھی۔سب ہی لوگ اکثر مذاق میں یہ جملہ اس کے لیے کہتے تھے۔ ہر عمارت کی ہو بہو تصویر بنا دیتا تھا۔ جب وہ خود صرف دو سال کی تھی تو تاج محل بناتی تھی اور تاج محل بنا کر کتنا خوش ہوتی تھی اور چیخ کر کہتی تھی۔''ابو ابو، دیکھیے میں نے تاج محل بنا لیا۔'' ابو اور امی دونوں ہی اس کا تاج محل دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔تاج محل کے نام پر کچھ لکیریں ہوتی تھیں جو اپنے اوپر کچھ دائرے اٹھائے ہوتی تھیں، مگر دو سال کی بچی کے لحاظ سے وہ کمال ہی دکھائی دیتا تھا۔ پھر وہ بھی زبیر کی طرح عمارتوں کی تصویریں بنانے لگی۔ جب زبیر بناتا تھا تو وہ اس کی کاپی کر دیتی تھی جب کہ وہ زبیر سے بہت چھوٹی تھی۔

اس دن وہ اپنا ڈپارٹمنٹ ڈھونڈھ رہی تھی۔ یونیورسٹی بہت بڑی تھی۔ اچانک اس نے بھاگتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھا۔''آرکیٹیکچر ڈپارٹمنٹ کہاں ہے؟ مجھے روم نمبر دس میں جانا ہے۔'' وہ لڑکا ہنس پڑا اور بولا۔''اتفاق سے میں بھی یہی ڈپارٹمنٹ اور روم نمبر ڈھونڈھ رہا ہوں۔آیئے ہم دونوں مل کر یہ کام کریں۔'' وہ بھی ہنس دی پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ اپنا ڈپارٹمنٹ ڈھونڈنے لگے۔ڈپارٹمنٹ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے دونوں کی جان پہچان بڑھ گئی۔ پھر وہ برسوں کے پرانے دوست نظر آنے لگے اور واقعی میں وہ دوست بن گئے۔ دونوں ہی بہت اچھے آرٹسٹ تھے اور اپنے فن میں ماہر بھی تھے۔ دوستی اور پختہ ہو گئی۔عباد اور شہزین کی زندگی پیار کی خوبصورت شاہراہ پر چل نکلی جہاں ہر طرف امیدوں کے دلکش پھول بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کو ایک

دوسرے کے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھے اور ملے بغیر رہ نہیں پاتے تھے، مگر زبان سے ابھی اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ صرف نظریں اور دل ہی ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے۔ ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ملاقاتیں ایسے ہی تو نہیں تھیں۔

ایک دن وہ گلاب کی ایک دکان پر کھڑے تھے۔ اچانک گلابوں کے رنگ دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ تین گلاب اس کو بہت پسند آئے تھے۔ اس رنگ کے گلاب اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، بہت گہرا زرد، بہت گہرا نارنجی اور بہت گہرا اودا۔ وہ ان کو دیکھتی رہ گئی مگر اس نے خریدا نہیں۔ دوسرے دن جب عباد اس سے ملا تو اس کے ہاتھوں میں وہ تینوں گلاب تھے جو وہ اس کے لیے لایا تھا۔ اس نے حیرت سے ان گلابوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''تم کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے یہ تینوں رنگ کے گلاب پسند آئے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''میں دوسروں کا دماغ پڑھنے میں استاد ہوں۔ تمہاری نظروں میں ان کے لیے کتنی پسند تھی جو مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکی حالانکہ وہاں پر بہت سے رنگ کے گلاب تھے۔''

''ان گلابوں کے لانے کا مقصد؟ کیا آج کوئی خاص موقع ہے۔'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

''پیار کرنے والوں کو ہر وقت ہر موقع خاص موقع ہی رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔ اس نے بھی زیادہ بحث نہیں کی۔ شاید وہ اس دن اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا تھا مگر جب دوسری طرف سے زیادہ ہمت افزائی نہیں ہوئی تو خاموشی کو ہی اس نے بہتر سمجھا۔ پھر جب بھی وہ اس سے ملتا اس کے لیے وہ تینوں گلاب لانا نہیں بھولتا تھا۔ وہ ان انوکھے رنگ کے گلابوں کو پا کر بہت خوش ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کو چھیڑنے کے لیے کہتی۔ ''تم ہمیشہ صرف تین ہی گلاب کیوں لاتے ہو؟''

وہ جلدی سے اپنے دل کا حال کہنے لگتا۔ ''مجھے تین کا نمبر بہت پسند ہے۔ میں اور تم اور ہوسکتا ہے کوئی تیسرا ابھی ہم میں شامل ہوجائے، یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنے والا زمانہ ہماری زندگی کو تین خوبصورت گلابوں سے مہکا دے۔ یہ گلاب نہیں ہیں ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔'' وہ چپ ہوجاتا تو وہ بھی چپ ہی رہتی تھی۔ تین گلاب اس کے ہاتھوں میں مہکتے رہتے۔ ان کی مہک وہ دل کے اندر محسوس کرتی تھی اپنی زندگی میں محسوس کرتی تھی۔

ایک دن جب وہ ایک پارک کے گوشے میں بیٹھے اپنے آخری پرچے کی تیاری کر رہے

تھے اچانک عباد بہت غور سے شہزین کو دیکھنے لگا اور برابر گھورتا رہا۔ ایک دم سے شہزین بول اٹھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میری تصویر بنا رہے ہو؟''

''تصویر تو بن گئی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اتنی جلدی؟ مانا کہ قابل مصور ہو مگر ہم بھی جاہل نہیں ہیں تمہارے ہی ہم پیشہ ہیں۔ تصویر بننے میں اتنا تھوڑا وقت نہیں لگتا ہے۔''

''تم اس کو تھوڑا وقت کہتی ہو۔ اس تصویر کی بنوائی نے چار سال لیے ہیں محترمہ پورے چار سال۔''

''چار سال سے تم میری تصویر بنا رہے ہو اور مجھے دکھائی تک نہیں۔'' وہ اب بھی انجان بن کر بولی۔

''میں نے وہ تصویر آنکھوں کے راستے دل میں اتار لی ہے تم کو دکھاتا کیسے۔''

''یہ کس تصویر کی بات کر رہے ہیں جناب؟''

اس تصویر کی جس کو نظر پیار کہتی ہے۔ شاعر عشق کہتا ہے۔ عاشق محبت کہتا ہے۔ مجنوں لیلیٰ کہتا ہے اور دنیا تاج محل کہتی ہے۔''

''واہ کتنے خوبصورت عنوان ہیں آپ کی تصویر کے۔'' وہ ہنستی ہوئی بولی۔

''یہ سب عنوان تمہاری نظر ہیں۔'' وہ بہت پیار سے بولا۔

''واقعی آج کچھ اچھا موڈ نظر آ رہا ہے ورنہ میں تو آپ کو خشک مزاج سمجھ رہی تھی۔ چلو اس میدان میں تو اترے۔ صبح کا بھولا شام کو آئے تو وہ بھولا نہیں کہلاتا ہے۔ یہ مرض کب لگا ہم کو پتا ہی نہیں چلا۔''

''تم کو پتا ہی نہیں چلا یا تم نے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ورنہ گلاب کی خوشبو روز روز یوں ہی تو آپ کے پاس سے نہیں گزر رہی تھی۔ کچھ پیغام دیتی تھی کسی کی دل کی پکار لے کر آتی تھی۔ آپ کی پسند کے تین گلابوں میں لپٹ کر۔ جو میرا پیار سمیٹ کر لاتے تھے میرے دل کی آواز تھے۔ میری چھوٹی سی فیملی کا خواب تھے۔ سچ بتاؤ ان کی خاموشی میں تمہیں ان کے اندر کا چھپا ہوا پیغام نہیں ملتا تھا کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

''میں اس خاموش پیغام کو الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی خاموشی میں

ایک تڑپ ایک بے چینی دکھائی دیتی تھی جو مجھے تڑپا دیتی تھی، بے چین کر دیتی تھی۔ میں اس بے چینی اس تڑپ سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ کاش ان گلابوں کے زبان ہوتی جو مجھ سے چیخ چیخ کر کہتی شہزین! میں کسی کا پیار لایا ہوں، میں خود محبت ہوں، عاشق کی پہچان ہوں، کسی کا اقرار ہوں۔''

''ارے تم تو مجھ سے بھی زیادہ جذباتی نکلیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہیں میرا پیار یک طرفہ نہ ہو۔''

''اور میں بے چین تھی کہ میرا محبوب صرف اشاروں سے کام لیتا ہے۔ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتا ہے۔ میرے دل کی صدا میں اپنے دل کی صدا کیوں نہیں شامل کرتا ہے۔ تم بہت خراب ہو عباد میری بے چین محبت کو نہ پہچان سکے۔ اب کیا ارادے ہیں؟''

''وہی ارادے ہیں جو ہر عاشق کے ہوتے ہیں۔ دل کی بیماری کا علاج کرنا سکون دل کی خاطر کسی کو اپنانا۔''

''تو یہ نیک کام آپ کب کر رہے ہیں؟''

''سوچتا ہوں آج ہی اس کی ابتدا کر دوں۔ تم نے اپنے گھر والوں سے ذکر کیا؟''

''نہیں! تم نے کھل کر کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ کیا تم نے اپنے گھر والوں کو بتایا؟''

''میں نے بھی نہیں بتایا تمہارا مشورہ ضروری تھا۔ اصل میں آج سے پہلے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی ہم لوگ ایک دوسرے سے جدا بھی ہوں گے۔ اب وہ وقت آیا تو چونکے اور گھبرا کے محبت کر بیٹھے۔ آج گھر والوں کو اطلاع دینی ہے اور ان کو تمھارے یہاں بھیجنا ہے۔ تم آج ہی اپنے گھر والوں کو بتا دینا۔ کل ہم لوگ تمھارے در پر حاضر ہوں گے۔ آج میں بہت خوش ہوں شہزین۔ میں اپنی دلہن کو پوری دنیا گھماؤں گا۔ پھر دونوں مل کر اپنے مکان کا نقشہ بنائیں گے۔ ایک ایسے مکان کا نقشہ جس کو دیکھ کر سب ہی رشک کریں گے۔ کسی کے پاس نہ تو ایسا گھر ہوگا اور نہ ایسی دلہن۔'' وہ دونوں اپنی تصور کی دنیا میں کھو گئے۔ دونوں کا پرچہ شروع ہونے کا وقت ہو گیا۔ دونوں جیسے بھول گئے کہ ان کو ابھی اپنا آخری پرچہ بھی دینا ہے۔ شہزین بار بار کہہ رہی تھی، ''تم نے تو میرا امتحان میرا آخری پرچہ ہی لے لیا۔ میرے دل کی پسند کی بات کر دی۔ اب میرا دل کچھ اور کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کل یہ بات نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیسے یہ آخری پرچہ دوں؟ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالوں یا اس خوشی کو سمیٹوں جو ابھی ابھی تم نے دی ہے۔''

''کل کا کس کو پتا ہے۔ بات آج ہی شروع ہو گئی، ابھی شروع ہو گئی، اچھی بات ہے۔

دھڑکنوں کو ناچنے دو، خوشیوں کو تھرکنے دو، یہ ان کا وقت ہے یہ ان کا زمانہ ہے۔ ان کی خوشی میرے دل کو بھی محسوس کرنے دو۔ وہ بھی تو ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ اپنی جگہ پر تھرک رہا ہے۔ سچ ہے آج ہماری دھڑکنوں کو موقع مل گیا جس کی آرزو ان کو چار سال سے تھی۔ کل جب ہم دونوں ملیں گے تو ہماری دنیا بدل چکی ہوگی۔ دنیا والوں کی زبان میں ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہوں گے۔''

اس دن جب اپنا امتحان ختم کر کے شہزین اپنے گھر گئی تو ایک بہت بڑے سرپرائز سے دوچار ہوئی۔ گھر والے جانتے تھے کہ وہ سرپرائز بہت پسند کرتی ہے۔ گھر میں بہت بڑی پارٹی کا انتظام تھا۔ اچانک اس کی اور زبیر کی منگنی کا اعلان ہو گیا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ زبیر کی پسند ہے۔ وہ تو زبیر کو اپنا کزن اپنا دوست سمجھتی تھی۔ یہ غلط فہمی آئی کہاں سے؟ اس کا آئیڈیل تو عباد تھا جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ منگنی کے بعد اس نے زبیر سے بات کرنے کی سوچی۔ پھر اکیلے میں وہ زبیر کو پا کر رو دی۔ زبیر اس کو روتا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ''منگنی سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔'' زبیر نے کہا۔ ''مجھے خوش فہمی ہو گئی تھی کہ تم شاید مجھ سے شادی کروگی۔ بچپن سے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہمارا شوق، ہمارا پیشہ، ہمارا بزنس بھی ایک ہے۔ تمھیں اعتراض کیوں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''زبیر! میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔ اس سے شادی کا وعدہ کر چکی ہوں۔ وہ میرا کلاس میٹ عباد ہے۔''

زبیر دھک سے رہ گیا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میں سمجھا شاید تم مجھے چاہتی ہو۔ مجھ سے شادی کروگی حالانکہ ہم لوگوں نے کبھی اس ٹاپک پر بات نہیں کی۔ مگر مجھے تم سے بہت پیار ہے اور میں سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھ کو اتنا ہی پیار کرتی ہوگی۔ خیر، عباد سے بات کروا گر وہ راضی ہے تو ٹھیک ہے۔ ہماری صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے وہ ٹوٹ سکتی ہے۔''

''گھر والوں کو کیسے راضی کروگے؟'' اس نے تشویش کے ساتھ کہا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ میں کرلوں گا۔'' زبیر نے وعدہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں زبیر کی شرافت کی قائل ہو گئی، اور واقعی میں زبیر بہت نیک اور شریف انسان تھا۔ اس کی چاہت بے غرض تھی۔ کاش وہ بھی زبیر سے پیار کر سکتی، اس کو اپنا سکتی۔ وہ بہت موزوں شوہر تھا جس کی خواہش کوئی بھی لڑکی کر سکتی تھی۔ دوسرے دن جب اس کو عباد ملا تو وہ بہت افسردہ تھا۔ وہ سمجھی شاید اس کو اس کی

منگنی کی خبر مل گئی ہے مگر وہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔عباد نے بتایا۔''ڈیڈی اس کو انگلینڈ بھیج رہے ہیں آر کی ٹیکچر کی اعلیٰ ڈگری لینے کے لیے۔مگر ڈیڈی کا خیال ہے کہ وہاں مجھے کوئی انگریز لڑکی نہ پھانس لے اور میں وہیں بس جاؤں۔ وطن لوٹنے کا خیال دل سے نکل جائے۔اس لیے انہوں نے اچانک زبردستی میرا نکاح اپنے دوست کی لڑکی سے کر دیا جو کہ ان کے بزنس پارٹنر بھی ہیں۔مجھے انہوں نے تمھارے بارے میں بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

شہرین چپ ہوگئی۔عباد کتنا بزدل نکلا۔وہ پچھتانے لگی۔اس نے بلا وجہ کے لیے زبیر کو عباد کے بارے میں بتایا۔اب تو بات زبان سے نکل ہی چکی تھی آگے کیا ہوگا دیکھا جائے گا۔اس نے صرف اتنا کہا۔''ہماری اور تمھاری محبت کا ایک جیسا انجام ہوا۔کل ہی ہم لوگوں نے بات چھیڑی کل ہی زندگی کا رخ بدل گیا، واقعی آنے والا وقت کیا تبدیلی لائے کوئی نہیں کہہ سکتا۔کل ہی میری منگنی میرے کزن زبیر کے ساتھ ہوگئی۔میں نے زبیر سے تمہارے بارے میں بات کر لی تھی اور وہ منگنی توڑنے کو تیار تھا۔اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔میری تو صرف منگنی ہوئی ہے تم تو اب شادی شدہ ہو۔میری مبارک باد قبول کرو۔نئے ملک نئی منزل کی طرف جاؤ۔''

عباد نے کچھ نہیں کہا۔خاموش رہا۔اس کے بعد اس نے اس کو ایک خوبصورت فریم دیا جس کے اندر زرد، نارنجی اور اودے تین گلابوں کی بہت خوبصورت پینٹنگ تھی۔تینوں رنگ کے گلاب بہت خوبصورت نظر آرہے تھے جیسے مصور نے اپنا دل نکال کر اس میں رکھ دیا ہو۔اس نے کہا۔''یہ میری قابلیت کا نادر نمونہ ہے جس میں، میں نے اپنا پورا کمال پورا فن نکال کر رکھ دیا ہے۔ ہماری محبت اس میں ضم ہوگئی ہے۔ہماری زندگی سے تین گلابوں کی کہانی ختم ہو کر اس میں درج ہوگئی ہے۔میں تمہیں یہ تحفہ اپنی شادی کی رات دینا چاہتا تھا، مگر افسوس ہے کہ آج دے رہا ہوں۔ یہ ہمارے پیار کا نشان نہ ہو کر جدائی کا نشان ہوگیا۔میرا یہ آخری تحفہ اس دعا کے ساتھ قبول کرو کہ تمھاری زندگی ہمیشہ ان گلابوں کی طرح خوبصورت اور مہکتی رہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وہ گھر واپس آگئی۔زبیر کو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کے پاس تھا ہی کیا زبیر کو بتانے کے لیے۔زبیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔اس نے اس کو کچھ نہیں بتایا صرف اتنا ہی کہا۔''عباد اچانک انگلینڈ چلا گیا۔اس سے میری بات نہیں ہوسکی۔اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میں تیار ہوں۔'' پھر دونوں کی شادی ہوگئی۔آج عرصے کے بعد عباد اس کو اس حال میں ملا تھا

اپنے ساتھ ایک دردناک کہانی لیے ہوئے۔ اس کی شادی کتنی ناموزوں تھی۔لڑکی اپنا بوائے فرینڈ رکھے تھی۔شادی کے بعد بھی اس کو نہ چھوڑ سکی۔اپنی فیملی اپنا بچہ چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔وہ عجیب شش و پنج میں گرفتار تھی۔وہ زبیر سے کس طرح بات کرے،اس کے سامنے مسئلہ تھا۔جس کہانی کو اس نے سمجھ لیا تھا کہ ختم ہوگئی اس نے تو اب ایک نیا موڑ لے لیا تھا۔اس نئے موڑ میں زبیر اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا، بلکہ اس کو بھی اس کے ساتھ کھڑا ہونا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں خاموش خاموش بیٹھی رہی اور عباد کے فن کے کمال کو دیکھتی رہی۔وہ گلاب جو اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی کھلے کھلے تروتازہ نظر آرہے تھے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو،تھم گیا ہو۔اس تصویر کو اتنا اعلیٰ مقام اس لیے ملا ہوا تھا کہ دنیا کی نظروں اور زبیر کی نظروں میں وہ خود اس کی بنائی ہوئی پینٹنگ تھی،ورنہ آج وہ کسی کوڑے دان میں پڑی اپنا وقار،اپنی وقعت،اپنا حسن کھو چکی ہوتی ایک معمولی شئے بن کر۔مگر اس وقت اس کے اپنے دل کے گلاب پژمردہ تھے۔اس میں صرف فکر و پریشانی کی لاتعداد کلیاں چٹک رہی تھیں۔زبیر گھر آ گیا تو وہ چونک گئی اور کچن میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔کھانے کی میز پر وہ خاموش بہت افسردہ تھی۔یہ افسردگی یہ خاموشی زبیر سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔وہ پوچھ بیٹھا۔''کیا بات ہے شہرین بہت خاموش اور افسردہ دکھائی دے رہی ہو۔''

''ایک بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہوں،سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہاں سے شروع کروں۔''

''کیسی الجھن؟'' زبیر نے اس کی ہمت افزائی کی اور اس نے عباد کی کہانی اس کو سنا دی۔وہ چپ ہو گیا۔تھوڑی دیر کے بعد بولا۔''اگر وہ اپنا بچہ ہم لوگوں کو دینے کو تیار ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ہم اس کو اپنا لیں گے۔''

اس کی الجھن زبیر نے ایک لمحے میں سلجھا دی۔وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔بچے کی اس کو بہت ضرورت تھی۔دوسرے دن وکیل کو لے جا کر ضروری کاغذات پر دستخط ہو گئے۔اب وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔اسی دن جب وہ پھر اسپتال گئی تو وہ چار سال کا بچہ عباد کے پاس موجود تھا۔اس نے کہا۔''سناب یہ تمہاری ماں ہیں۔'' اس بچے نے بہت حیرت سے کہا۔''ماں؟''

شہرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اس سے چمٹ گیا۔وہ رو بھی نہ سکی اگر ماں مر گئی ہوتی تو اس وقت وہ روتے روتے جان دے دیتی،مگر زندہ ماں کے لیے رونا آنسوؤں کی

توہین تھی۔ بے چارا بچہ جانتا ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس ماں ہے۔عباد کہہ رہا تھا۔’’ بیٹے اب تم ان کے ساتھ رہو گے۔ یہ تمھاری ماں تمہیں بہت پیار کریں گی۔تم مجھے بھول جاؤ گے جب میں چلا جاؤں گا۔‘‘

’’آپ کہاں جائیں گے پاپا؟‘‘اس نے پوچھا۔

میں بہت دور چلا جاؤں گا۔تم کو نظر نہیں آؤں گا۔ وہ آسمان دیکھ رہے ہو نا اس سے بھی آگے۔‘‘

’’میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔‘‘ وہ روتے ہوئے بولا۔

’’نہیں بیٹا وہاں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔تمہارے پاس ماں ہوں گی ابا ہوں گے۔ میں تم کو دیکھا کروں گا۔‘‘

’’میں آپ کو کیسے دیکھوں گا؟‘‘

’’تم مجھے دیکھ نہیں پاؤ گے۔تم مجھے صرف اپنے دل میں محسوس کرو گے۔ میں تمہارے دل میں رہوں گا۔اگر تم غلط کام کرو گے تو تمہارے دل سے آواز آئے گی ۔’نہیں‘ یہ میری پکار ہوگی۔تم فوراً رک جاؤ گے۔تم جب اچھے کام کرو گے تو میں تمھاری زندگی میں خوشی بن کر دکھائی دوں گا۔تمہارا دل بہت خوش بہت مطمئن ہوگا۔اس اطمینان اس خوشی میں، میں بھی شامل رہوں گا تمہارے دل کی دھڑکن بن کر۔تم ابھی بہت چھوٹے ہو میری باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی مگر میں تم سے یہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’پاپا! آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ میں آپ کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پہلے والے پاپا جیسا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شہرین باپ بیٹے کی گفتگو سنتی رہی۔اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔زبیر اس کو سنبھالے رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کو سناب کو اپنی گود میں لے لیا۔زبیر پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔

وہ شہرین کے کاندھے پر سر رکھ کر سسکتا رہا۔اتنا چھوٹا معصوم بچہ پتا نہیں کچھ سمجھ پا رہا تھا کہ نہیں۔اس کی زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی آگئی تھی۔وہ اب کسی اور کا ہو گیا تھا۔وہ لوگ ابھی سے اس کی دل جوئی میں لگے ہوئے تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اس کے غم کو سمیٹ لیں؟

کیسے اس کے درد کو اپنے دل میں بھر لیں؟ کیسے اس کے آنسوؤں میں اپنا پیار گھول دیں؟ اس کے آنسوؤں کو اپنے پیار بھرے دامن میں سمیٹ لیں۔ اس کی زندگی میں اتنا پیار بھر دیں کہ وہ انہیں کا ہو کر رہ جائے۔

عباد نے ان تینوں پر ایک نظر ڈالی۔ سناب شہرین کی گود میں تھا۔ زبیر اس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔ اس کو لگا جیسے آج وہ تینوں گلاب یکجا ہو گئے ہیں عین اس کی خواہش کی مطابق۔ تین کا ہندسہ اس کا اور بھی پسندیدہ ہو گیا جیسے تینوں گلابوں میں جان پڑ گئی ہو۔ ہر طرف زرد، نارنجی اور اودے گلاب کھلنے لگے۔

اور شہرین سوچ رہی تھی کہ آج کی اس آخری ملاقات نے واقعی میں ان تینوں گلابوں میں جان ڈال دی ہے۔ اس پینٹنگ سے نکل کر وہ گلاب زندگی سے بھرپور ہو گئے۔ ایک سونے آنگن کی مہک بن گئے۔ وہ، زبیر اور سناب گلاب ہی تو تھے زندگی سے بھرپور، مگر تین مختلف رنگ لیے، زندگی کے تین مختلف رنگ۔ عباد اس دنیا سے رخصت ہو گیا شاید اپنے اندر اطمینان اور چین لے کر۔ سناب اس کے پاس آ گیا اس کا اپنا بن کر۔ اس نے آ کر شہرین کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ جینے کا نیا حوصلہ دے دیا۔ جب وہ اس کو ماں پکارتا تو اس کا دل خوشی سے بھر جاتا۔ بہت ذہین بچہ تھا۔ ایک دن اچانک چیخ اٹھا۔ ''ماں دیکھیے میں نے تاج محل بنایا۔''

تاج محل سن کر زبیر ہنس پڑا اور بولا۔ ''بیٹے! تم پورے اپنی ماں پر گئے ہو۔ وہ بھی تاج محل ہی بنایا کرتی تھیں۔''

سناب کو شہرین کے کمرے میں لگی وہ پینٹنگ بہت پسند تھی۔ وہ اکثر اس کو دیکھا کرتا تھا اور اس سے پوچھتا تھا۔ ''ماں آپ نے یہ گلاب ان رنگوں کے کیوں بنائے ہیں۔ میں نے کبھی بھی ان رنگوں کے گلاب نہیں دیکھے ہیں۔ یہ خیالی ہیں یا سچ مچ اس رنگ کے گلاب ہوتے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''اس رنگ کے گلاب کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یونیک ہوتے ہیں۔''

''مگر یہ صرف تین ہی کیوں ہیں؟'' وہ سوال کرتا۔

''یہ تین اس لیے ہیں کہ ہم تین ہیں تم، میں اور ابا۔ اس لیے یہ گلاب بھی تین ہیں۔''

ایک دن جب اچانک وہ گھر میں داخل ہوا تو چیخ رہا تھا۔ ''ماں میں آپ کے لیے یہ تین گلاب لایا ہوں۔'' وہ گھبرا کر کمرے سے باہر آئی تو حیران رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں وہ تین

رنگ کے گلاب تھے۔ گہرا زرد، گہرا نارنجی اور گہرا اودا۔ یہ تین گلاب تو عباد اس کے لیے لایا کرتا تھا۔اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔''ارے یہ گلاب کہاں سے لے آئے؟''

''میں گلابوں کی نمائش میں گیا تھا۔ وہاں یہ تین رنگ کے گلاب دیکھے۔ میں آپ کے لیے لے آیا۔ آپ کو یہ بہت پسند ہیں نا۔''

''مگر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ مجھ کو پسند ہیں۔''

''آپ کی پینٹنگ دیکھ کر جو آپ نے اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔''

شہزین کے منہ سے اچانک نکلا۔''اتنے خوبصورت گلاب مگر صرف تین ہی کیوں؟''

''کیونکہ ہم تین ہیں۔ آپ، ابا اور میں۔ یہ گلاب نہیں ہماری چھوٹی سی فیملی ہیں جو مہک رہی ہے اور جس کی خوشبو میرے اندر ہے۔''

''تو میرا بیٹا ہے کہ میرا عاشق۔ ہمیشہ عاشقوں والے ڈائیلاگ بولتا ہے اور مجھے بھی عاشقوں کی طرح چاہتا ہے۔'' زبیر اچانک بول پڑا۔''بیٹا بھی تو کس کا ہے۔ عاشق نہ سہی عاشق کا بیٹا تو ہے۔''

شہزین چپ ہوگئی۔ ایک دم سے اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس کو زبیر سے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی ایسی بات بھی کہے گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زبیر نے جو اس کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھی تو اس کو اپنی بات کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔''آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں آپ کا عاشق ہوں اور میرا بیٹا عاشق کا ہی تو بیٹا ہوا۔''

سناب زور سے ہنس پڑا اور بولا۔''میں سمجھ گیا آپ دونوں کی لومیرج ہے۔'' اس کی بات پر شہزین بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ سناب کو پا کر شہزین اور زبیر کی زندگی بہت خوبصورت ہوگئی۔ ان دونوں کے پیار اور دیکھ بھال میں سناب پرورش پانے لگا۔ ان دونوں نے سناب کو اتنا پیار دیا کہ وہ اس پیار میں ڈوب کر اپنی پرانی زندگی بھلا بیٹھا۔ وہ بھی ان کو بہت پیار کرتا تھا۔ ان دونوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی ایسی حرکتیں کرتا تھا کہ وہ دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کی ایسی دیکھ بھال کرتا تھا جیسے خود بہت بڑا ہوگیا ہو اور اپنے والدین کی نگرانی اس کے سپرد ہے۔ جب وہ کہتا۔''ماں میں ہمیشہ آپ کے لیے دنیا کی عجوبہ چیزیں لایا کروں گا بس ذرا بڑا ہو جاؤں تو پورا ہندوستان گھماؤں گا۔ پوری دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اتنا پیار کروں گا جو کسی نے بھی اپنی ماں کے

ساتھ نہیں کیا ہوگا۔اس کو حیرت ہوتی تھی ۔ یہ سب باتیں تو عباد اس سے کرتا تھا۔آج اس کا بیٹا اس سے کر رہا تھا۔وہ کیسے اپنے بیٹے کے اندر کہیں چھپ گیا تھا۔اس کی اس بات پر اس کو بہت پیار آتا تھا۔ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی جب اس کے مکان کا نقشہ بنانے لگا۔وہی نقشہ جو اکثر عباد بناتا تھا۔ویسے ہی کمرے سجاتا تھا۔ویسا ہی لان بناتا تھا ساتھ میں کہتا جاتا تھا۔''میں اپنی ماں کے لیے ایسا گھر بناؤں گا جو دیکھے گا دنگ رہ جائے گا۔'' یہ سن کر شہزین کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کو عباد کا خوفناک انجام یاد آ جاتا۔اس کا بیمار ڈھانچہ یاد آ جاتا۔وہ دہل جاتی اور کہتی۔''بیٹے تم مجھ سے اتنا پیار مت کرو۔تم جو دل چاہے کرو مگر اپنی خواہشات کا ایسا اظہار مت کرو کہ میں رونے لگوں۔'' وہ جھٹ سے اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیتا اور کہتا۔''آپ بھی تو مجھ سے ضرورت سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔''

وہ کہتی۔''تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔میں تم سے پیار نہیں کروں گی تو کس سے کروں گی۔''

وقت گزرتا گیا۔اس کی زندگی سنوارتا، خوشی کے پھول کھلاتا، چاند تاروں کا نور بھرتا سناب بڑا ہو گیا۔شہزین نے اسے بھی اپنے زبیر اور عباد کی طرح آرکیٹیکٹ بنا دیا۔ان کی کمپنی بہت بڑی ہو گئی۔ان لوگوں کے پاس اپنے بہت سے گھر، ہائی رائز بلڈنگز اور اپارٹمنٹس ہو گئے جو کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔سناب کی زندگی میں اپنے بچپن کی دوست سونا بھی شامل ہو چکی تھی جو شہزین کو بھی بہت پیاری تھی۔سناب اور سونا کی جوڑی شہزین اور زبیر کو بھی بہت پسند تھی۔ان دونوں کا پیار عباد اور شہزین کے پیار کی طرح پوشیدہ نہیں تھا۔ دونوں کے گھر والے جانتے تھے شہزین اور زبیر کے سامنے اکثر سناب اور سونا کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی۔دونوں کو بھی خوب مزہ آتا۔وہ ہمیشہ ایک ہی خواہش کا اظہار کرتا اور کہتا۔''دیکھو سونا! میں اپنی ماں کے لیے ایک گھر بنانا چاہتا ہوں جو پہلے کسی نے نہ بنوایا ہو۔''

وہ ہنس کر کہتی۔''سونے کی زمین پر چاندی کا بنگلہ۔''

''نہیں اس سے بھی کوئی اونچی چیز۔''

''آنٹی سے خود کیوں نہیں اس گھر کا نقشہ بنوا لیتے ہو۔'' وہ ہنس کر کہتی۔

''نقشہ تو میرا ہوگا اس میں میری ماں کا تخیل شامل رہے گا۔میں جانتا ہوں میری ماں کو کیسا گھر چاہیے۔''

''ایک ایسا گھر جس میں تم دونوں فٹ ہو جاؤ۔'' شہزرین بھی ہنس کر جواب دیتی تھی۔

''واہ واہ، کیا بات کہی ہے۔ ہم تو آپ کے قدموں میں پڑے رہیں گے۔ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے اور جنت کی خواہش میں ہی تو ہم جیتے اور مرتے ہیں۔ میں اپنی جنت کا استعمال کروں گا ان قدموں سے چپکا رہوں گا۔''

''اب مرنے کی بات مت کرو۔'' اس کا دل دہل جاتا۔

زبیر ہنس کر کہتا۔ ''آپ کے محلوں دو محلوں میں میری بھی کوئی جگہ ہے یا نہیں۔ کیا مجھے اپنا مکان خود بنوانا پڑے گا۔ سب سے الگ۔''

''ابا آپ اور اماں الگ تھوڑی ہیں میں تو دونوں کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔''

''مگر گھر ہمیشہ ماں ہی کا بناتے ہو، مجھے الگ کر دیتے ہو۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

''ماں باپ الگ چیز تھوڑی ہوتے ہیں۔ میں آپ کو الگ کیوں کروں گا۔''

''انکل! آپ کی طرح میں بھی الگ کر دی جاتی ہوں۔'' سونا بیچ میں آجاتی۔

''چلو ہم دونوں الگ اپنا جہان بنائیں جس میں ان دونوں کا بھی خیر مقدم ہے۔'' زبیر کہتا۔ سب کو ہنسی آجاتی۔

دولت اور خوشیوں سے بھری یہ فیملی وقت کے ساتھ چل رہی تھی۔ مگر زندگی ایک جیسی تو نہیں چلتی۔ گھر کے کسی نہ کسی در سے غم گھس ہی آتے ہیں۔ اور زندگی کے معمول میں فرق ڈال ہی دیتے ہیں۔ ان میں تبدیلی ڈال دیتے ہیں۔ اس چھوٹی سی فیملی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ زندگی چلتے چلتے تھک گئی۔ ایک معمولی آپریشن نے زبیر کو اس دنیا سے رخصت کر دیا۔ ہر طرف درد کے سائے نظر آنے لگے۔ شہزرین جیسے ٹوٹ گئی مگر سناب کے پیار اور اس کی دیکھ بھال نے پھر اس کو زندگی کی طرف واپس بھیج دیا۔ سناب کو ابھی اس کی ضرورت تھی۔ ابھی زندگی میں وہ سیٹ نہیں ہوا تھا۔

وہ پھر سے نارمل زندگی میں واپس آگئی۔ اپنے بزنس کی دیکھ بھال میں اس نے اپنے کو مشغول کر لیا۔ یہ مشغولیت اس کو اتنے بڑے غم سے دور لے گئی ورنہ ہر طرف زبیر کی یادوں کی پرچھائیاں اس کو چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ زبیر کا ہنستا ہوا چہرہ اور مذاق کرنے کا دلکش انداز سب ہی کچھ اس کے دل پر نقش تھا۔

سناب بھی بہت غمزدہ تھا مگر سناب اور سونا دونوں مل کر اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے۔ کئی سال گزر گئے۔ اب شہزین کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا وہ سناب اور سونا کو زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سناب کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ سناب اس کو اتنا چاہتا تھا کہ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس کو کچھ ہو جائے تو وہ زندگی میں اکیلا رہ جائے گا۔ اس لیے اس کی شادی بہت ضروری تھی تا کہ وہ زندگی میں اکیلے پن کا شکار نہ ہو، کوئی اس کو تسلی اور دلاسا دینے والا ہو۔ زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو اور آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنے بیوی بچے ہوتے ہیں۔ اس کو بہت اچھا لگا جب سونا نے کہا۔ ''میں آپ کو اتنا چاہتی ہوں آنٹی دل چاہتا ہے کہ پوری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں۔''

شہزین نے جواب دیا۔ ''ایسا ناممکن تو نہیں ہے۔''

''وہ کیسے؟'' سناب نے شرارت سے پوچھا۔

''اپنے پاگل بیٹے کی دلہن بنا کر۔''

''پھر ماں دیر کس بات کی ہے جلدی کیجیے نہ۔''

شہزین نے سوچا، واقعی اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ایک بار دیر ہو گئی تھی تو اندھیر ہو گئی تھی۔ زندگی کی راہیں بدل گئی تھیں۔ ابھی وہ سناب اور سونا کی شادی طئے کرنے کی سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک اجنبی عورت اس کے گھر آئی جس نے زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل دیا۔ وہ سناب کی اصلی ماں صدف تھی جس کو شہزین بالکل بھول چکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ایسا دن بھی آئے گا جب صدف سناب کی حق دار بن کر کھڑی ہو جائے گی۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔ اس کی خوشیوں کو ہمیشہ صدف چھین لے جاتی تھی۔ ایک بار جب وہ عباد کی ہونے جا رہی تھی یہی صدف عباد کو اس سے بہت دور لے گئی تھی پھر خود بھی نہیں ٹکی تھی۔ مگر ان لوگوں کی زندگی کو بدل گئی تھی۔ آج پھر اس کی خوشیوں میں وہ کود پڑی تھی۔ اس کی ساری خوشیاں، ساری تمنائیں وہ بٹور کر لے جانے لگی۔ وہ سناب کو اپنی زندگی کی ایک جھوٹی کہانی سنا رہی تھی اور سناب سن رہا تھا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اجنبی عورت اس کی ماں ہے اور ماں اس کی کوئی نہیں ہے۔ ایک غیر ہے۔ وہ شہزین سے خفا ہو گیا کہ اس کی زندگی کی اتنی بڑی حقیقت اس نے اس سے چھپائی کیسے اور وہ عورت کہہ رہی تھی۔ ''بیٹے میں تم کو لینے آئی ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرے اوپر چھ بچوں کی ذمہ داری

ہے۔ان کو پالنا، ان کو کچھ بنانا ہے ان کے سر پر کسی بڑے کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ خراب ہوئے جارہے ہیں۔تم ان کے بڑے بھائی ہو چل کر ان کو سنبھالو۔'' وہ بہت دردناک لہجے میں ایک اور کہانی بھی سنا رہی تھی، کیسے اس کے باپ نے ڈنڈے مار کر اس کو گھر سے نکالا تھا اور اس عورت کے پیچھے اس کا گھر برباد ہو گیا تھا۔میری اولاد چھین کر اس عورت کو دے دی جو خود بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں تھی۔شہزین حیران رہ گئی۔کتنی غلط باتیں وہ بتا رہی تھی۔اس کا عباد سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔وہ تو اسپتال میں اکیلا دم توڑتے ہوئے اس سے ملا تھا اور اپنا بچہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔اس عورت اور اس کے شوہر سے بچانے کے لیے۔مگر وہ مجبور تھی وہ حقیقت نہیں بیان کرنا چاہتی تھی۔وہ سناب کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔وہ عورت آخر اس کی سگی ماں تھی۔وہ ماں کی عظمت کو داغ نہیں لگانا چاہتی تھی۔اس لیے وہ خاموشی سے اس عورت کے جھوٹے الزامات برداشت کرتی رہی، کیونکہ اس کو سناب کا بھروسہ تھا کہ وہ خود کہہ دے گا، میری ماں تو یہ ہیں تم میری کوئی نہیں ہو۔مگر سناب نے کہا۔'' آپ نے مجھ کو پالا پوسا، اچھی تعلیم اور تربیت دی مگر حقیقت چھپائی۔میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت۔اگر آپ حقیقت بتا دیتیں تو میرے پاس آپ کی عزت اور بڑھ جاتی اور میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ان کو اور ان کے بچوں کو میری ضرورت ہے میں جا رہا ہوں مگر ایک دن واپس آؤں گا جب ان کا ضمیر جاگے گا اور یہ خود مجھے آپ کے پاس بھیجیں گی جیسے آج لیے جا رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس عورت کے ساتھ چلا گیا اس کے وجود کو زخمی کر کے۔وہ تنہا رہ گئی۔زبیر بھی اس دنیا میں نہیں تھے جو اس کے آنسو پونچھتے۔وہ غم سے نڈھال ہو گئی۔کسی نے سچ کہا ہے کہ پرایا بچہ کبھی نہ رکھے پرایا پرایا ہی رہتا ہے اپنا اپنا۔کیا اپنا بھی اس کو اکیلا، بے یار و مددگار، بے سہارا چھوڑ کر چلا جاتا، جانے سے پہلے کچھ سوچتا جیسے اس نے اپنی اجنبی سگی ماں کے لیے سوچا۔اس کی فیملی کی فکر کی اور اس کے ساتھ خوشی خوشی چلا گیا۔اس کو روتا بلکتا چھوڑ کر۔پھر واپس آئے گا کس کے لیے؟ اور کیوں؟ اتنی بے عزتی کرنے کے بعد بھی واپسی کا دعویٰ ہے اگر وہ اس عورت کو دھتکار دیتا تو شاید وہ خود اس کو اس کے پاس بھیج دیتی، مگر اس نے اس کو اس قابل کہاں سمجھا۔وہ تو اس کی بے عزتی کر کے گیا۔اس سے صلح مشورہ کر کے نہیں۔اس سے اجازت لے کر نہیں۔وہ اس آوارہ عورت کی عزت و وقار بڑھا گیا جو ایک دن دو چار مہینے کے بچے کو اکیلا روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے پرانے عاشق کے ساتھ چلی گئی تھی، مگر یہ بات اس کو کون بتاتا؟

صرف وہ ہی بتا سکتی تھی جس پر اس نے جھوٹا الزام لگایا۔

عباد نے اس کو ڈنڈوں کی مار شہزین کی وجہ سے نہیں سناب کی وجہ سے دی تھی۔شہزین کو تو شاید یہ بات پتا بھی نہ چلتی اگر خود بستر مرگ پر پڑے ہوئے عباد نے نہ بتایا ہوتا۔مگر وہ اتنے اونچے کردار کی عورت تھی کہ اس نے واقعی میں اس کی زندگی کی حقیقت چھپائی اور اس کو سچائی نہیں بتائی جس کی وجہ سے وہ عورت سناب کی نظروں میں اونچی بہت اونچی ہوگئی اور وہ نظروں سے گر گئی۔سناب اس کا بیٹا تھا۔وہ حقیقت بتا کر ماں کے عظیم کردار کو داغ نہیں لگانا چاہتی تھی اور نہ ماں کے وقار کو گرانا چاہتی تھی۔آخر وہ بھی تو ماں تھی پرائے بچے کی سہی جس کو پالنے میں اس نے حقیقی ماں کی جیسی محنت کی تھی۔دن کو دن سمجھا تھا اور نہ رات کو رات سمجھا تھا۔اس میں اس کی بھی تو غرض تھی سناب نے آ کر اس کی سونی گود کو بھر دیا تھا اس کی بے نور زندگی میں ممتا کا نور بکھیر دیا تھا اور ماں کی خوشی سے نواز دیا تھا ورنہ اس کی اور زبیر کی زندگی کا مقصد ہی کیا رہ جاتا۔زبیر کے جانے کے بعد وہ اس کی تنہائیوں کا رفیق تھا۔وہ عورت جو اس کے لیے اجنبی تھی مگر اس کی باتوں میں کتنی نفرت تھی اس کے لیے۔شہزین کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی سے نفرت کی ہو، برائی کی ہو وہ تو مجسم خلوص تھی، مجسم محبت تھی، وہ عورت اس وقت تک خاموش تھی جب تک اس کے بیٹے کو اچھی دیکھ بھال، اچھی پرورش اور اچھی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔اس پر کیسے کیسے الزام لگائے مگر جب اپنے ضمیر کو ٹٹولے گی تو محسوس کرے گی کہ وہ بے بنیاد الزام اپنے آپ میں کتنے خالی تھے۔ ایسی عورت کا بیٹا ہر کوئی نہیں پال سکتا تھا، یہ تو اس کی ہمت تھی جو اس نے اس کو اپنے پیار اور محبت کے سائے میں رکھا۔اس عورت کو احسان ماننا چاہیے تھا، مگر اس نے احسان فراموشی کی نہ مٹنے والی مثال چھوڑ دی۔قانوناً وہ اس پر اپنا حق نہیں جتا سکتی تھی تو اس کے بالغ ہونے اور کچھ بننے کا انتظار کرتی رہی اور اس کو اس کی نظروں سے گرا کر خود اونچی ہوگئی۔اگر محبت سے مانگتی تو شاید وہ انکار نہ کرتی بلکہ اس کی مدد کرنے میں وہ بھی اس کا ساتھ دیتی مگر حقارت اور نفرت لے کر اپنے بیٹے کی دعویدار بن گئی۔نفرت دنیا کی سب سے بری چیز ہے۔وہی جڑ ہے ہر چیز کی۔حسد، جلن، حقارت، امیری غریبی کا فرق، لڑائی جھگڑے، مقابلے ایک دوسرے کو نیچا دکھانا، مذہبی تعصب وغیرہ سب اسی سے نکلتے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ مقابلہ ہی کرنا ہے تو نیکیوں کا کریں، عبادت کا کریں، محبت کا کریں۔لڑنا ہو تو حسد و جلن سے لڑیں، بغض سے لڑیں حقارت سے لڑیں۔امیری اپنی مدد سے

غریبی کو فتح کرے، نفرت بانٹنے سے کیا حاصل ۔ اگر بانٹنا ہے تو محبت بانٹیں، خلوص بانٹیں، پیار بانٹیں، نیکیاں بانٹیں اور دوسروں میں یہ چیزیں بانٹنے کا کا احساس اور جذبہ پیدا کریں ۔ مگر ایسا کہاں ہوسکتا ہے الزام کے لیے انسان کے ساتھ شیطان بھی پیدا ہوگیا اس کا کیا نقصان ہوتا اگر فرشتہ بنا بیٹھا رہتا ۔ اپنی تنہائیوں میں اب شہزین کے ساتھی یہی خیالات تھے ۔ وہ سناب اور اس کی بے مروتی کو بھول نہیں پاتی تھی ۔ ہر وقت بس اس کے خیالوں کی دنیا میں سناب ہی رہتا تھا جو اپنی اجنبی ماں کے ساتھ چل دیا تھا ۔ اپنی ماں کی طرح اس پر الزام لگاتا ۔ اپنا پیار اپنی محبت جانے کہاں اس نے رخصت کردی تھی ۔ وہ تو اس کے لیے جیتا اور مرتا تھا ۔ وہ آج اس کے بغیر جی تو رہی تھی مگر مُردوں سے بھی بدتر تھی ۔

سناب کو گئے کافی عرصہ ہو چکا تھا ۔ وہ بہت اداس تھی اچانک اس کی نظر عباد کی بنائی پینٹنگ پر پڑی جس میں تین گلاب ایک ساتھ رہتے تھے مگر اب اس کی زندگی میں صرف ایک ہی گلاب رہ گیا تھا وہ خود ۔ اس کو لگا جیسے گلابوں کے انوکھے رنگ اڑ گئے اور وہاں رہ گئے صرف سفید گلاب ۔ کسی جنازے پر کام آنے والے سفید گلاب، کسی لاش پر چڑھائے جانے والے سفید گلاب، کسی تربت پر رکھے جانے والے سفید گلاب، غم و موت کا نشان یہی سفید گلاب ہی تو ہیں ۔ شاید وہ سفید گلاب وہ خود تھی اپنی ہی لاش پر رکھا ہوا سفید گلاب ۔ نارنجی، اودا اور زرد رنگ پتا نہیں کہاں کھو گئے تھے ۔ وہ شاید اڑتے ہوئے صدف کے کوچے میں جا بسے تھے ۔ وہ تنہا تنہا اداس کھڑی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی ۔ وہ پینٹنگ اب اس کو مردہ دکھائی دیتی تھی ۔ اپنے مصور عباد کی طرح ۔ پھر وہ جا کر اپنے بستر پر گر گئی اور اس کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی ۔ اس نے خواب میں دیکھا کوئی تین گلاب لیے چلا آ رہا ہے ۔ وہ پہچان نہیں پائی ۔ اس کی شکل صاف نہیں تھی ۔ پہلے وہ زبیر سمجھی ۔ اس کو حیرت ہوئی کہ زبیر کو گلابوں کا شوق کب سے پیدا ہوگیا اور اس کے ہاتھوں میں یہ تین گلاب کیسے ہیں ۔ وہی تین گلاب گہرا زرد، گہرا نارنجی اور گہرا اودا ۔ جب وہ قریب آیا تو وہ زبیر نہیں عباد تھا ۔ وہ گلاب لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ ہر طرف گلابوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ اتنی مہک اتنی خوشبو صرف تین گلابوں سے ہی آ رہی تھی ۔ پورا ماحول خوشبو سے معطر تھا ۔ وہ بھی ان انوکھے رنگوں کے گلابوں سے جو کہ حقیقت میں خوشبو سے خالی تھے، الگ تھے، جو صرف اپنے رنگوں کی دلکشی رکھتے تھے ۔ ان کو بنانے والا شاید ان میں خوشبو رکھنا بھول گیا تھا ۔ مگر عباد کے

ہاتھوں کے گلاب فضا میں سیکڑوں گلابوں کی خوشبو بکھیر رہے تھے۔اس نے اس کی طرف وہ تینوں گلاب بڑھا دیے، مگر وہ پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔''عباد تم ہمیشہ میری زندگی کے ساتھ مذاق کرتے رہے ہو۔اب یہ گلابوں کی نوٹنکی بند کرو۔ مجھے ان سے نفرت ہوگئی ہے۔اپنی پینٹنگ واپس لے جاؤ۔ یہ گلاب تو سفید ہوگئے ہیں شاید میری لاش پر چڑھنے کے لیے۔مگر اب ان میں رنگ کیسے آ گئے۔'' عباد نے کہا۔''جاتے ہوئے رنگوں کو میں نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور لا کر ان گلابوں پر چھڑک دیا۔ دیکھو ان کو مضبوطی سے پکڑنا ان کے رنگ نہ اڑ جائیں۔'' لیکن پھر بھی اس نے گلاب لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔اس نے لاکر وہ گلاب اس کے قدموں میں رکھ دیا۔وہ پیچھے ہٹنے لگی۔گلاب کی خوشبو اس کا پیچھا کرنے لگی۔ویسے ہی کال بیل کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔سامنے سناب کھڑا تھا۔اس کے ہاتھوں میں انہیں تین رنگوں کے گلاب تھے۔اس نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر وہ زبردستی اندر آ گیا اور بولا۔''میں آ گیا ہوں ماں۔میں اکیلا نہیں آیا ہوں آپ کی بہو کو بھی لایا ہوں۔اب ہم لوگوں کی جلدی سے شادی کر دیجیے۔''

''کیوں یہ کام تمہاری سگی ماں نہیں کر پائی۔''

''ان کو موقع ہی کس نے دیا۔ماں آپ سمجھتی تھیں کہ جب آپ مجھے لائی تھیں تو مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ مجھے سب یاد تھا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ وہ زبردستی پاپا کی عدم موجودگی میں مجھے اپنے گھر لے جاتی تھیں۔وہاں ان کے شوہر مجھ سے کتنی بیدردی اور حقارت سے پیش آتے تھے۔ مجھے بہت مارتے تھے۔مگر میں نے کبھی بھی پاپا کو نہیں بتایا۔ان لوگوں نے ڈرا دھمکا کر پاپا کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔شاید اسی لیے میں پاپا کو بتاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ایک دن پاپا نے مجھے ان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا۔میرے سامنے ہی انہوں نے ان کو ڈنڈوں سے پیٹا تھا۔پھر وہ کبھی بھی مجھ کو لینے کے لیے نہیں آئیں۔اس طرح مجھے ان کے ظالم شوہر سے نجات مل گئی۔ ماں اگر آپ میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں تو میرا کیا حشر ہوتا۔میں پاپا کا بہت احسان مند ہوں جنھوں نے میری پرورش کے لیے آپ کو اور ابا کو چنا۔ مجھے کتنے اچھے والدین مل گئے جن پر مجھے فخر ہے۔میں نے آپ لوگوں پر کبھی بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں جانتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کا بیٹا نہیں ہوں گود لیا ہوا بیٹا ہوں۔میں آپ لوگوں کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔میں آپ ہی لوگوں کا بیٹا بنا رہنا چاہتا تھا۔اتنا پیار، اتنی دیکھ بھال، اتنا عیش و آرام۔اتنی اچھی تعلیم اور تربیت جو آپ لوگوں نے مجھے دی

کیا وہ میری سگی ماں مجھے دے سکتی تھی۔ وہ کیسی تعلیم وتربیت دیتیں یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ مگر اس ماں کی بھی مجبوری تھی۔ ان کے ظالم شوہر نے انہیں چین سے نہیں رہنے دیا۔ اپنی ایک غلطی کی انہیں سزا مل چکی تھی۔ وہ میری عظیم ماں کی بےعزتی میرے سامنے کررہی تھیں۔ غلط الزام لگارہیں تھیں جب کہ ہر بات میں جانتا تھا۔ آپ نے کوئی بھی بات کبھی بھی مجھے نہیں بتائی۔ ان کی تہمت پر بھی آپ خاموش رہیں۔ کوئی تردید نہیں کی۔ میں آپ کی بڑائی آپ کی عظمت کا قائل ہوگیا، مگر میں سمجھ گیا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں جائیں گی۔ وہ اوران کے بگڑے بچے روز آکر آپ کو تنگ کریں گے، لڑائی جھگڑا کریں گے۔ برا بھلا کہیں گے۔ میں کیا کروں گا؟ صرف خاموش تماشائی بنارہوں گا۔ میں حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ان کی جھوٹی باتوں کو بہانا بنا کر ان کے ساتھ چلا گیا۔ آپ کا پیار، آپ کی اعلیٰ تربیت لے کر۔ میں آپ کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ میرا تو وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے کیوں کہ آپ کی اعلیٰ تربیت آپ کا پیار میرے ساتھ تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کی اعلیٰ تربیت کا تھوڑا سا حصّہ ان کو بھی دے دوں۔ اگر میں نہ جاتا تو وہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں بگڑ چکے تھے۔ وہ خاندان تباہ ہو چکا تھا۔ ماں کی ان کی نظروں میں کوئی عزت نہیں تھی۔ آپ کو بھی افسوس ہوتا۔ اب آپ کی دی ہوئی تربیت کا کچھ حصّہ ان کو بھی مل گیا۔ جب تک ماں بچوں کو اعلیٰ تربیت نہیں دیتی ہے، ان کے لیے وقت نہیں نکالتی ہے، اپنی تفریح کی قربانی نہیں کرتی ہے تو بچے ایک عذاب بن جاتے ہیں، قہر بن جاتے ہیں۔ صرف ماں باپ اور فیملی کے لیے نہیں پورے سماج پوری دنیا کے لیے۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب ان کا ضمیر جاگے گا تو وہ خود مجھے آپ کے پاس واپس بھیجیں گی۔ ایک صلاح کے ساتھ، نفرت اور بغض ختم کر کے۔ میں اس دن کا انتظار کرتا رہا۔ ایسا ہی ہوا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ انہوں نے خود کہا۔ ''بیٹے! میرے پاس چھ بچے ہیں جن کو تم نے سنبھال لیا مگر تم کو بھی تو کسی نے سنبھالا تھا۔ اگر انہوں نے نہ سنبھالا ہوتا تو تم بھی ان لوگوں کی طرح خراب اور برباد ہو چکے ہوتے۔ تمہارا سوتیلا باپ تمھیں کچھ بھی نہ بننے دیتا بس حقارت اور ظلم دیتا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں تمہیں سنبھالتی۔ ایک مرد کے اندر تھی جو میرا شوہر تھا مگر تمہارا کوئی نہیں تھا۔ تمہارے پاپا نے کچھ سوچ کر ہی تمھیں ان کو سونپا تھا۔ واقعی میں انہوں نے تمہیں ہیرا بنا دیا ایک تراشا ہوا خوبصورت ہیرا۔ تمہارے پاپا کی خواہش کے مطابق۔ تم پرائی اولاد ہو پیدا کرنے والے سے زیادہ پالنے والے کا حق ہوتا ہے، تم اپنی ماں کے پاس واپس لوٹ جاؤ۔ تم ان کی امانت

ہو۔میرے ضمیر کی ملامت سے مجھے بچالو۔ وہ میری بہن ہیں۔ میں اور میرے بچے بھی ان کے ہیں۔ان سے کہہ دینا بہن سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔''

شہزین نے کہا۔''میری بہن اور بچے کہاں ہیں؟ ان سے کہو آ کر تمہاری شادی کی تیاری کریں۔ میں اب دنیا میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پاس ایک بڑا خاندان ہے۔انہوں نے اگر محبت سے تم کو مانگا ہوتا تو نہ صرف تم ان کی مدد کو جاتے میں بھی تمھارے ساتھ ہوتی۔انہوں نے نفرت اور حقارت کے ذریعے تم کو چھیننا چاہا تو میں خاموش رہی۔نفرت دنیا کی سب سے بری چیز ہے۔ دیکھو محبت میں کتنی قوت کتنی طاقت ہوتی ہے۔ وہ نیک بناتی ہے اور نیکیاں کرواتی ہے۔کاش دنیا سے نفرت مٹ جاتی، ختم ہو جاتی اور رہ جاتی صرف محبت اور میرا محبت کا پیغام سب تک پہونچ جاتا، جگر مراد آبادی کے پیغام کی طرح:

''ہے میرا پیغام محبت جہاں تک پہنچے''

یہ کہہ کر اس نے سناب کے ہاتھوں سے تینوں گلاب لے کر دونوں کو گلے سے لگالیا۔ تین گلاب ایک بار پھر یکجا ہو کر مہک اٹھے۔محبت کی خوشبو لے کر۔

◆ ÷ ◆

عائشہ

''سنیے۔''

کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ وہ کوئی اجنبی عورت تھی۔ ایک نظر میں تو کسی اورینٹل ملک کی لگی۔ دوسری نظر میں اس کی آنکھوں سے جھلکتا ہوا ہندوستان دکھائی دینے لگا۔ بڑی بڑی بھوری آنکھیں، لمبی لمبی گھنیری پلکوں کے ساتھ جیسے وہ میری آنکھیں ہوں اور میں اپنی ہی آنکھوں میں دیکھ رہی ہوں۔ کسی چینی، جاپانی، فلپینو اور ویتنامی کی آنکھیں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے پاس رک گئی اور مجھ سے پوچھا۔ ''آپ ہندوستانی ہیں۔''

''اتفاق سے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ورنہ پاکستانی، بنگلہ دیشی اور فجی کی بھی ہوسکتی تھی۔''

وہ زور سے ہنس پڑی اور آگے بڑھ کر بہت عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''کتنے دنوں سے کسی ہندوستانی کی تلاش میں تھی، آج تک امریکا کے اس خوبصورت جزیرے میں کوئی ملا ہی نہیں۔ جس سے بھی پوچھا بقول آپ کے پاکستانی، بنگلہ دیشی یا فجی ہی کا نکلا۔ یہاں شاید ہندوستانی نہیں رہتے ہیں۔''

''رہتے کیوں نہیں ہیں۔ میری تو بہت سی ہندوستانی دوستیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا، مگر میرے دل نے مجھ سے سوال کیا کہ آخر اس عورت کو کسی ہندوستانی کی تلاش کیوں ہے؟

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کسی مسلم ہندوستانی کی تلاش ہے۔''

میں ایک بار پھر چونک پڑی اور جواب دیا۔ ''آج آپ کا خواب پورا ہوگیا۔ میں مسلم ہندوستانی ہوں۔''

یہ سنتے ہی وہ مجھ سے چمٹ گئی اور مارے خوشی اور محبت کے وہ میرا ہاتھ چومنے لگی اور بولی۔ ''میرا نام عائشہ ہے میں مسلم نہیں ہوں۔ میں بدھ مذہب کو مانتی ہوں۔ میرے والد

ہندوستانی مسلم تھے۔انہوں نے مجھے عائشہ نام دیا ہے۔“

مجھے یہ کوئی نئی بات نہیں لگی۔ ہمارے یہاں کے آدمیوں کا دستور ہے کہ کسی غیر مسلم عورت سے شادی کرتے ہیں اور لڑکی کا عائشہ نام رکھ دیتے ہیں۔فرض پورا ہوگیا۔ وہ بچی یا اس کی ماں مسلم ہو یا نہ ہو۔اللہ جھوٹ نہ بلوائے اب تک کتنی نومسلم عورتوں کے پاس عائشہ دیکھ چکی ہوں اور سن چکی ہوں کہ ان کے باپ مسلم تھے اور انہوں نے یہ نام دیا ہے۔مگر پالنے پوسنے، تعلیم و تربیت اور پرورش کرنے کا کوئی فرض ادا نہیں کیا ہے۔ ہاں تو عائشہ بولتی جا رہی تھی اور میں سن رہی تھی۔ وہ اور میں کسی ایسی جگہ پر بیٹھنا چاہتے تھے کہ آرام سے بات چیت ہو سکے۔ نہ اس نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی اور نہ ہی میں نے، حالانکہ میرا گھر وہاں سے بہت قریب تھا مگر کسی اجنبی کو اپنے گھر لے جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

عائشہ اور میں قریب کے ریسٹورینٹ میں چلے گئے۔ دونوں نے کھانے کا آرڈر دیا کیونکہ یہ لنچ کا وقت تھا۔اس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔اس کے والد ہندوستانی تھے اور ان کا بہت بڑا بزنس تھا۔ وہ بزنس کے سلسلے میں ویتنام آتے جاتے رہتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات اس کی ماں مائی سے ہوئی جو ایک ریسٹورینٹ چلاتی تھی۔ روز روز کی ملاقات محبت میں بدلی اور محبت شادی میں۔اس کی ماں نے مذہب نہیں بدلا۔ وہ بدھ مذہب کو ماننے والی ایک کٹر مذہبی خاتون تھیں۔اس کے والد نے بھی کبھی مذہب بدلنے پر زور نہیں دیا۔ وہ بھی اپنے مذہب پر قائم رہے۔ ایک دن مائی کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔اس کے والد نے اس کا نام عائشہ رکھا۔ابھی عائشہ صرف کچھ مہینوں ہی کی تھی کہ ان دونوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گے جو طلاق پر جا کر ختم ہوئے۔ وہاں کے قانون کے مطابق عائشہ اپنی ماں کو ملی اور روزانہ ایک گھنٹہ اس کو اپنے والد کے لیے ملا۔اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور اس کے بہت سے بھائی بہن ہو گئے۔مگر عائشہ کی زندگی کا حاصل وہ ایک گھنٹہ تھا جو وہ اپنے والد کے ساتھ گزارتی تھی۔اس ایک گھنٹے میں وہ اس کو ہندوستانی کھانا پکا کر کھلاتے تھے۔اس سے خوب باتیں کرتے تھے۔ وہ نماز پڑھتے تھے تو وہ دیکھتی تھی۔اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ نماز پڑھے۔مگر اس کے والد نے کبھی بھی نہیں کہا کہ وہ نماز پڑھے یا نماز سیکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بدھ مذہب کو ہی اپنائے۔اس کی ماں بھی سختی سے اس کو بدھ مندر لے جاتی تھی اور اس کو بدھ مذہب کی تعلیم دے رہی تھی۔ اپنی ماں کے پاس دوسری فیملی

ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ اس کی ماں کے پاس بھی وقت نہیں تھا جو وہ عائشہ کو دیتی۔ ایک دو گھنٹے سے زیادہ وہ اس کے پاپا کے پاس بھی نہیں رہنے دیتی تھی۔ پاپا اکثر اس سے اپنی دوسری فیملی کی بات بھی کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ وہ دادا دادی، انکل آنٹی کی بات کرتے تو اس کا دل چاہتا تھا کہ پاپا اس کو ہندوستان لے جائیں اور سب سے ملوائیں۔ ایک دن اس نے پاپا سے کہا۔''پاپا مجھے ہندوستان لے چلیے، میں اپنے بھائی بہن، کزنز، آنٹی انکل اور دادا دادی سے ملنا چاہتی ہوں۔''

پاپا نے کہا۔''عائشہ تم وہاں نہیں رہ پاؤ گی۔ وہ ایک مختلف ملک ہے یہاں سے بہت فرق۔ وہاں بہت سخت پردہ ہے، ہماری فیملی کی عورتوں کو اپنا سر ڈھک کر رہنا پڑتا ہے۔''

عائشہ نے کہا۔''تو کیا ہوا میں بھی ویسے ہی رہوں گی۔ میں اپنا سر ڈھکوں گی اور پردے میں رہوں گی۔'' پاپا ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ پھر اس کا اور پاپا کا ساتھ اس وقت تک رہا جب تک وہ اکیس سال کی نہیں ہوگئی۔ جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تب ایک دن اس نے پاپا سے کہا تھا۔''پاپا آپ مجھے ہندوستان نہیں لے جاتے ہیں۔ دیکھیے گا ممی کی طرح میں بھی کسی ہندوستانی سے شادی کرلوں گی اور ہندوستان چلی جاؤں گی۔''

پاپا خاموش ہوگئے۔ بس اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے بھائی اور بہن کی تصویریں مجھے دیں اور کہا کہ شاید میں ان کو جانتی ہوں۔ میں نے تصویریں ہاتھ میں پکڑ لیں۔ مجھے عائشہ کی معصومیت پر ترس آیا۔ میں نے کہا۔''عائشہ ہندوستان بہت بڑا اور بہت بڑی آبادی والا ملک ہے۔ بھلا وہاں کی رہنے والی ہر ایک فیملی کو میں کیسے جان سکتی ہوں؟'' وہ چپ ہوگئی۔ پھر اس نے اپنا برتھ سرٹیفکیٹ دکھایا جس میں اس کی پیدائش کی تاریخ اور والد کا نام لکھا ہوا تھا احمد توصیف۔ دو تصویریں تھیں ایک اس کی بہن کی اور ایک اس کے بھائی کی۔ تصویر میں ایک کم عمر لڑکی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی اور دو خط تھے یا ڈائری کے صفحات۔ ایک انگلش میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا دوسرا اردو میں اس کے پاپا کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ان کا کوئی پتا بھی نہیں تھا۔ انہیں چیزوں کے سہارے وہ اپنے والد کی گمشدہ فیملی کو ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہی تھی جو کہ شاید جانتے بھی نہیں ہوں گے کہ ویتنام کی عائشہ امریکا آ کر ایک ہندوستانی خاتون کے ذریعے ان کو تلاش کر رہی ہے۔ کامیابی کی امید تب ہی ہو سکتی تھی اگر اللہ ساتھ دے دے ورنہ ناامیدی ہی ناامیدی

تھی۔ میں نے تو صاف جواب دے دیا اور سوچا کہ تیس سال پہلے مرے ہوئے آدمی کی فیملی پر عائشہ نامی بم کیوں گرے؟ ہوسکتا ہے کوئی معصوم عورت اپنے وفادار محبت کرنے والے شوہر کے نام کی سونی سونی کلائیاں لے کر اور اپنی زندگی کے سارے رنگ اڑا کر سفید کپڑوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہو۔ اپنے دل میں اس کی یادوں کے پھولوں کی مہک لے کر جی رہی ہو۔ اس کے معصوم بچے جو نانا نانی اور دادا دادی ہوں گے اب وہ ان کا یہ چھپا ہوا کردار بے نقاب کیوں دیکھیں؟ احمد توصیف جنہوں نے پچاس سال پہلے بزنس کے نام پر دوسرے ملک میں جا کر گلچھڑے اُڑائے اور گل کھلائے۔ مگر خاندان کے سامنے ایک اعلیٰ کردار، بھولے اور شریف آدمی بنے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے عائشہ کی قربانی دے کر۔ اس میں عائشہ، اس عورت اور اس کے بچوں کا کیا قصور ہے؟ اس عورت کے سامنے اپنے اعلیٰ شوہر کا یہ کردار کیوں آئے؟ اس کے بچے اور ان کے بچے اپنے باپ دادا کا فخر لے کر جی رہے ہوں گے۔ وہ ان کے اس چھپے ہوئے کردار سے کیوں واقف ہوں؟ کہا جاتا ہے ڈھونڈ ھنے سے خدا بھی مل جاتا ہے مگر میں کیوں اس تلاش میں اس کا ساتھ دوں؟ میں صرف حیران حیران نظروں سے اس کی فراہم کی ہوئی چیزوں کو دیکھ سکتی تھی بس۔ میں نے احمد توصیف کی ڈائری پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔ ’’میں احمد توصیف اپنے وطن سے بہت دور ویت نام میں بزنس کرتا ہوں۔ میرا خاندان بہت دقیانوسی، پردے اور خاندان کے اصولوں کا سختی سے پابند ہے اور انہیں اصولوں کو لے کر ہم سب کو بھی چلنا پڑتا ہے۔ ہم لوگوں کے یہاں شادی خاندان میں ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک خوبصورت بیوی، ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ جب میں وطن سے دور جاتا ہوں تو سب میری یادوں کے چراغ جلائے میرا انتظار کرتے ہیں۔ میرے والد صاحب کا بہت بڑا بزنس ہے۔ جس کو ہم سب بھائی دیکھتے ہیں۔ میری بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میرے والد بہت سخت اصولوں کے آدمی ہیں۔ کسی بچے کو خراب ہوتا ہوا یا غلط راستے پر جاتا ہوا وہ برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ خاندان کے باہر شادی کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ خاندان سے باہر شادی کرنے پر وہ میرے ایک بھائی کو عاق کر چکے ہیں۔ میری بیوی میرے والد صاحب کی بھتیجی ہیں اور ان کے چہیتے بھائی کی بیٹی بھی ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ اپنے والد کی لاڈلی اور اکلوتی اولاد تھیں۔ والد صاحب سب سے زیادہ انہیں کو چاہتے ہیں۔ حالانکہ سب ہی بہوئیں ان کی یا میری ماں کی بھانجیاں اور بھتیجیاں ہیں۔ میں اکیلا برسوں

سے بزنس کے سلسلے میں ویت نام میں ہی پڑا رہتا ہوں۔ یہاں میری دوستی مائی سے ہوگئی۔ دوستی محبت میں بدل گئی اور محبت شادی میں۔ جلدی ہی میں ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا اور میں نے اس کا نام عائشہ رکھا۔ مائی سے شادی کر کے والد صاحب کی سزائیں اور خوف ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا تھا۔ ہر وقت یہ خیال ستاتا تھا کہ میری معصوم بیوی کیا سوچے گی؟ وہ اگر میری اس بے وفائی کو سن لے تو شاید مر ہی جائے۔ اس خوف اور گھر والوں پر اپنے اچھے امپریشن کی وجہ سے مجھے مائی کو طلاق دینا پڑا۔ میں عائشہ کو بھی نہیں اپنا سکتا تھا وہ مائی کے پاس چھوڑ دی۔ جو بہت تیزی سے میری آنکھوں کے سامنے بدھ مذہب اختیار کر رہی ہے۔ مائی نے دوسری شادی کر لی ہے اس کے پاس آٹھ بچے اور ہو گئے ہیں۔ میری عائشہ ان میں اکیلی ہے۔ اس کے دل میں ہندوستان بسا ہے۔ وہ میرے بچوں اور میری فیملی سے ملنا چاہتی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں اور اپنی یہ مجبوری اس کو بتا بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں دنیا کے سامنے ایک اعلیٰ کردار اور اپنی فیملی کا وفادار کہلاتا ہوں۔ اس لیے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا ہوں اور نہ ان کی نظروں سے گر سکتا ہوں۔ اپنے اعلیٰ کردار اور فرمانبرداری کی وجہ سے ہی تو میں ان کا سب سے لاڈلا بیٹا ہو۔ میری بیوی اپنے سرتاج پر فخر کرتی ہے۔ عائشہ سے میں نے کہہ دیا کہ ہمارے یہاں بہت سخت پردہ ہے وہ وہاں نہیں رہ سکے گی۔ مگر آج عائشہ نے ایسی بات کہہ دی کہ میں دہل گیا۔ اس نے کہا کہ ”آپ مجھے ہندوستان نہیں لے جاتے ہیں ٹھیک ہے۔ میں کسی ہندوستانی سے شادی کروں گی اور ہندوستان میں اپنے باپ دادا کی سرزمین پر جا کر بس جاؤں گی۔“ میں گھبرا گیا کہیں میرا اپنا بیٹا میری طرح اپنا بزنس سنبھالتا ہوا یہاں نہ آجائے۔ کہیں غلطی سے دونوں بھائی بہن نہ مل جائیں۔ میں نے عائشہ کو اس کے دونوں بھائی بہن کی تصویریں دیں اور کہا۔ ”عائشہ جب تم کسی ہندوستانی سے شادی کرنا تو اس کے باپ کا نام ضرور پوچھ لینا۔“ عائشہ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

دوسرا کاغذ عائشہ کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آج میں نے اپنے پاپا سے کہہ دیا کہ میں بھی ممی کی طرح کسی ہندوستانی سے شادی کروں گی، مگر اس کو چھوڑوں گی نہیں اس کے ساتھ ہندوستان میں جا کر بس جاؤں گی۔“ پاپا چپ ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں وہ خوش نہیں ہوئے۔ پاپا ہمیشہ چڑھتے ہیں جب میں ہندوستان جانے یا کسی ہندوستانی سے شادی کرنے کی بات کرتی ہوں۔ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد پاپا نے کہا۔ ”عائشہ جب تم کسی ہندوستانی سے شادی کرنا تو

شادی کرنے سے پہلے اس کے باپ کا نام ضرور پوچھ لینا۔'' میں پاپا کا اشارہ سمجھ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ پاپا کی طرح ان کا بیٹا اور میرا بھائی بھی بزنس کے سلسلے میں ویتنام آئے۔ پاپا نے اس بات کا مجھ سے وعدہ لے لیا اور میں نے وعدہ کرلیا۔ پاپا اب ہندوستان واپس جارہے ہیں۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ وہ بہت بیمار ہیں۔ شاید میری یہ پاپا سے آخری ملاقات ہے۔ میرا پاپا سے کتنا دردناک رشتہ ہے نہ میں پاپا کی ہوں اور نہ پاپا میرے ہیں۔ پاپا نے مجھ سے جو وعدہ لیا تھا تو میں نے سوچا کہ شاید پاپا نے یہ ہی بات اپنے بیٹے سے بھی کہی ہو کہ اگر تمہیں ویت نام میں کوئی لڑکی ملے اور اس کا نام عائشہ ہو تو اس کے باپ کا نام ضرور پوچھ لینا۔ میں ویت نام میں عمر بھر انتظار کرتی رہی اس دن کا۔ پاپا کے انتقال کو آج تیس سال ہوگئے۔ مجھے آج بھی انتظار ہے اور عمر بھر رہے گا کہ کوئی ہندوستانی آکر مجھ سے پوچھے۔ ''عائشہ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟'' مگر آج تک کوئی نہیں آیا۔ میں نے خود کسی ہندوستانی سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اس لیے پاپا کی خواہش کے مطابق میں نے کبھی کسی آدمی سے نہیں پوچھا کہ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟'' میں ویتنام چھوڑ کر امریکا کے اس خوبصورت جزیرے میں آکر بس گئی۔ پاپا کی وفات کو تیس سال ہوگئے۔ میرے چھ بچے جوان ہوگئے۔ ہیں۔ کچھ کی شادیاں ہوگئی ہیں، کچھ ڈیٹنگ کررہے ہیں، سب بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں، مگر احمد توصیف کے بچوں سے اور ان کے بچوں کے بچوں سے آج تک میری ملاقات نہیں ہوئی ہے اور نہ میں ان کی تلاش میں ہندوستان گئی۔ مگر پتا نہیں کیوں مجھے آج بھی انتظار ہے کہ کوئی نہ کوئی ایک دن آکر ضرور پوچھے گا کہ عائشہ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ یا پھر میں ہی کسی سے پوچھوں گی کہ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟''

میں یہاں پر آکر رک گئی کاش میں عائشہ سے کہہ سکتی کہ عائشہ کوئی بھی کبھی بھی تم سے یہ سوال نہیں کرے گا کیونکہ تمھارے والد ایک اعلیٰ کردار کے شریف اور فرمانبردار بیٹے اور بیوی کے بہت اعتماد والے شوہر تھے۔ یہ تمہارا وہم ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے تمہارا ذکر کیا ہوگا۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے بچوں کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ ان کے والد کی کوئی عائشہ بھی ہے جو ان کا انتظار کررہی ہے، تمہارا انتظار انتظار ہی رہے گا۔ کوئی کبھی بھی آکر نہیں پوچھے گا۔ ''عائشہ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟'' نہ کسی نے یہ سوال آج تک تم سے کیا ہے اور نہ کوئی کبھی یہ سوال تم سے کرے گا۔ میرا بار بار یہ ہی دل چاہ رہا تھا کہ میں اس سے یہ بات کہہ دوں۔ مگر جب اس کے

پاپا اس سے یہ بات نہیں کہہ سکے تو مجھے کیا غرض پڑی تھی کہ اس کے اس طویل محبت اور خلوص سے بھرے انتظار پر اپنے الفاظ کی ضرب لگا کر اس کے وجود کو ہلا دوں۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنے اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔ اچانک میں اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہ گئی۔ مجھے جیسے زمین نے جکڑ لیا میں آگے نہیں بڑھ سکی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ عائشہ بہت دور نکل چکی تھی۔ تب ہی میں نے کچھ سوچا اور تیزی سے اس کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس کو زور زور سے آوازیں دینے لگی۔ میری آواز سن کر وہ رک گئی۔ میں اس کے قریب پہونچ گئی۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''عائشہ کیا تم میرے والد کا نام نہیں پوچھو گی؟''

''والد کا نام؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اچانک پوچھا۔ ''آپ کے والد کا کیا نام ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے والد کا نام احمد توصیف ہے۔''

''کیا؟'' وہ حیرت سے اچھل پڑی اور دوسرے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ میں نے کہا۔ ''میرے والد نے تم سے صرف لڑکے کے والد کا نام پوچھنے کو کہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی لڑکی کبھی ویتنام نہیں جائے گی، اور واقعی میں نہیں گئی مگر امریکا کے اس جزیرے میں آ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ بڑی سی گول دنیا ایک دن سمٹ کر ایک چھوٹا سا دائرہ بن جائے گی ہم دونوں کو ملانے کے لیے۔''

◆ ÷ ◆

کہانی ایک جزیرے کی

وہ شادی کے فوراً بعد اس خوبصورت جزیرے میں آ گئی تھی۔ اس جزیرے کی خوبصورتی اوراس کے شوہر کے ساتھ نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ ہر طرف بہاریں ہی بہاریں تھیں۔اس کی زندگی بھی جیسے ان بہاروں سے سج گئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت جزیرہ تھا جس کے نام کے معنی ہی خوبصورت وادی تھا۔اس خوبصورت وادی کا حسن الفاظ میں اتارنا مشکل تھا،اس کو بس دیکھا جاسکتا تھا،محسوس کیا جاسکتا تھا،نشاط کے سرور میں ڈوبا جاسکتا تھا۔اس کو اپنی زندگی حسن کے سانچے میں ڈھلی لگتی تھی۔ ایک ایک درخت، ایک ایک پتے،ایک ایک پھول کی وہ شیدائی تھی۔اتنے صاف صاف پتے دیکھ کراس کو لگتا تھا کہ رات کو جیسے قدرت ہر پتے کو صاف کر کے درختوں پر سجادیتی ہے۔اس جگہ پر ہمیشہ بہار ہی بہار دکھائی دیتی تھی،خزاں کا تو وہاں پر گزر ہی نہیں تھا۔اس جزیرے میں ہوا، پھول، ہریالی، پہاڑ، سمندر، برستا پانی اور چمکتا سورج، یہ سب چیزیں اس کو ایک ساتھ نظر آتی تھیں تو وہ دنگ رہ جاتی تھی۔ چمکتے سورج اور برستے پانی کے ساتھ پہاڑ اور ٹھاٹھیں مارتے سمندر پر خود بخود نظریں ٹھہر جاتی تھیں اور ہوا پھول ہریالی جیسے خود بخود شامل ہوتے ہوئے لگتے تھے اس جگہ کی دلفریبی کو بڑھانے کے لیے۔ رات کے وقت اس شہر میں ایسی جگمگاہٹ، ایسی رنگ ونور کی بارش ہوتی تھی کہ جیسے کہکشاں زمیں پر اتر آئی ہو۔قوس قزح اتنے دلنواز انداز کے ساتھ نمودار ہوتی تھی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔اس کا ایک سرا پہاڑ کی چوٹی پر ہوتا تھا اور دوسرا سرا سمندر میں غرق ہو جاتا تھا۔ پوری وادی کے حسن میں چار چاند لگاتی قوس قزح اس جزیرے کی بہت بڑی خوبی تھی جو ہر وقت، ہر جگہ نظر آتی تھی۔ زیادہ تر ایسے نکلتی تھی کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک گیٹ سا بنا دیتی تھی اس گیٹ سے جب اس کی کار گزرتی تھی تو قدرت کا یہ عجوبہ اس کو بیخود کر دیتا تھا۔قوس قزح کے ایسے گیٹ قدم قدم پر نظر آتے تھے جیسے اس کا استقبال کر رہے ہوں۔ پھولوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے درخت فرش پر

پھولوں کو ایسے بچھا دیتے تھے کہ اس پر چلتے ہوئے راہی اور سیاح کے چہروں پر ایک فخر سا دکھائی دیتا تھا۔ خوبصورت چڑیاں اپنی خوشنما آواز میں نغمے گاتی تھیں تو فضا میں رس سا گھل جاتا تھا، ہرے بھرے پہاڑ اور میدان کی ہریالی کی دلکشی نظروں کو ان پر سے ہٹنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ہر وقت چلتی ہوئی خوشگوار ہوا جنت سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر کے کنارے دھیرے دھیرے چلتی کار سے ہرا، ہلکا ہرا، نیلا، گہرا نیلا، ہلکا نیلا اور بھورے رنگ کے سمندر کا نہ بھولنے والا حسن دکھائی دیتا تھا۔ ڈوبتا سورج اور نکلتے سورج کا انداز ہی اتنا جدا اور اتنا دل فریب ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو کسی اور جہان میں محسوس کرتی تھی۔

راستے میں قبرستان بھی پڑتا تھا۔ اتنا خوبصورت قبرستان اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گلدستوں سے سجے ہوئے قبروں کے نشان ایسا لگتا تھا کہ گلستاں میں بدل گئے ہوں۔ حسین ترین سمندر کا کنارہ، چاروں طرف ہرے بھرے پہاڑ، رنگ برنگی پھولوں سے سجے درخت، اپنے پیاروں کی قبروں کے پاس خوبصورت گھاس پر پکنک مناتے ہوئے یا مرے ہوئے انسانوں کی سالگرہ مناتے ہوئے لوگ۔ سالگرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے غبارے فضا میں ہوا سے لہراتے ہوئے زندگی کا ثبوت دیتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ بہت ہی حسین گلستاں چھوڑ کر قبرستان کی ویرانی کہیں چلی گئی ہو۔ شوہر کا ساتھ ہونے کی وجہ سے ہی اس جزیرے نے اس کی زندگی میں ایک نیا پن، ایک انوکھی خوبصورتی بھر دی تھی۔ اس کو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہر روز ان راستوں سے گزرتی ہے اور ہفتے میں ایک بار ضرور اس چھوٹے سے پورے جزیرے کا چکر لگاتی ہے۔ جب بھی کسی بھی راستے سے گزرتی تو اس کو لگتا کہ وہ نئی جگہ ہے اور وہ وہاں سے پہلی بار گزر رہی ہے نئی خوبصورتی کو دیکھتی ہوئی۔ اس جزیرے کے لیے نئی نئی باتیں نئی نئی تعریفیں وہ کہاں سے لاتی تھی وہ خود بھی حیران تھی۔ وہ ایک ایک چیز کی اتنی تعریف کرتی تھی کہ تعریف کے سارے الفاظ کم پڑ جاتے تھے۔ وہ بولتی ہی چلی جاتی تھی۔ اس کے شوہر کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بہت شوق سے اس کی باتیں سنتے جاتے تھے اور بہت متاثر تھے۔ وہ ہر چیز کی بہت دلفریب منظر کشی کرتی تھی کہ جیسے الفاظ سے تصویریں بنا رہی ہو، اور حسین پینٹنگز میں خوشگوار رنگ بھر رہی ہو، ایک ادیب یا افسانہ نگار کی طرح کہانیوں کا آغاز کر رہی ہو، اپنی شعر و شاعری کے ذریعے زمین پر جنت اتار رہی ہو۔

پھر اچانک اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اسی خوبصورت قبرستان میں ان کی تدفین

ہوگئی۔قبرستان کا حسن وخوبصورتی ویرانی میں بدل گئی۔گلدستے ہوا میں لہراتے ہوئے ایسے لگتے جیسے چیختی ہوئی روحیں پیچھا کر رہی ہوں۔اب بھی وہی جگہ تھی، وہی سماں تھا، وہی مختلف رنگوں سے سجا ہوا سمندر کا حسن تھا، کھلتے مہکتے حسین پھول تھے، ویسا ہی گیٹ بناتی ہوئی قوس قزح تھی۔ویسی ہی خوبصورت خوبصورت چڑیاں تھیں اپنی دلکش آواز میں نغمے گاتی ہوئی، ہر وقت چلتی ہوا کے جھونکے اب بھی خوشگوار تھے،اسی طرح اپنی مہک لٹاتے ہوئے بیلا،چنبیلی، چمپا،گلاب وغیرہ تھے، گلہڑ کے پھول (اس اسٹیٹ کا پھول) اب بھی مختلف رنگوں میں مسکرا کر شام کے رنگین آسمان کے مدمقابل کھڑے ہوئے تھے، چاروں طرف پھیلے کھلے ہوئے سرخ گلہڑ کے پھول شفق سے مقابلہ کرنے کو موجود تھے۔مگر اب اس کو کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔وہ خاموشی سے کار چلاتی انہیں راستوں سے گزرتی قبرستان تک جاتی تھی اور واپس آتی تھی۔اس کو ہر طرف ویرانی نظر آتی تھی۔ موت جیسا سناٹا لگتا تھا۔اب وہ جزیرہ اتنا حسین نہیں تھا اس کا حسن غم میں ڈوب گیا تھا۔وہ جزیرہ کہیں کھو گیا تھا جس کی وہ مداح تھی، پہلے اس کے حسن کا تعلق اس کے دل سے تھا اب اس کے دل کی دنیا اجڑ گئی تھی اس کے احساسات بدل گئے تھے،اب اس کو یہی لگتا تھا کہ جیسے وہ جزیرہ اس کی آواز میں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو:

ہریالی پہاڑ ہوا سمندر
لے کر اپنے اندر
گلہڑ کے پھولوں کا رنگ چرا کر
اس وادیِ حسن میں یہ کون سوتا ہے
خون کے آنسو ہم کو رلا کر

(آزاد نظم خون کے آنسو)

◆ ÷ ◆

میری دوستی میرا پیار

مجھے بچپن سے ہی جانوروں سے بہت پیار ہے۔ ہر جانور کو میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے پاس رکھ لوں۔مگر یہ ممکن نہیں ہے جانوروں کو آزادی بہت پیاری ہے اگر ہم کو کوئی قید کرلے تو ہمارے اوپر کیا گزرے گی۔ مجھے رنگ برنگی چڑیاں بھی بہت پسند ہیں۔ میں انہیں پنجڑے میں رکھ کر پالنا نہیں چاہتی۔ میں ان کو آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کی خوبصورتی، ان کی آوازوں سے انجوئے کرنا چاہتی ہوں۔ان کو اپنے ہاتھوں سے دانا ڈالنا چاہتی ہوں۔پنجڑے میں قید چڑیوں پر مجھ کو رحم آتا تھا۔ بیچاریوں کی کیا زندگی ہوتی ہوگی۔سب سے زیادہ مجھے خرگوش پسند ہیں۔میرا دل چاہتا تھا کہ میرے پاس بھی ایک ننھا سا خوبصورت سا سفید خرگوش ہوتا میں اس کو اپنے کمرے میں رکھتی، اس کے ساتھ کھیلتی اور اس کے ساتھ پارک جاتی۔ پارک کی اس جگہ پر ہم دونوں جاتے جو جگہ مجھے بہت پسند تھی۔ جہاں میں اور میری ممی بہت جاتے تھے اور ایک مخصوص جگہ پر ہی ہمیشہ بیٹھتے تھے۔میری ممی اور ڈیڈی کو میری یہ خواہش پتا تھی جس کا میں دن میں دس بار ذکر کرتی رہتی تھی۔

میری سالگرہ بہت قریب تھی۔میں اس کی تیاری میں مگن تھی۔ میں نے اپنی سب ہی دوستوں اور کزنز کو بلالیا تھا۔ممی اور ڈیڈی میری برتھ ڈے کی بہت تیاری کررہے تھے۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا میں اپنے آپ کو بہت خاص سمجھ رہی تھی۔اپنی سالگرہ کے دن میں اپنی کزن کے ساتھ پارک چلی گئی۔جب میں واپس آئی اور اپنے کمرے میں گئی تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ بہت ہی خوبصورت سفید رنگ کا خرگوش میرے بستر پر بیٹھا گاجر کھا رہا تھا۔میں خوشی سے چیخ اٹھی۔خرگوش بھی مجھے دیکھ کر اچھل پڑا اور کود کر میری گود میں آ گیا جیسے وہ مجھے جانتا تھا۔میں اس کو پیار کرنے لگی۔اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ممی ڈیڈی اور سب کو آوازیں دے کر بلایا۔ڈیڈی اور ممی میری خوشی سے بہت خوش ہوئے، یہ میرا برتھ ڈے کا سرپرائز گفٹ تھا۔وہ میرے لیے اتنا کیوٹ سفید رنگ کا خرگوش لائے تھے جس کو انہوں خود ٹرینڈ

بھی کیا تھا۔ جب میں اسکول چلی جاتی تو وہ میرے کمرے میں رہتا تھا۔ جب میں سو جاتی تو وہ میرے کمرے میں لایا جاتا۔ وہ بہت خوش ہو کر مجھے دیکھتا تھا وہ مجھے جانتا تھا پہچانتا تھا یہ تو میرے لیے اور بھی خوشی کی بات تھی۔

خرگوش کا نام میں نے ٹامی رکھا۔ ٹامی سے مجھے بہت پیار ہو گیا تھا۔ ٹامی بھی مجھے بہت چاہتا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں پا رہے تھے۔ جب میں اسکول جاتی تو ٹامی اداس ہو جاتا۔ میرا دل بھی اسکول میں نہیں لگتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آتی تو ٹامی میرا انتظار کرتا ہوا ملتا۔ ہم دونوں خوب اچھلتے، خوب کودتے اور خوب دوڑتے۔ میں اس کو گاجر کھلاتی اور خود بھی اس کے ساتھ گاجر کھاتی۔ میرے کزن اور دوستیں ٹامی سے جلتی تھیں۔ وہ سب ٹامی سے میرا اتنا پیار اتنی دوستی برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ میری دوستیں سمجھتی تھیں کہ میں ان کو اگنور کر رہی ہوں۔ وہ ٹامی کو ہی میرا اکیلا دوست سمجھنے لگیں۔ بات بھی صحیح تھی۔ ٹامی مجھے بہت ہی پیارا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنا مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے اس کی بہت سی تصویروں کو اپنے کمرے میں سجا رکھا تھا۔ خرگوش کے بہت سے کھلونے میں نے جمع کر رکھے تھے۔ ٹیڈی بیر کی جگہ خرگوش نے لے لی تھی۔ میرا روم اب خرگوش روم لگتا تھا۔ ٹامی کو پہچان تھی کہ کون میرا دوست ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر کوئی میرے ساتھ اچھا ہوتا تو ٹامی اس کے ساتھ اچھا ہوتا اگر کوئی مجھ سے لڑتا تو ٹامی ایک ویلن کی طرح ایکٹ کرتا اور دوڑ دوڑ کر اس پر حملہ کرتا۔

ایک بار مجھے اسکول کا پروجیکٹ ملا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے پروجیکٹ کو بہت بڑا انعام بھی ملنے والا تھا۔ میں اوّل آ کر وہ انعام حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے میں نے بہت پیسہ خرچ کیا اور بہت محنت سے وہ پروجیکٹ تیار کیا۔ میری دن رات کی محنت کو ٹامی بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بیٹھا رہتا وہ کوئی مدد تو نہیں کر سکتا تھا، مگر ایک اچھے دوست کی طرح وہ مجھے کمپنی اور مارل سپورٹ دے رہا تھا۔ جب پروجیکٹ تیار ہو گیا تو میں بہت خوش تھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ مجھے اول انعام ضرور ملے گا۔ میں خوشی سے اچھلنے لگی۔ میری خوشی میں میرا دوست ٹامی بھی شامل ہو گیا۔ وہ بھی اچھل رہا تھا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میں اپنے کمرے میں پروجیکٹ رکھ کر ممی کے ساتھ بازار چلی گئی۔ ٹامی گھر پر تھا۔ جب وہ گھر پر ہوتا تھا تو میرے کمرے میں رہتا تھا یا میرے کمرے کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس دن شاید اس نے خود بخود میرے کمرے پر

اپنی ڈیوٹی لگالی تھی۔

اس دن اتفاق سے میرا کزن میرے گھر آیا۔ وہ میرے کلاس میں تھا اور اس کو بھی وہی پروجیکٹ ملا تھا۔ اس نے جو اتنا شاندار پروجیکٹ دیکھا تو جل گیا اور پورا پروجیکٹ توڑ دیا، خراب کر دیا اور چپکے سے گھر سے چلا گیا۔ ٹامی نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب میں واپس گھر آئی اور اپنے پروجیکٹ کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئی۔ میں زور زور سے رونے لگی۔ میرے اوّل آنے کے سارے خواب ختم ہوگئے۔ میرے پاس وقت بھی نہیں تھا ویسا پروجیکٹ دوبارہ بنانے کا، کیونکہ دوسرے ہی دن پروجیکٹ دینا تھا۔ میں نے سوچا کہ ٹامی نے میرا پروجیکٹ توڑا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی نیک تھا کتنا ہی ہمدرد اور مددگار تھا آخر کار جانور ہی تو تھا۔ میں اس کو چھوڑ کر شاپنگ کرنے چلی گئی تھی۔ شاید اس نے برا مانا تھا۔ میں اس کو ڈانٹنے لگی۔ ٹامی بات نہیں کرسکتا تھا۔ وہ حقیقت بھی نہیں بتا سکتا تھا، مگر اس کے آنکھوں میں آنسو تھے۔ پتا نہیں یہ آنسو اس کی بے گناہی کے تھے یا میرے ڈانٹنے کی وجہ سے تھے یا مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رو رہا تھا۔

دوسرے دن جب میرا کزن آیا تو ٹامی بہت خفا تھا۔ وہ لپک لپک کر اس پر حملہ کر رہا تھا وہ ایک ویلن بن گیا۔ اس نے اس کا بیٹھنا مشکل کر دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ جب میں گھر پر نہیں تھی تو میرا کزن میرے گھر آیا تھا اور میرے کمرے میں گیا تھا۔ میرا پروجیکٹ میرے کزن نے ہی اپنی جلن اور حسد کی وجہ سے خراب کیا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہوگیا کہ اس نے ہی یہ کام کیا ہے، کیونکہ وہ میرے کلاس میں تھا۔ ٹامی نے اس کو توڑتے دیکھا تھا۔ اس میں ٹامی کی غلطی نہیں تھی۔ وہ اپنی بے گناہی کو ثابت کر رہا تھا اور مجرم کو سامنے لا رہا تھا۔ میرا ٹامی واقعی میں میرا اچھا سچا اور وفادار دوست تھا۔ جب میری اچھی سہیلیاں آتیں تو ٹامی ان کو دور سے بیٹھ کر دیکھتا ہم لوگوں کے ساتھ کھیلتا۔ اگر ایسی سہیلیاں آتیں جو اس کو پسند نہیں کرتی تھیں یا وہ ان کو پسند نہیں کرتا تھا تو وہ ہر طرح سے ان پر اپنی نفرت ظاہر کرتا تھا۔

مجھے اور ٹامی دونوں کو پارک میں جانا بہت پسند تھا۔ پارک میں ہم لوگوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ ہرے بھرے درختوں اور خوبصورت پھولوں سے سجا پارک ہم دونوں کو بہت پسند تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بہت اچھی لگتی تھی۔ پارک کا بڑا سا میدان اچھلنے، کودنے، دوڑنے، بھاگنے کے لیے بہت اچھا تھا۔ ہم لوگ اپنے پسندیدہ اسپاٹ تک پہنچنے کے لیے دوڑ لگاتے تھے۔ ٹامی اپنی عادت

کے مطابق بہت تیز بھاگتا تھا۔ میں چاہے جتنا تیز بھاگتی مگر کبھی اس کو ہرا نہیں پاتی تھی۔ مجھے ہمیشہ کچھوے اور خرگوش کی کہانی یاد آتی تھی۔ کیسے ایک کچھوے نے خرگوش کو دوڑ میں ہرا دیا تھا اور دنیا میں اپنا نام روشن کیا تھا۔ مگر ٹامی کی دوڑ دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ میں سوچتی تھی ایسا کبھی نہیں ہوسکتا تھا کہ دوڑ میں جیت کچھوے کی ہوئی ہو۔ کہانی میں تو خرگوش سو گیا تھا مگر ہمارا خرگوش تو کبھی سوتا نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اتنا پھرتیلا تھا کہ مجھے جیتنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ جب مجھ سے پہلے ہماری خاص جگہ پر پہونچ جاتا تھا تو اتنا خوش اتنا مغرور کھائی دیتا تھا کہ جیسے اس نے مجھ کو ہرا کر اپنے پوری خرگوش قوم کی عزت رکھ لی ہو اور رینگتے ہوئے کچھوے کی جیت کو غلط ثابت کر دیا ہو۔ اپنی ہار پر مجھے بہت غصہ آتا تھا جیسے ٹامی میری ہار اور میرے غصے پر اپنی جیت کی خوشی مناتا تھا۔ ہمارے ساتھ ممی ہوتی تھیں۔ وہ بھی میرے اور اس کے مقابلے کو بہت پسند کرتی تھیں، اور ٹامی کو پیار سے گود میں بٹھا لیتی تھیں۔ ٹامی کا جیتنا اور مجھے چڑانا میری انا کا سوال بن گیا تھا۔ میں نے طئے کرلیا تھا کہ ایک دن میں ٹامی کو ضرور ہراؤں گی اور کچھوے کی جیت کی طرح اپنی فتح کا جھنڈا ضرور لہراؤں گی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ٹامی بھاگتا ہوا جاتا اور میں چلتی رہتی اور کہتی رہتی۔ ''رک جا ٹامی۔'' مگر وہ اور تیزی سے بھاگنے لگتا۔ مجھے یہ بھی ڈر لگا رہتا کہ کہیں وہ کسی سائیکل یا پتھروں وغیرہ سے ٹکرا نہ جائے۔ آخر اس کی ذمہ داری بھی تو مجھ پر تھی۔ روز ایسا ہوتا تھا وہ بھاگتا جاتا میں اور ممی اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ میں اس اسپاٹ پر اس کو کبھی کبھی اس کے دوڑنے سے پہلے بھی لے جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں واقعی میں کچھوے کی طرح رینگنے لگتی بلا وجہ کے لیے دوڑنا بند کر دیتی اور سوچ لیتی ٹامی سے مقابلہ بیکار ہے۔ نہ ٹامی کبھی سوئے گا اور نہ میں کبھی جیتوں گی۔ آخر اس وقت میں بھی تو بچہ تھی اور بچوں کی طرح سوچتی تھی کہ کاش ٹامی بھی کچھوے کی کہانی کی طرح سو جائے اور میں جیت جاؤں، دنیا میں میری جیت کے بھی چرچے ہوں اور میں بھی اپنی اس جیت کی کہانی دنیا کو سناؤں۔

مجھ کو ٹامی پر بہت غصہ آتا تھا اور سوچتی تھی، کیا وہ اس کے لیے قربانی نہیں دے سکتا ہے؟ کیا کبھی اس کو بھی جیتنے کا موقع نہیں دے سکتا ہے؟ جیسے میں اس کے لیے ہر وقت قربانیاں کرتی رہتی ہوں۔ بیچاری مجھ چھوٹی سی بچی کو کیا معلوم کہ ٹامی جانور ہے اس کو دوڑنا، بھاگنا، اچھلنا کودنا پسند ہے۔ وہ اس کی فطرت ہے۔ بڑا سا میدان اس کے قدرتی شوق کو باہر لاتا

ہے۔ میں روزانہ دوڑ میں اس کے سونے کا انتظار کرتی رہی مگر ایسا دن کبھی نہیں آیا اور میں اپنی پوری قوت کے ساتھ بھاگ کر بھی اس کو ہرا نہیں سکی۔ بس رینگتا ہوا کچھوا ہی بنی رہی۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ میں اور ٹامی ہمیشہ کی طرح ریس کرر ہے تھے میں اس سے بہت پیچھے تھی۔ وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی چال اور بھی کم کردی۔ اچانک مجھ کو اپنی ایک دوست مل گئی اور میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ جب بہت دیر ہوگئی تو مجھے ٹامی کا خیال آیا۔ میں نے جلدی سے اپنی دوست سے باتیں ختم کیں اور آگے بڑھ گئی۔ مجھے اطمینان بھی تھا کہ مام اس اسپاٹ پر موجود ہیں ٹامی کی دیکھ بھال کرلیں گی۔ میں آگے بڑھی تو حیران رہ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ٹامی ایک اونچے ٹیلے کے نیچے سو رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے سوچا کہ آخر وہ دن آ ہی گیا جب ٹامی سو رہا ہے۔ آج پہلی بار میری جیت ہوگی اور ٹامی ہارے گا۔ میں دوڑتی ہوئی اس اسپاٹ پر پہنچ گئی۔ ممی مجھ کو اکیلا دیکھ کر حیران ہوگئیں۔ انہوں نے ٹامی کے بارے میں پوچھا تو میں نے بہت خوش ہو کر کہا۔ ''آج راستے میں ٹامی سو رہا تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا نہیں۔ آج پہلی بار میں ٹامی سے پہلے یہاں پہونچ گئی ہوں۔ آج ٹامی کو ہرانے کا میرا خواب پورا ہوا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں، جب ٹامی آئے گا تو میں بھی اس کی طرح خوب اچھلوں کودوں گی۔''

میں واقعی میں اپنی فتح پر ناچ رہی تھی۔ مگر ممی کو فکر تھی کہ ٹامی کہاں رہ گیا؟ ان کو اس کے درخت کے نیچے سونے کی کہانی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ خرگوش اور کچھوے کی کہانی بھی جانتی تھیں اور جانتی تھیں وہ صرف کہانی ہے حقیقت نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ''جا کر دیکھو ٹامی کہاں ہے؟'' مگر میں انکار کرتی رہی اور چاہتی تھی کہ ٹامی خود آ کر مجھ کو دیکھے کہ آج وہ واقعی میں سو گیا اور میں جیت گئی۔ اب پوری دنیا میری کہانی بھی سنے گی اور میں بھی کچھوے کی طرح مشہور ہو جاؤں گی۔ جب بہت دیر ہوگئی تو مجھ کو بھی فکر ہوئی۔ میں نے سوچا اب جا کر اس کو جگانا چاہیے، مگر مجھ کو افسوس ہوا کہ وہ میری جیت کو نہیں دیکھ سکا اور میں اچھل کود کر اپنی فتح اس کو نہیں دکھا سکی۔ میں اس کو لینے چلی گئی۔ میں اس جگہ پر پہنچی تو میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں اس کے قریب گئی جیسے ہی اس کو اٹھایا وہاں خون ہی خون تھا۔ ٹامی کے بجائے اس کا مردہ جسم وہاں پڑا ہوا تھا۔ میری بے ساختہ چیخ نکل گئی اور میں زور زور سے رونے لگی۔ بہت سے لوگ وہاں پر جمع ہو گئے۔ ممی بھی وہاں آ گئی تھیں۔ پتا نہیں کس چیز سے ٹکرا کر وہ مر گیا تھا۔ میں رو رہی تھی اور کہے جا رہی تھی۔ ''میرا

ٹامی میری سب سے بڑی خواہش پوری کر گیا، یعنی ایک خرگوش دوڑ میں مجھ سے ہار گیا۔ وہ سو نہیں سکا تو مر کر وہ مجھ کو جتا گیا۔'' لیکن میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میری لاپروائی کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ ممی مجھے سمجھا رہی تھیں۔ ''تمہاری اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ ایک ایکسیڈنٹ ہے جو کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔'' مگر میں کسی کی نہیں سن رہی تھی روئے جارہی تھی۔

ٹامی کے بغیر میری دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ میرا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنا کمرہ مجھ کو سنسان لگ رہا تھا۔ اب میں نہ ہنستی تھی نہ اپنی دوستوں کے ساتھ کھیلتی تھی بس ٹامی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ ترکاریوں، پھلوں اور گاجروں سے مجھ کو نفرت ہوگئی تھی، کھانا تو بہت دور کی بات تھی میں ان کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ممی اور ڈیڈی نے مجھ کو ٹامی کی یاد دلانے والی ہر چیز میرے کمرے سے ہٹا دی تھیں۔ اس کی تصویریں اس کے کھلونے ہر چیز۔ اسکول میں بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔ ٹیچرز کی شکایتیں آرہی تھیں کہ میرے نمبر بہت خراب آرہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر سب ہی لوگ پریشان تھے۔ ممی ڈیڈی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ سب ہی مجھے سمجھا رہے تھے مگر میں کسی کی نہیں سن رہی تھی۔ میرا پیارا ٹامی جو میرے پاس نہیں تھا۔ اس کا خوبصورت سفید رنگ میں نہیں بھول پارہی تھی۔ اس کی ہاپ یا کودنا اچھلنا میں نہیں بھول پارہی تھی۔ میں اس کی حفاظت نہیں بھول پارہی تھی جو وہ میری کرتا تھا۔ وہ میری دوستوں اور کزنز کی پسند اور ناپسند کو سمجھ جاتا تھا۔ اپنے برتاؤ سے ان پر ظاہر بھی کر دیتا تھا کہ وہ ان کے برتاؤ کو سمجھ رہا ہے۔ اتنا بہترین دوست اب مجھے کہاں ملے گا؟ وہ میرا ایک سچا اور وفادار دوست تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ میں اس کو بھول جاؤں مگر میں اس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ میرے خیالوں میں وہ اب بھی میرے ساتھ کھیلتا تھا، ہوپنگ کرتا تھا، بہت تیز دوڑتا تھا اور میں اس کا پیچھا کرتی تھی اس کو دوڑ میں ہرانے کی ناکام کوشش کرتی تھی، وہ بھاگتا چلا جاتا تھا تھکتا ہی نہیں تھا جیسے اب بھی مجھ کو چڑھا رہا ہو۔ میں اب اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی تھی۔ میں دوڑ میں اب اس سے نہیں جیتنا چاہتی تھی اس کے پیچھے ہی چلنا چاہتی تھی۔ اس کو ہی جیتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا اس خیالی دوڑ میں بھی میں پہلے کی طرح اس سے آگے جانے کی خواہش کی وجہ سے میں اس کو اپنے خیالوں میں بھی نہ کھودوں۔ اب میں نے رونا کم کر دیا تھا بس ہر وقت سوچتی ہی رہتی تھی۔ میرے خیالوں میں صرف میں تھی اور میرا پیارا ٹامی۔

وقت گزرتا گیا اور میری سالگرہ کا زمانہ قریب آ گیا۔ مگر ٹامی کے بغیر مجھے سالگرہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں ایک چھوٹی سی بچی جو پورے سال اپنی سالگرہ کا انتظار کرتی تھی اس لڑکی یعنی میں نے سالگرہ منانے سے انکار کر دیا۔ گھر والوں اور دوستوں کے لیے حیرت کی بات تھی۔ میں نے کہہ دیا مجھے ٹامی سالگرہ کے دن ملا تھا اب اس کے بغیر میں سالگرہ نہیں مناؤں گی۔ میری سالگرہ نہیں منائی جائے گی، یہ بات سن کر میرے گھر والے حیران ہو گئے کہ دس سال کی لڑکی اچانک اتنی بڑی کیسے ہوگئی؟ اس کا بچپن کہاں کھو گیا؟ اس کی ہنسی، اس کی خوشی، اس کی خواہشیں سب اس کی زندگی سے کیسے غائب ہوگئیں؟ ممی ڈیڈی مجھ کو مناتے رہے اور سمجھاتے رہے مگر میرا انکار اقرار میں نہیں بدلا۔ میں نے سالگرہ منانے، کیک کاٹنے اور اپنی دوستوں کو بلانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں سالگرہ کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتی ہوں۔ ممی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مجھ کو نارمل کیسے کریں اور کیسے مجھ کو پارک لے جانے پر راضی کریں؟ ایک دم سے انہیں ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم سالگرہ نہیں منانا چاہتی ہو نہ مناؤ۔ مگر ہم ٹامی کو تو نہیں بھول سکتے ہیں۔'' ٹامی کا ذکر سنتے ہی میں اچھل پڑی، اس وقت مجھ کو صرف ٹامی کی باتیں کرنا ہی پسند تھیں۔ میں اس وقت اس ہی کا ذکر کرنا اور سننا پسند کرتی تھی اور ہر کسی سے اسی کی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اب میں نے ممی سے بات کرنے میں دلچسپی دکھائی کیوں کہ ممی ٹامی کی بات کر رہی تھی جواب میرا سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ ممی کہے جا رہی تھیں۔ ''کیوں نہ ہم لوگ تمہاری سالگرہ کے دن ٹامی کا دن منائیں ہم لوگ صبح صبح ہی اس پارک میں جائیں گے۔ اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھیں گے۔ ٹامی کی خوب باتیں کریں گے۔ اس کی پسندیدہ چیزیں کھائیں گے۔ خاص کر گاجریں کھائیں گے۔ اس کی طرح اچھلیں گے، کودیں گے اور خوب دوڑیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا۔ ٹامی بھی جہاں ہوگا خوش ہوگا۔'' ممی کی باتیں مجھے بہت پسند آئیں اور اس لیے میں نے خوشی خوشی اس پارک میں جانا منظور کر لیا۔ وہ پارک جس سے مجھے نفرت ہوگئی تھی جہاں میرا ٹامی مر گیا تھا۔ وہاں اب میں جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ مجھ کو راضی دیکھ کر ممی کو خوشی ہوئی اور خوشی کیوں نہ ہوتی ممی کا نفسیاتی حربہ یعنی ان کی سائیکالوجی جو کام آ گئی تھی۔ میں پارک جانے پر راضی کیسے نہ ہوتی۔ پارک میں جانا ٹامی سے جو جڑ گیا تھا، ٹامی کی باتوں سے جڑ گیا تھا ٹامی کی یادوں سے جڑ گیا تھا۔

سالگرہ کے دن صبح صبح ہی میں اور ممی پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ پارک پہونچ کر

مجھے رونا آنے لگا۔ مجھے اپنا ٹامی یاد آ گیا مگر میں نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا، اور ممی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ میں نے پہلے کی طرح کودنے اور اچھلنے کی کوشش کی مگر میں کامیاب نہ ہوسکی۔ جیسے میں سب بھول گئی۔ میں نے دوڑنے کی کوشش کی مگر مجھ سے دوڑا نہیں گیا۔ کوئی مزہ، کوئی دلچسپی، کوئی خوشی مجھے نہیں ملی۔ جیسے ساری خوشی سارا مزہ ٹامی کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ ممی تیز تیز قدموں سے چلنے لگیں مگر میری چال کچھوے کی چال بھی نہیں رہی۔ وہ تو چیونٹی کی چال میں بدل گئی۔ ممی نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور خود بھی اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ وہ میرے ساتھ میری چال چلنے لگیں۔ پارک کے ایک ایک گوشے میں ٹامی کی یادیں بسی ہوئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا ابھی وہ اچھلتا کودتا ہوا دکھائی دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا ٹامی تو مر چکا تھا۔ وہ تو میرے پاس اس کی یادیں تھیں جو اس کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ ایک دم سے سامنے وہ جگہ آ گئی جہاں مجھے ٹامی کا مردہ جسم ملا تھا، میرے قدم رک گئے۔ میں ساکت کھڑی رہ گئی۔ ممی بھی خاموش کھڑی رہ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں؟ میں آگے بڑھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ ممی مجھے دھکے مارتی ہوئی زبردستی وہاں سے لے گئیں۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ جب میں اس مخصوص جگہ پر پہنچی تو حیران رہ گئی وہاں ٹامی کھڑا گاجر کھا رہا تھا۔ سفید سفید خوبصورت سا ٹامی۔ مجھ کو دیکھ کر وہ اچھل پڑا اور پہلے کی طرح دوڑتا ہوا آیا اور میری گود میں سوار ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا ٹامی مجھ کو واپس مل گیا۔ ہو بہو ویسا ہی، ویسی ہی حرکتیں کرتا ہوا۔ میری سب دوستیں بھی وہاں پر موجود تھیں اور تالیاں بجا رہی تھیں۔ ممی اور ڈیڈی نے ایک بار پھر میری سالگرہ پر خرگوش ٹامی کا تحفہ دیا، بالکل ویسا ہی ٹرینڈ کر کے جیسا پہلے والا ٹامی تھا۔ میرا سارا غم غائب ہو گیا اور خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ بہت دن بعد میں اتنا خوش ہوئی تھی۔ میں ممی ڈیڈی کی بہت شکر گزار تھی جن کی وجہ سے ٹامی مجھ کو دوبارہ مل گیا تھا۔ میں ٹامی کو گود میں اٹھائے اپنی دوستوں اور ممی کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گئی جہاں میری سالگرہ کا ایک بڑا جشن میرا انتظار کر رہا تھا۔

◆÷◆

تصور اور حقیقت

سبحان ضمیرا سے بہت دور بیٹھا تھا مگر وہ اس کو لگا تار گھورے جا رہی تھی۔ اس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ سبحان ہو سکتا ہے؟ پتا نہیں اس نے اس کو دیکھا تھا یا نہیں۔ اگر وہ اس کو دیکھ بھی لیتا تو پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ انہیں ایک دوسرے کو دیکھے اور ملے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ وہ تو بہت بدل گئی تھی۔ پہلے وہ بہت خوبصورت سی دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔ اب وہ اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ اپنی عمر سے بہت بڑی لگ رہی تھی اور موٹاپے کی وجہ سے اس کی شکل وصورت بھی بدل چکی تھی۔ جس نے بھی اس کو تیس سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ اب اس کو مشکل سے پہچان سکتا تھا اور سبحان سے اس کو بچھڑے ہوئے تیس سال ہو چکے تھے۔ وہ دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے دونوں میں بہت دوستی تھی۔ کب دوستی عشق ومحبت میں بدل گئی ان کو پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں کا تعلیم ختم کرنے کے بعد شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ اچانک وہ اس کو بتائے بغیر بیرون ملک چلا گیا اور اپنے وعدے اپنی محبت بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کو دے گیا صرف اپنی یادوں اور بے وفائی کی گھٹن اور تڑپ۔ وہ اس کا انتظار نہیں کر سکی اور کس بھروسے پر کرتی، اگر اس نے اس کو انتظار کرنے کو کہا ہوتا تو شاید وہ کر بھی لیتی، مگر اس نے اس سے نہ تو ایسا کوئی وعدہ لیا تھا اور نہ خود کیا تھا۔ اس نے بھی اس کا انتظار نہیں کیا، اس کو جیسے ہی دوسرا آدمی ملا اس نے فوراً شادی کر لی۔ ان کے خواب ادھورے رہ گئے۔ آج بہت عرصے کے بعد وہ اپنے شہر آئی تھی تو وہ بھی موجود تھا۔ اس کی عمر بڑھ گئی تھی، مگر وہ اب بھی ویسا ہی ہینڈسم تھا۔ اس نے ایک دوبار اس پر نظر ڈالی مگر وہ نظر اجنبیت لیے ہوئے تھی۔ جان پہچان کا اس میں کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جان پہچان تو اس کے وزن کے نیچے دب گئی تھی جس سے صورت وشکل بھی بدل گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اچانک سبحان اس کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ اس کو بہت دھیان سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ضمیرا ہے؟ اس نے سوچا کہ وہ ضمیرا ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ وہ

اتنی بدل جائے گی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس نے سوچا کہ اس سے ملنا چاہیے، مگر سوال یہ اٹھتا تھا کہ کیا وہ اس کو پہچان جائے گی؟ بہت وقت گزر گیا تھا اس گزرے ہوئے وقت کے پاس ہی اس کے پیار کی یادیں اور نشانیاں تھیں۔ کیا وہ اس کو دیکھ کر ایک بار پھر وہ ان یادوں ان نشانیوں میں چلی جائے گی؟ اس نے اس کو کتنا چاہا تھا کتنا پیار کیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس کو بتائے بغیر اچانک وہ بیرون ملک چلا گیا تھا، مگر اس کے بغیر رہ نہیں پایا تھا اس کی یادوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، اس کی یادیں اس کو ہر وقت بے چین رکھتی تھیں۔ وہ گھبرا کر اس کے لیے واپس آ گیا تھا مگر جب وہ واپس آیا تو زیادہ دیر نہ ہوتے ہوئے بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی۔ وہ کتنی بے وفا تھی۔ اس نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کے جاتے ہی شادی کر لی۔ وہ اپنی پہلی محبت کا درد لے کر بیرون ملک واپس چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ اس نے جب اس کو دیکھ ہی لیا ہے تو اس سے ملنے میں کیا حرج ہے؟ اس کو اس سے پوچھ لینا چاہیے کہ کیا وہ ضمیرا ہے؟ اگر وہ ضمیرا ہوگی تو اس سے مل کر اس کو بہت خوشی ہوگی۔ اپنے تصور سے واپس آ کر اس نے جب اس جگہ پر نظر ڈالی تو وہ جگہ خالی تھی وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ حیران رہ گیا اس نے سوچا کہ کیا اس کے تصور کی آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کوئی حقیقت نہیں صرف ایک خیال تھی۔ شاید تصورات کی پرچھائیاں ضمیرا بن کر ایک مدت کے بعد اس کے سامنے آ گئی تھیں۔ اس نے پھر سوچا کہ اگر وہ صرف ایک خیال تھی تو اس کے تصور نے اس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا کر دی تھی۔ وہ اتنی بڑی اور اتنی زیادہ عمر کی کیسے ہوگئی تھی؟ اس کو تو تصور میں بھی ویسی ہی دبلی پتلی، ویسی ہی نازک سی، خوبصورت سی، جوان ہونا چاہیے تھی جیسی وہ پہلے تھی۔ جب وہ اس کی تھی۔ اس کا پیار تھی۔ جب وہ دونوں ایک ساتھ تھے۔ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ اپنے شہر میں آ کر اس کو اچانک اتنے عرصے کے بعد اگر وہ یاد آ گئی تھی تو اس کے خیالوں میں اس کی شکل کیوں بدل گئی تھی؟ دل نے سوال کیا، کیا وہ اب ایسی ہوگی؟ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مل جائے تو وہ کیسی ہوگی؟ ایک مدت کے بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ آنا تو اس کو ایک ہفتے بعد تھا مگر وہ ایک ہفتہ پہلے ہی آ گیا تھا۔ وہ لگا تار اس کے بارے میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اس کو جب وہ چھوڑ کر گیا تھا تو وہ کیسی تھی اب وہ کیسی ہوگی؟ وہ بیرون ملک سے اپنی لڑکی سے ملنے آیا تھا۔ اس کی لڑکی نے اس بیرون ملک میں پڑھنے آئے ہوئے ایک لڑکے سے شادی کر لی تھی جو اتفاق سے سبحان کے ملک اور سبحان کے

شہر کا تھا۔ اس کی لڑکی اس لڑکے کے ساتھ واپس اپنے وطن اور اپنے شہر میں آ گئی تھی۔ اس کو اپنی بیٹی سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے تین بچے بھی ہو گئے تھے۔ وہ ان بچوں سے اور اپنے داماد کی فیملی سے ملنے آیا تھا جن سے وہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس کے ریسٹورینٹ میں کھانا کھا کر وہ باہر چلا گیا جہاں اس کی بیٹی داماد اور اس کی فیملی ملنے آنے والی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر آیا اس نے دیکھا وہ بھی باہر کھڑی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک دم سے سبحان نے کہا۔ ''ارے تم سچ مچ ہو۔ میں نے تم کو حقیقت میں دیکھا تھا۔ تم جب اندر نہیں دکھائی دیں تو میں سمجھا کہ شاید وہ میرا تصور تھا مگر تم تو حقیقت نکلیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اسی لیے وہاں سے چلی آئی تھی کہ کہیں تمہارا خوبصورت تصور حقیقت کا سامنا نہ کر لے اور تمہارا تصور حقیقت سے ٹکرا کر چکنا چور نہ ہو جائے۔ ویسے بھی تمہاری بے وفائی نے میرا دل توڑ دیا تھا۔''

''تعجب ہے کہ بے وفائی کا الزام میرے سر پر ہے۔ اپنے دل سے پوچھو کون وفادار ہے اور کون بے وفا۔''

اس نے جواب دیا۔ ''تمہاری بے وفائی حقیقت تھی جو میری وفا میری محبت سے ٹکرا گئی تھی۔''

''مگر میں سمجھتا ہوں کہ بے وفا تم نکلیں۔ میں اچانک دوسرے ملک چلا گیا تھا مگر میری زندگی محبت کا درد اور جدائی سہ نہیں پائی اس لیے میں فوراً واپس آ گیا تھا مگر اس وقت تم شادی کر چکی تھیں۔''

''تم اچانک بغیر بتائے چلے گئے تھے مجھ سے ملے بغیر۔ تم نے جاتے وقت کوئی امید بھی نہیں دلائی تھی۔ میں سمجھی تمہاری محبت جھوٹی تھی۔ ایک فریب ایک دھوکا تھی۔ اس لیے تمہارے جاتے ہی مجھے جیسے ہی دوسرا آدمی ملا میں نے فوراً شادی کر لی۔''

وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے مصروف تھے کہ ان کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب ایک وین ان کے قریب آ کر رکی۔ سبحان وین کو نہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ اس کی پیٹھ ادھر تھی۔ وین سے تین چھوٹے چھوٹے بچے اترے اور دادی کہہ کر ضمیرا سے چمٹ گئے۔ وہ بہت خوش ہوئی اور ان کو پیار کرنے لگی۔ سبحان نے کہا۔ ''تمہارے پوتے پوتی ہیں۔ بہت پیارے ہیں۔'' اتنے میں ایک عورت اور ایک آدمی بھی وہاں پہونچ گئے۔ عورت کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ وہ اس کی بیٹی تھی۔ اس نے سوچا کہ کیا اس کا داماد ضمیرا کا بیٹا ہے؟ وہ بہت خوش ہوا۔ ضمیرا نے بھی چونک کر دیکھا، جب اس

کی بہو پاپا کہہ کر سبحان سے چمٹ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ''ضمیرا ہم لوگ کتنے عرصے کے بعد ملے ہیں، مگر ایک نئے رشتے کے ساتھ۔ پہلا رشتہ تو ہم لوگوں کی بے وفائی پر ختم ہو گیا۔ اگر پہلا رشتہ نہیں ہوا تو کیا ہوا اب ہمارا ایک نیا رشتہ ہے جس میں نہ وفا ہے اور نہ بے وفائی۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب آ گئے جتنے پہلے تھے۔ اب ہم کو اجنبی بننے یا اجنبی بنے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے بچوں اور ان کے بچوں نے ہمیں ایک بار پھر ملا دیا۔''

وہ حیرت سے اس کی بات سنتی رہی اور اس نئے رشتہ کی اہمیت اور عزت اس کی نظروں میں بڑھ گئی، کیونکہ تصور تصور ہی رہا اور حقیقت ایک نئے انداز کے ساتھ ان کے سامنے جلوہ گر ہو گئی تھی۔

◆ ÷ ◆

ننھی کی خوشی

ننھی ایک دلت اور اچھوت تھی۔ اس کا تعلق ہندو مذہب سے تھا اور وہ مہترانی یا جمعدارنی کا کام کرتی تھی۔ گھر گھر جا کر صفائی اور ٹوائلٹ صاف کرتی تھی۔ مگر اس کا رعب ایسا تھا کہ جیسے مہترانی نہیں رانی ہو۔ سب بڑے بڑے گھروں کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ کہیں خفا ہو کر ان کا گھر نہ چھوڑ دے، کام کرنا بند نہ کر دے۔ جب وہ کام کرنا بند کرتی تھی تو کسی دوسری مہترانی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے چھوڑے ہوئے گھر میں کام کر سکے۔ وہ ان کا حقہ پانی بند کروا دیتی تھی۔ لڑائی جھگڑا مار پیٹ الگ کرتی تھی۔ ایک طرح سے وہ ان بڑے گھر کے لوگوں کو سزا دیتی تھی اور ستاتی تھی، یا پھر بلیک میل کرتی تھی۔ جس گھر سے چاہتی تھی دال چاول، روٹی یا پورا کھانا مانگ لیتی تھی اور جب چاہتی اپنی تنخواہ بڑھوا لیتی تھی۔ مہترانی ہو کر بھی اس کے بہت عیش تھے۔ سب ہی بڑے لوگوں کو وہ بہت بری لگتی تھی خاص کر عورتیں اس سے بہت چڑتی تھیں۔ ستاتی بھی وہ عورتوں ہی کو تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ کام بھی وہ بہت اچھا اور صفائی سے کرتی تھی۔ دوسری مہترانیاں اس کے جیسا کام نہیں کرتی تھیں۔ بہت خراب اور بہت گندگی سے کام کرتی تھیں، اسی لیے بڑے گھر کی عورتیں اس کی ہر جائز اور ناجائز بات مان لیتی تھیں۔

امیرہ سے اس کی بہت بنتی تھی۔ وہ جب بھی اس کے گھر آتی تھی تو پینے کے لیے فریج کا پانی اور پان اسی سے مانگتی تھی۔ پانی وہ چھوتی نہیں تھی۔ اپنے ہاتھ کو گندہ اور نجس مانتی تھی۔ وہ اپنا منہ کھول دیتی تھی اور وہ دور سے اس کے حلق میں بوتل سے پانی انڈیلتی تھی۔ دوسرے لوگ اس کو پانی پلاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کہیں پانی حلق میں پھنس نہ جائے۔ گھر میں سب ہی لوگ امیرہ کا مذاق اڑاتے تھے کہ مہترانی نے اس گھر میں اپنے لیے ایک خدمتگار رکھ چھوڑا ہے۔ وہ بھی ننھی سے بہت گھبراتی تھی۔ زیادہ تر اس کے آنے سے پہلے وہ چھپ جاتی تھی یا گھر سے باہر چلی جاتی تھی۔

امیرہ کو کتابیں پڑھنا اور بچے بہت پسند تھے۔ وہ ایسے ہی گھروں میں جانا پسند کرتی تھی جہاں گود میں اٹھانے والا بچہ ہو، کتابیں ہوں یا دونوں ہوں۔ وہ اپنی دوستوں، رشتہ داروں اور محلے میں انہیں دونوں چیزوں کی وجہ سے جاتی تھی۔ محلے کے بچوں والے گھروں میں اس نے کہہ دیا تھا کہ اپنا بچہ اس کے پاس بھیج دیا کریں اس کو خوشی ہوگی۔ ہر گھر سے بچہ تیار کر کے اس کے پاس بھیجا جانے لگا۔ ماں باپ کو اگر کہیں جانا ہوتا تھا اور گھر میں کوئی اور بچے کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہوتا تھا تو بچہ اس کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ وہ خوشی سے ناچ اٹھتی تھی۔ بچہ اس وقت تک گود میں اٹھائے رہتی جب تک ماں باپ آ کر لے نہیں جاتے تھے۔ اس کی معصوم سی دنیا ہر مذہب کے معصوم بچوں سے آباد تھی۔

ننھی کو اس کی یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ اکثر اپنی پوتی کو بھی لاتی تھی۔ وہ اس سے بھی دور سے بات کرتی اور کھیلتی تھی۔ وہ جمعدارنی کی لڑکی تھی اس لیے اس کو گود میں نہیں لیتی تھی۔ ننھی کہتی تھی۔ ''بٹیا اس کو ایک دن نہلا دھلا کر خوب تیار کر کے لائیں گے تب آپ اس کو اپنی گود میں لیجیے گا۔'' یہ بات سن کر اس کی بہنیں خوب ہنستی تھیں، مذاق اڑاتی تھیں اور کہتی تھیں۔ ''دیکھو اس کی پوتی کب تیار ہو کر لائی جاتی ہے۔'' بھائی مذاق میں کہتے۔ ''سوچو ننھی کی پوتی اس کی گود میں ہے اور یہ اس کو ٹہلا رہی ہے اور لوری گا گا کر اس کو سلا رہی ہے۔'' اس بات پر سب ہی زور زور سے ہنستے تھے۔ مگر وہ کسی سے کہہ نہیں پاتی تھی کہ بچہ بچہ ہی ہوتا ہے چاہے وہ کسی کا ہو اس کو بہت پیارا لگتا ہے۔ مگر دلت، اچھوت اور مہتر آج بھی سماج میں حقیر سمجھے جاتے ہیں چاہے وہ بچہ ہو، بوڑھا ہو یا جوان ہو۔ مہتر یا جمعدار کسی چیز کو چھو نہیں سکتے تھے اور نہ مہتر یا جمعدار کی چیز کوئی چھوتا تھا۔ کسی بڑے گھر میں جمعدارنی کا بچہ گود میں اٹھانے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اسی لیے مہترانی یا جمعدارنی کی بات کو سب مذاق سمجھتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے۔ سب سمجھتے تھے کہ مہترانی اپنی اوقات جانتی ہے کبھی بھی اپنا بچہ بڑے گھر کی بیٹی کو گود میں اٹھانے کے لیے نہیں کہے گی۔

اس کے گھر کی سلائی مشین بہت پرانی ہو گئی تھی گھر میں نئی مشین آ گئی۔ جو لڑکیاں پرانی مشین سے گھبراتی تھیں وہ بھی نئی مشین پر سلائی سیکھنے بیٹھ گئیں۔ اس کو بھی سلائی کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ مگر کوئی اپنا کپڑا سلوانے کے لیے اس کو نہیں دیتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اس کو سلائی نہیں آتی ہے اور وہ کپڑا خراب کر دے گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بغیر کچھ سلے وہ سلائی کرنا کیسے

سیکھے گی۔ ایک دن ننھی کپڑا لے کر آ گئی اور اس سے بولی۔ ''بٹیا ہماری پوتی خوشی کی فراک سل دیجیے۔'' وہ ڈر گئی اس سے زیادہ اس کی امی ڈر گئیں۔ اگر کپڑا خراب ہو گیا تو ننھی نہ صرف گھر چھوڑ دے گی۔ بلکہ ہنگامہ بھی کھڑا کر دے گی اور گھر کی صفائی مسئلہ بن جائے گی۔ انہوں نے منع بھی کیا کہ اس کو سلائی کہاں آتی ہے مگر ننھی کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ ننھی کا اعتماد دیکھ کر اس کو بہت خوشی ہوئی اور اس نے وہ کپڑا لے لیا۔ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی اور اس کو سلائی کرنے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ بغیر کسی سے پوچھے سلائی کرنے بیٹھ گئی۔ پروفیشنل لوگوں کی طرح کتابوں سے نئے نئے ڈیزائن دیکھنے لگی اور اس نے بہت محنت سے بغیر کسی کی مدد کے اسی کپڑے سے ایک کے بجائے دو دو بہت خوبصورت سی فراکیں سل دیں۔ پہلی بار کی سلائی، وہ بھی اتنی خوبصورت اس کی تعریفوں اور ٹیلنٹ کی دھوم مچ گئی۔ اس کو ہر فن مولا اور جینیس کا خطاب مل گیا۔ ننھی نے جب وہ فراکیں دیکھیں تو بہت خوش ہوئی اور امی سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ آپ بیکار میں ڈر رہی تھیں ہمیں معلوم تھا بٹیا بہت اچھی سلائی جانتی ہیں۔ اگر درزی سے سلواتے تو وہ صرف ایک ہی فراک سیتا اور باقی کپڑا رکھ لیتا۔ اتنی خوبصورت فراکیں بھی نہیں سیتا، اب میں ایک فراک اپنی نواسی کو دے دوں گی۔''

اس کی تعریف کرتی ہوئی ننھی اس دن اس کو بہت اچھی لگی۔ اس کو لگا کہ جیسے اس کے اور ننھی کے بیچ کی ساری حقارت اور سارے فرق دور ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی ننھی اپنی پوتی کو نہلا دھلا کر اس کی سلی ہوئی فراک پہنا کر لے آئی اور آتے ہی اس سے کہا۔ ''بٹیا ہم نہلا دھلا کر اپنی پوتی خوشی کو لائے ہیں لیجیے آج اس کو بھی آپ اپنی گود میں کھلایئے۔'' وہ ہی نہیں سب لوگ دنگ رہ گئے۔ مہترانی کے بچے کو گود میں لینا آسان کام نہیں تھا، دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔ ان سے تو گھن اور چھوا چھوت کا رشتہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ ان کو چھونا یا ان کی چھوئی چیز کو کھانا پورے سماج میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لائے ہوئے کپڑے کی فراک سینا بھی کوئی اچھی بات نہیں تھی نہ کہ اس کا بچہ کھلانا، کسی نے نہ کبھی دیکھا تھا، نہ سنا تھا اور نہ سوچا تھا۔ امی گھبرا گئیں کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو کیا ہو گا۔ بدتمیز عورت ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اس کی بہنیں اور گھر کے دوسرے لوگ ننھی کے سامنے ہی گھناتے ہوئے بھاگے۔ مگر ننھی کی آنکھوں اور چہرے پر اتنا یقین اور خوشی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی اور اس نے جھٹ سے خوشی کو اپنی گود میں لے لیا۔

ممانی نے غصے سے کہا۔ ''اب صرف مہترانی ہی کے بچے رہ گئے تھے اٹھانے کے

لیے۔ ہمارے کمرے میں اس کو لے کر مت آنا۔‘‘ سب کی گھن اور غصہ دیکھ کر اس کو لگ رہا تھا جیسے اس نے مہترانی کی پوتی نہیں اس کا جھوٗا یا بالٹی اٹھالی ہو جن کو لے کر وہ صفائی کرنے آتی تھی۔ اس نے کسی کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ خوشی کو گود میں اٹھائے اس سے باتیں کرتی رہی اور وہ آٹھ نو مہینے کی بچی ہنستی رہی۔ ننھی سی خوشی ایسا ہنس رہی تھی جیسے اس کو بہت بڑا اعزاز حاصل ہو گیا ہو، بہت بڑا فخر مل گیا ہو۔ ایک بڑے گھر کی بٹیا اس کو گود میں اٹھا کر پورے گھر میں گھما رہی تھی اس کو بہت پیار دے رہی تھی۔ بڑے گھر کے لوگ تو اسے حقیر سمجھتے تھے۔ اس کو غلاظت اور گندگی سمجھتے تھے اس کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے گھر کی گندگی اور غلاظت وہی لوگ اٹھاتے تھے جمعدار اور جمعدارنی بن کر۔ سب بچے اور گھر کی عورتیں کمرے میں ہی چھپی رہیں۔ اس کو بھی خوشی کو لے کر کمروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی جیسے وہ بھی اچھوت ہو گئی ہو۔ دلت ہو گئی ہو۔ مگر اس کو پروا نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ننھی بہت متاثر تھی۔ پہلی بار اس کا بچہ کسی بڑے گھر کی بیٹی کی گود میں تھا جیسے صدیوں کی غلاظت اور گندگی اس کی زندگی سے نکل گئی ہو جو پیدائش کے وقت سے ہی زندگی اور سماج نے اس پر لاد رکھی تھی۔ وہ بہت دیر تک خوشی کے ساتھ کھیلتی رہی باتیں کرتی رہی اس کو ہنساتی رہی۔ زور زور سے ہنستی خوشی کو دیکھ کر ننھی کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ننھی کی اس خوشی کو صرف دیکھا جا سکتا تھا، محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کی گود میں بیٹھی ہوئی ننھی کی پوتی خوشی ہی نہیں ہنس رہی تھی ننھی کے چہرے پر بھی خوشی ہنس رہی تھی۔

◆ ÷ ◆

رشتہ اور انتظار

برسوں پہلے کے واقعے کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ واقعہ جو صرف وہ جانتی تھی۔ جب اس کی بیٹی روبینہ نے کہا کہ وہ اپنے کولیگ ناشب سے شادی کرنا چاہتی ہے وہ اس کا کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ وہ چپ ہوگئی۔ اصل میں بات یہ تھی کہ روبینہ کا بہت اچھا رشتہ آ گیا تھا۔ اب وہ اپنی پڑھائی کو ختم کر کے اپنی زندگی کو سیٹ بھی کر چکی تھی۔ بہت مناسب وقت پر بہت مناسب جگہ سے بات آئی تھی۔ روبینہ کی بات سن کر اس کو حیرت نہیں ہوئی۔ برسوں پہلے یہی بات اس کے دل میں بھی تھی جب اس کا رشتہ آیا تھا مگر اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے یہ بات کہہ سکتی۔ صرف اس سے ہی بات کی تھی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ رشتہ لے کر آ جائے۔ وہ اس کے رشتے کے لیے ہاں کر کے اپنی رائے کا اظہار کر دے گی۔ وہ دونوں بھی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے مگر وہ کتنا بزدل یا حالات کا شکار نکلا۔ آنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا اور اس کی شادی دوسری جگہ ہوگئی۔ وہ انتظار کرتی رہ گئی۔ شاید دل کے کسی کونے میں وہ آج بھی انتظار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں روبینہ کے ساتھ بھی یہی نہ ہو وہ انتظار کرتی رہ جائے اور اس کی محبت کا دم بھرنے والا غائب ہو جائے مگر وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ اگر وہ نہیں آیا تو وہ خود اس کو لائے گی۔ کہیں اس کی امیری سے مایوس ہو کر وہ عمیر کی طرح واپس ہی نہ آئے۔ عمیر اور وہ ایم اے میں ایک دوسرے کے کلاس فیلو تھے۔ وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کلاس میں، کیفے ٹیریا میں، پارکوں میں، ریسٹورینٹ میں۔ غرض کہ یونیورسٹی میں ہر ایک کو ان دونوں کی دوستی اور پیار کا علم تھا۔ اس کو پتا نہیں اس میں کیا خوبی دکھائی دی تھی کہ وہ اس کی ہوگئی تھی۔ اس کو دنیا کی ہر چیز اس کے آگے پھیکی دکھائی دیتی تھی۔ وہی اس کو آنے والی زندگی کا ہمدم اور ساتھی دکھائی دیتا تھا۔ ویسے وہ بہت اسمارٹ لڑکا تھا، پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ ان دونوں کے بیچ طبقے کا فرق تھا، مگر اس کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے ماں باپ

کی اکلوتی لڑکی تھی۔ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ رکھی نہیں جاتی تھی۔اتنے اعلیٰ کردار کا لڑکا اگر اس سے شادی کر لیتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔وہ اپنے پیار کی دنیا میں مگن تھی۔عمیر بہت اچھا اس کی زندگی کا ساتھی بن سکتا تھا۔آخر وہ لوگ بی اے سے ایک ساتھ دوستی اور پیار نبھاتے چلے آرہے تھے۔ان کی کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں تھی۔وہ ایک دوسرے کے خاندان سے نہیں ملے تھے،مگر ان کا ایک دوسرے کے خاندان سے غائبانہ تعارف تھا۔عمیر چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔والد صاحب بھی اچھی پوسٹ پر تھےاور ماں ہاؤس وائف تھیں جیسا کہ قریب قریب ہر گھر میں ہوتی ہیں۔اس کی ممی ذرا مختلف تھیں۔ان کو اپنے اسٹیٹس یا طبقے کا بہت لحاظ رہتا تھا۔ان کی زندگی پکنک پارٹی اور ملنے ملانے میں گزرتی تھی۔زیور، کپڑے اور گھر کا اعلیٰ سامان خریدنا، گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا کرنا ہی ان کے شوق تھے۔جن پر وہ حد سے زیادہ پیسہ خرچ کیا کرتی تھیں۔ممی اور اس کے خیالات میں اتنا فرق تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی دوست نہیں بن سکیں کیونکہ وہ ماں کم اور ڈکٹیٹر زیادہ تھیں اور اپنی اکلوتی بیٹی پر بھی اپنا رعب اور دبدبہ رکھے ہوئے تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا عشق ان کے علم میں نہیں تھا جیسے روبینہ کا تھا اور اس نے ہامی بھی بھر دی تھی کہ وہ اس کو اور اس کی فیملی کو بلا لے مگر پھر بھی ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ بھی اس کی طرح انتظار نہ کرتی رہ جائے۔

وہ اور عمیر زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلے جارہے تھے زندگی کے بہت سے منصوبے لیے ہوئے مگر جب اس کا امتحان ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ عمیر کو ابھی زندگی میں بہت آگے جانا ہے،اس کو نوکری تلاش کرنی ہے تب ہی وہ شادی بیاہ کے مرحلے حل کرسکتا ہے۔وہ اگر اپنے گھر پر اپنی شادی کی بات کرتا تو بہت عجیب لگتا۔اب اس کے والد کی اتنی آمدنی بھی نہیں تھی کہ وہ عمیر کی شادی کر کے اس کی فیملی کا بوجھ بھی اٹھاتے۔ویسے بھی صرف ایم اے پاس کو کہاں اتنی جلدی نوکری ملتی ہے۔اگر مل بھی گئی تو کیسی نوکری ملے گی جو اس کے خاندان سے ٹکّر لے سکے گی۔کوئی پروفیشنل ڈگری ہوتی تو چلو سال دو سال انتظار کیا جاسکتا تھا اور ترقی کی کوئی امید ہوتی۔سمیرا کو بس سہارا تھا تو اپنی دولت اپنے خاندانی بزنس کا جو عمیر کو سنبھال سکتے تھے۔ان کے خواب کو پورا کر سکتے تھے اور چٹ منگنی پٹ بیاہ بھی کروا سکتے تھے۔مگر اس کے گھر والے اتنے سخی دل اور سخی حاتم نہیں تھے۔اگر وہ ایسا رشتہ پا جاتے تو بہت دور اٹھا کر پھینک دیتے۔اب اس کی پڑھائی ختم ہوگئی تھی اور اس کے

بہت سے رشتے آ رہے تھے اور جن پر غور بھی کیا جا رہا تھا۔ جب اس کی شادی کہیں اور طئے کی جا رہی تھی تو امید کی ایک چھوٹی سی کرن جگمگائی تب ہی تو اس نے عمیر سے رشتہ لانے کو کہا تھا۔ وہ انتظار کرتی رہ گئی، مگر وہ آج آتا ہے اور نہ کل۔ آنے والے آئے اور رشتہ طئے کر گئے۔ پھر اس کی شادی ہوگئی۔ اس نے پھر کبھی عمیر کو نہیں دیکھا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس دن وہ ایک بڑے ریسٹورینٹ میں اس فیملی کا انتظار کر رہی تھی جو رومینہ کا رشتہ لانے والی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی تب ہی کسی کی آواز نے اس کو چونکا دیا وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں رشتہ لایا ہوں۔''

اس نے چونک کر دیکھا تو وہ عمیر تھا۔ اس کے ساتھ اس کے جیسا ایک خوبصورت اور ہینڈسم نوجوان بھی تھا۔ اس نے عمیر کو دیکھا اور کہا۔ ''بہت جلدی رشتہ لائے ہو چلو آئے تو۔ مگر کچھ دیر تو نہیں ہوگئی یعنی لیٹ تو نہیں ہو گئے۔''

وہ جھینپ کر بولا۔ ''سمیرا! یہ رشتہ لیٹ نہیں ہے وقت پر آیا ہے۔ ٹکّر کا ہے۔ رشتہ لانے کی تب ہی ہمت کی جب میں بھی تمھارے برابر کا ہو گیا۔ اب انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اسٹیٹس میں نہ تعلیم میں اور نہ نوکری میں۔''

اس نے ناراضگی کے ساتھ کہا۔ ''برسوں پہلے بھی رشتہ لانا تھا آج لوٹے ہو رشتہ لے کر۔''

اس نے کہا۔ ''برسوں پہلے بھی آیا تھا ایک غریب باپ کا غریب بیٹا۔ جو ایم اے پاس تھا اس کے پاس نہ تو نوکری تھی اور نہ ہی کوئی اسٹیٹس۔ مگر تمہارے کہنے پر آیا تھا محل دیکھ کر قدم ڈگمگا گئے۔ محل کے سامنے کھڑی کاروں کی قطاریں دکھائی دیں۔ آگے پیچھے لگے ہوئے تمہارے ماں باپ دوسرے ماں باپ کے ساتھ دکھائی دیے۔ چوکیدار سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ تمھارا رشتہ طئے ہو گیا ہے اور منگنی بھی اسی وقت ہوگئی۔ دونوں خاندان بہت خوش نظر آ رہے تھے میں واپس چلا گیا۔ اپنے ماں باپ کو راضی کرتے کرتے تھوڑی دیر ضرور ہوگئی تھی۔ میرے ماں باپ کے پاس ذمہ داریاں کتنی تھیں۔ چار بیٹیوں کو پالنا، تعلیم دلوانا، اور شادی کرنا۔ میں اس وقت پیدل، بے کار اور غریب انسان تھا۔ دیکھتا رہ گیا آگے نہ بڑھ سکا۔ آگے بڑھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بری طرح دھتکار دیا جاتا دو ٹکّر کے خاندان ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ میرے آگے بڑھنے اور کچھ کہنے میں اب بہت رسوائی تھی۔ مجھے اپنی فکر نہیں تھی مگر مجھے تمہاری رسوائی ہو وہ بھی میرے وجہ سے یہ

بات گوارا نہیں تھی۔ میں نے تم سے پیار کیا تھا سچا پیار۔ اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا پیار تمہاری رسوائی کا سبب بن جائے۔ تم کو میں دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا، میری چاہت بے غرض تھی اور تم میری پہونچ سے بہت دور جا چکی تھیں۔ اب تمھاری واپسی میری زندگی میں ناممکن تھی۔‘‘

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ بھی کچھ نہیں بولی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد عمیر نے کہا۔ ’’یہ ناشب ہے میرا بیٹا، آج ہی رومینہ نے رشتہ لانے کو کہا۔ میں جلدی سے آ گیا کہ کہیں پہلے کی طرح دیر نہ ہو جائے۔ اب میرے حالات بدل چکے ہیں۔ کم از کم میرا بیٹا تو تمہاری بیٹی سے ٹکّر لے سکتا ہے اسی لیے رشتہ لے کر چلا آیا۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ رشتے داری تم سے ہو گی اور برسوں پہلے کا کوئی قرض اتارنا ہو گا۔‘‘

وہ ہنس دی۔ کچھ دیکھنا بھالنا تو تھا نہیں۔ اسی وقت رشتہ طے ہو گیا۔ سمیرا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ رومینہ اس کی طرح اپنے من پسند رشتے کا انتظار نہیں کرتی رہ گئی۔ اس کو اپنی مراد اپنا پیار مل گیا وہ بھی عمیر کے گھر سے جو اس کا انتظار بن گیا تھا ہمیشہ کے لیے۔

◆÷◆

پیا کا دیس

یہ اجالا کی شادی کا دن تھا۔ مراثنیں ڈھولک پر اپنی زوردار آواز میں گا رہی تھیں۔ ''لے بابل گھر اپنا میں چلی پیا کے دیس۔'' دلہن بنی اجالا اداس ہوگئی۔ سب ہی لڑکیاں خوشی خوشی اس گانے پر ناچ رہی تھیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس گانے میں کتنا درد کتنا سوز چھپا ہوا تھا۔ اس کی نظر اپنی امی پر پڑی جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ اس گانے کا درد یا تو وہ سمجھ رہی تھی یا امی۔ گانے کا درد اس کے دل پر غم بن کر گر رہا تھا یا امی کی آنکھوں کا درد بن گیا تھا۔ اس کو رخصت ہو کر صرف اپنا گھر اپنے گھر والے ہی نہیں چھوڑنے تھے اپنا دیس، اپنا ملک بھی چھوڑ کر جانا تھا۔ اس کا شوہر شمال اپنا وطن چھوڑ کر اب دوسرے دیس کا ہو گیا تھا۔ اس کو بھی اس کے ساتھ اس اجنبی دیس میں جانا تھا اور اکیلے جانا تھا کیونکہ وہ شادی کے فوراً بعد واپس چلا جائے گا۔ وہاں جا کر وہ اس کے ویزے کا انتظام کر کے اس کو بلا لے گا۔ وہ ابھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ اتنی دور اکیلے جانے کے خیال سے ہی وہ خوفزدہ تھی۔ اکیلی کبھی وہ اپنے شہر کی بھی کسی جگہ نہیں گئی تھی۔ جب بھی وہ کہیں جاتی تھی تو کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی امی، بہنیں یا دوستیں وغیرہ۔ وہ سوچتی تھی کہ کتنا اچھا ہوتا کہ اس کا شوہر شمال اسی شہر میں رہتا ہوتا۔

جب اس کی شادی طئے ہوئی تھی تو وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ اس کی سسرال اسی کے شہر میں ہے۔ اس کے ساس سسر دیور نندیں اور دوسرے رشتہ دار بھی اسی شہر میں رہتے تھے۔ اسے سب کے ساتھ رہنے میں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی تھی کہ رخصتی کا وقت کتنا دردناک ہوتا تھا۔ ایک ہی شہر، ایک ہی خاندان میں شادی ہوتی تھی مگر رخصتی کا وقت سب کو رلا دیتا تھا۔ رخصتی کے وقت ماں بہنیں دوستیں سب رشتہ دار اور شادی میں آئے ہوئے مہمان سب لوگ روتے تھے۔ سب کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سب لوگ شادی میں سج دھج کر آتے ہیں، کئی دن تک بہت سے

فنکشن ہوتے ہیں، ناچ گانا ہوتا ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق ہوتا ہے، خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر دلہن جب گھر سے رخصت ہوتی ہے تو سماں ہی بدل جاتا ہے۔ بہت دردناک منظر سامنے آتا ہے۔ سب کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو دکھائی دیتے تھے۔ گڑیا کی شادی میں بھی چھوٹی چھوٹی بچیاں جھوٹ موٹ روتیں تھیں مگر گڑیا کبھی رخصت نہیں ہوتی تھی جس کی گڑیا ہوتی تھی وہ لڑکی اپنی گڑیا لے کر بھاگ جاتی تھی۔ یہیں پر شادی کا اختتام ہوجاتا تھا۔ اس نے خود بھی کئی بار اپنی گڑیا کی شادی میں ایسا کیا تھا۔ وہ رخصتی کے وقت اپنی گڑیا لے کر بھاگ جاتی تھی اور اپنے کمرے میں چھپ جاتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ ایک گڑیا ہوتی، اس کی امی اس کو لے کر بھاگ جاتیں کسی کمرے میں چھپ جاتیں۔ اس کو پردیس یا پیا کے دیس نہ جانا پڑتا۔ مگر رخصتی تو ہونا ہی تھی۔ وہ بھی رخصت ہوکر اپنے شوہر شمال کے گھر آ گئی۔ شمال اور اس کے گھر والے بہت اچھے تھے۔ وہ خود بھی بہت اچھی تھی۔ پتا نہیں شمال اتنا پڑھ لکھ کر دوسرے ملک کام کرنے کیوں چلا گیا تھا اور وہیں کا ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد اس کو شمال اپنے خیالوں سے بھی زیادہ اچھا اور عظیم لگا۔ شادی سے پہلے اس نے شمال کو نہیں دیکھا تھا اور نہ شمال نے اس کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنی ماں اور بہنوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی لڑکی دیکھ کر شادی کی تاریخ رکھ لیں کیونکہ وہ صرف ایک مہینے کے لیے آ رہا ہے اور لڑکی ڈھونڈھنے میں وقت نہیں برباد کرنا چاہتا۔ اس کو لڑکی کی تصویر بھیج دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ اس نے اور اجالا نے صرف تصویر دیکھ کر ہی اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ شمال بھی اس کو دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک یا اپنے دیس کی بہت سی باتیں اس کو بتائیں۔ وہاں کی خوبصورت اور مشہور جگہوں کا بہت دلچسپ انداز میں ذکر کیا۔ برف باری کی خوبصورتی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ وہاں فوراً پہونچ جائے اور گرتی ہوئی برف دیکھے کیونکہ اس نے کبھی برف کا گرنا نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس کے بارے میں سنا تھا۔ بس ایک بات اس کو شمال کے دیس کی اچھی نہیں لگی تھی وہ یہ کہ شمال تو نوکری پر چلا جائے گا تو وہ اکیلی وہاں سارا دن کیا کرے گی؟ اس نے یہ بات شمال سے بھی کہہ دی۔ شمال نے کہا۔ ''تم اتنی پڑھی لکھی ہو نوکری کر لینا یا پھر سے پڑھنے چلی جانا کوئی کورس کر لینا۔'' اس کو اس کی یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔ شادی کے ایک مہینے بعد شمال واپس اپنے دیس چلا گیا۔ وہ اپنے دیس میں رہ گئی۔ مگر اب اس کا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ وہ اداس رہنے لگی تھی اس کو اب پیا کا دیس ہی پیارا لگتا تھا۔ شادی سے

پہلے جس دیس سے وہ بیزار تھی اب وہ شمال کی محبت میں جکڑا ہوا نظر آنے لگا۔اس کو بھی اب اپنے پیا کے دیس جانا تھا۔ایک مہینے کے اندر ہی اس کا ویزا آ گیا اور وہ پیا کے دیس جانے کی تیاری کرنے لگی۔جاتے وقت جب پاپا نے اس سے کہا۔''جاؤ بیٹی خدا حافظ۔'' تو اس کو اپنی شادی کا وہ گانا یاد آ گیا۔''لے بابل گھر اپنا میں چلی پیا کے دیس۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔پاپا خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلے گئے شاید ان کا دل بھی بھر آیا تھا،مگر وہ سب کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے اور نہ اس کو زیادہ رلانا چاہتے تھے۔اس کی امی،بہنیں اور دوسرے رشتہ دار اس کے ساتھ رو رہے تھے۔وہ شمال کے دیس پہونچ گئی۔اس کو اپنا دیس بنانے کے لیے۔واقعی میں وہ دیس اس کا بھی ہو گیا وہ اس ملک کی ہو گئی۔وہ بہت خوبصورت جگہوں پر گھومنے گئی۔شمال کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزرنے لگا۔جب بارش کا پہلا چھینٹا پڑا اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کی ناک سے ٹکرائی تو وہ بے چین ہو گئی اس کو یہ خوشبو بہت پسند تھی برسات کا پہلا چھینٹا اس کو بہت پسند تھا جو مٹی کی وہ سوندھی خوشبو لے کر آتا تھا۔وہ بارش کے اس پانی میں نہانے لگتی تھی۔امی لاکھ منع کرتیں تھیں کہ مت نہاؤ بیمار پڑ جاؤ گی۔مگر وہ نہیں سنتی تھی۔امی کو بھی اس کی یہ ادا بہت پسند تھی۔اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دیس میں بھی پہلی بار بارش ہونے سے مٹی کی ویسی ہی خوشبو آ رہی تھی جیسی اس کے گھر اس کے وطن میں آتی تھی۔اس خوشبو اور اس پہلی بارش نے اس کو رلا دیا۔اس کو یقین تھا کہ امی کو بھی وہ خوشبو،وہ بارش کا پہلا پانی اس کی یاد بن کر ان کو بھی ضرور رلا گیا ہو گا۔اس نے اپنی یہ کیفیت امی اور اپنی بہن کو خط میں لکھ دیا۔بہن نے اپنے جواب میں لکھا کہ امی اور ہم لوگ تمھارا خط پڑھ کر بہت روئے تھے۔اس کے بعد برف باری کا زمانہ آ گیا۔اس کو گرتی ہوئی برف بہت پسند آئی۔چاروں طرف برف ہی برف دکھائی دینے لگی۔بغیر پتیوں کے سب درخت سفید ہو گئے اتفاق سے اس سال وائٹ کرسمس ہوا جو وہاں لکی سمجھا جاتا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔مگر بہت جلد ہی وہ برف سے اوب گئی،پریشان ہو گئی۔دو مہینے سے برابر برف باری اب اس کو پسند نہیں آ رہی تھی۔بہت سردی پڑ رہی تھی۔وہ باہر جا نہیں سکتی تھی،گھر میں جیسے قید ہو گئی تھی۔ہر وقت ہیٹنگ میں ہی رہنا پڑتا تھا۔اس کو اپنے دیس کی سردی یاد آ رہی تھی جو اس کو بہت پسند تھی۔سردی کے زمانے میں وہ دھوپ میں پلنگ ڈال لیتی تھی اور اس پر لیٹ کر سردی کی دھوپ سے لطف اندوز ہوتی تھی۔اس کے مزے لیتی تھی۔سردی کی یہ دھوپ اور پلنگ پر لیٹ کر کر اس کا لطف،اس

کا مزہ ہی کچھ اور تھا جو اس کو بہت پسند تھا۔ یہاں سردی میں چاروں طرف برف ہی برف تھی اور دھوپ کتنی مردہ مردہ لگتی تھی۔ شمال کو ایک جگہ ایک ہی شہر میں رہنا پسند نہیں تھا۔ وہ دوسرے ملکوں اور شہروں میں اپنی نوکری کی درخواست بھیجتا رہتا تھا۔ اس کو نوکری فوراً مل جاتی تھی۔ وہ اپنی نئی نوکری پر چلا جاتا تھا۔ جب وہ گھر وغیرہ لے لیتا تھا تو وہ بھی اس کے پاس چلی جاتی تھی، ورنہ وہ اسی شہر میں اکیلی بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ایک بار پھر شمال اپنی نوکری کی بدولت دوسرے شہر چلا گیا تو وہ اپنے بابل کے دیس سب سے ملنے چلی آئی۔ شمال کو اس نئی جگہ بسنے میں بہت دن لگ گئے۔ جب تک اس کو اپنے ہی دیس میں رہنا پڑا۔ ایک دن اچانک شمال نے اس کو اور بچوں کو بلا لیا۔ وہ اور بچے بہت خوش ہوئے اور جلدی جلدی اپنے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ تو بہت خوش تھی پیا کے دیس جو جا رہی تھی۔ وہ روز شمال سے فون پر بات کرتی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھا اور ان لوگوں کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ پیا کے دیس پہونچ گئی۔ وہاں پہنچ کر وہ اداس اور پریشان ہوگئی۔ ہمیشہ کی طرح شمال ان لوگوں کو لینے ایئرپورٹ نہیں آیا تھا۔ وہ خود اس سے ملنے گئی۔ وہاں شمال نہیں اس کی قبر ملی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شمال کا ایک کار کے حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ پیا اب ہمیشہ کے لیے اس شہر کا ہوگیا تھا ایک قبر بن کر۔ وہ جگہ ہمیشہ کے لیے شمال کا دیس بن گئی تھی۔ وہ اب اس شہر، اس جگہ پر نہیں رہتی تھی۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ دی تھی، مگر پھر بھی وہ پیا کے دیس جاتی رہتی تھی جہاں ایک قبر اس کو ملتی تھی اس کا انتظار کرتی ہوئی، ایک طویل انتظار۔ قیامت کا انتظار۔

◆÷◆

جیوتی

(افسانچہ)

کسی رسالے کا خاص نمبر نکلنے والا تھا۔ مدیر صاحب سب ادیبوں اور ادیباؤں کو اپنے افسانے، شاعری مضمون بھیجنے کو کہہ رہے تھے۔ جیوتی ایک مشہور ادیبہ تھی۔ وہ برسوں سے لکھ رہی تھی۔ اس کی تخلیقات دنیا بھر کے مشہور مشہور رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کو لکھتے ہوئے پندرہ بیس سال ہوگئے تھے۔ اس کے پاس اپنی شہرت تھی کیوں کہ وہ چار پانچ زبانوں کی مشہور رائٹر تھی۔ اس رسالے نے پہلی بار اس سے اپنے میگزین کے لیے اس کا افسانہ مانگا۔ اس نے خوشی خوشی موجودہ حالات پر ایک افسانہ بھیج دیا۔ مدیر صاحب نے بہت دن بعد اطلاع دی کہ آپ کا افسانہ میرے میگزین کے قابل نہیں ہے، کیونکہ اس کا موضوع پسند نہیں آیا ہے، اس لیے ان کے رسالے میں شائع نہیں ہوگا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے اور وہ افسانہ دوسرے میگزین میں بھیج دیا۔ اس کا افسانہ شائع ہوگیا۔ وہ افسانہ بھی اس کے دوسرے افسانوں کی طرح اس کے قارئین اور مداحوں نے بہت پسند کیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے اس پر بہت عمدہ تبصرے لکھے۔ جب وہ میگزین اس کو ملا جس کے مدیر صاحب نے اس کے اس افسانے کو شائع نہیں کیا تھا، اس کا موضوع پسند نہیں کیا تھا اور اپنے میگزین کے قابل نہیں سمجھا تھا وہ افسانہ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسی موضوع پر ان مدیر صاحب کی بیوی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مدیر صاحب پتا نہیں کتنے نئے اور پرانے ادیبوں کے افسانے کاٹ چھانٹ کر شائع کرتے تھے اس طرح خود کو اور اپنی بیوی کو ادیب بنا دیا تھا۔ مگر جیوتی تو جیوتی ہی تھی اس کے ادب کی جیوتی کو کوئی بجھا نہیں سکا۔ وہ شان کے ساتھ روشن رہی۔

◆÷◆